سیّدی وَابی
(اضافہ شدہ ایڈیشن)
امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری
سوانح وافکار
اور جیل سے لکھے گئے بیٹی کے نام خطوط
www.ahrar.org.pk
بنت امیرِ شریعت سیدہ اُمّ کفیل بخاری

سَیِّدی واَبی

☆☆☆

کتاب: سیّدی واَبی

مصنّفہ: بنتِ امیرِ شریعت سیدہ اُمّ کفیل بخاری

اشاعت اوّل: (4000) ربیع الاوّل 1429ھ، مارچ 2008ء

اشاعت دوم: (2000) ذوالحجہ 1432ھ، نومبر 2011ء

اشاعت سوم: (3000) ربیع الاوّل 1434ھ، جنوری 2013ء

قیمت: -/400 روپے

ناشر: بخاری اکیڈمی دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان

رابطہ

☆ بخاری اکیڈمی، دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان 0300-8020384,061-4511961

☆ مکتبۂ احرار 69۔سی، حسین سٹریٹ وحدت روڈ نیو مسلم ٹاؤن لاہور 042-35912644

☆ مکتبۂ معاویہ، دفتر احرار، جامع مسجد بلاک 12، چیچہ وطنی 040-5482253

ولادت:

یکم ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ/۲۳ر ستمبر ۱۸۹۲ء، جمعتہ المبارک، بوقت سحر

☆

انتقال:

۹ر ربیع الاوّل ۱۳۸۱ھ/۲۱ر اگست ۱۹۶۱ء، بروز پیر، بعد العصر

سَیِّدی وَاَبی

امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ

سوانح و افکار

اور جیل سے لکھے گئے بیٹی کے نام خطوط

بنتِ امیرِ شریعت سیّدہ اُمّ کفیل بخاری

بخاری اکیڈمی، دارِ بنی ہاشم، مہربان کالونی، ملتان

اماں جی کے نام*

جنھوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۶۱ء تک وفا، جرأت، غیرت وحمیتِ اسلامی، جاں سپاری اور توکل علی اللہ کا علم تھام کر ابا جی کی زندگی کے ہر مرحلہ پر اُن کی جدوجہد کو صحیح سمجھتے ہوئے، اُن کا مکمّل ساتھ دیا۔ اُن کی دس سالہ اسارت کے دوران جہاں ہم بہن بھائیوں کو اپنی شفقت وعطوفت عطا فرمائی، وہاں ہر گام پر ہمارے عقائد واعمال پر بھی کڑی نگاہ رکھی۔

ابا جی کے بعد اُن کا دامنِ عاطفت اور بھی وسعت سے ہم پر سایہ فگن رہا۔ تا آنکہ وہ اپنے رب کے بلاوے پر اللہ اللہ کہتی ہوئی اس کے حضور حاضر ہو گئیں:

بَرَّدَ اللّٰهُ مَضْجَعَهَا وَنَوَّرَ اللّٰهُ مَرْقَدَهَا

میرے اللّٰہ، میری اماں جی کو ابا جی کے ساتھ لِواءُ الحمد کے نیچے جگہ دیجیے
اُن کو بغیر حساب کے جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیے
حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اطہر سے جامِ کوثر نصیب فرمائیے
ہم سب کو انھی کی سی استقامت سے دینِ قیّم پر مستقیم رکھیے
اور ہماری آئندہ نسلوں کو بھی تا قیامت! (آمین)

عاجز بیٹی

سیّدہ اُمّ کفیل

---

*انتقال: ۲۲رذوالقعدہ ۱۴۱۱ھ۔ ۶رجون ۱۹۹۱ء

سخنِ پیشین

''سَیِّدی وَ اَبی'' پہلی مرتبہ مارچ ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔کتاب کو اتنی پذیرائی ملی گویا لوگ اس کے انتظار میں تھے۔حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصی عظمت،خلوص اور للّٰہیت نے اُنہیں عام و خاص کا محبوب بنا دیا تھا وہ مقبولِ بارگاہِ الٰہی تھے۔اُنہیں اس دنیا سے گئے نصف صدی بیت گئی لیکن تحریروں،تقریروں اور مجلسوں میں اُن کے تذکرے آج بھی ہوتے ہیں۔اُن کی پُرخلوص جدو جہد،دینی و سیاسی خدمات اور ملّی و قومی کارناموں کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ حضرت امیر شریعت کے حامی اور مخالف دونوں اُن کی عزت کرتے ہیں اور اُنہیں اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔

تصنیف و تالیف،جمع و تدوین اور ترتیب و تہذیب مستقل اصطلاحات ہیں۔ان کی تعریف کیا ہے اور ان کا اطلاق کہاں ہوتا ہے،اہل علم اور اہل قلم اس سے بخوبی واقف ہیں۔لیکن عصر حاضر میں اِن اصطلاحات کو جس بری طرح استعمال کیا گیا ہے اس سے ان کی تعریف اور معانی بھی تبدیل اور مجروح ہو کر رہ گئے ہیں۔اب'' سرقہ بازی'' اور'' کتاب سازی'' بلکہ'' جلد سازی'' نے تصنیف و تالیف کی جگہ لے لی ہے۔

سَیِّدی وَ اَبی کی مقبولیت سے کتاب سازوں نے یوں نفع اٹھایا کہ پوری کی پوری کتاب کو چوری کر کے اپنی کتابوں میں شامل کر لیا۔افسوس کہ اب'' وہ'' بھی حضرت امیر شریعت کے سوانح نگاروں میں شمار ہونے لگے ہیں۔یہ ادبی سرقہ بازی کی بدترین مثال ہے۔اِسی طرح'' خطبات امیر شریعت'' کے عنوان سے بھی متعدد مسروقہ مرکبات'' ترتیب و تہذیب'' کے نام سے بازار میں آگئے ہیں۔کوشش ہے کہ ہم ایسی غیر اخلاقی،غیر علمی اور گھٹیا سرگرمیوں کا سدِّباب کر سکیں۔

والدہ ماجدہ،بنت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہا نے کئی واقعات کتاب کی اشاعت کے بعد

اِملا کرائے۔ جنہیں اُن کی زندگی میں ہی مرتب کر لیا تھا، جوبات، جہاں مناسب تھی وہاں شامل کر دی گئی اور اُنہوں نے مسودے پر نظرِ ثانی بھی فرمالی۔

سَیّدی وَ اَبی کا یہ ایڈیشن اب کئی اضافوں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جبکہ والدہ ماجدہ ۱۳؍اپریل ۲۰۱۲ء کو انتقال فرما گئیں۔ وہ اپنے ابّا جی کی طرح اللہ اللہ کا ذکر کرتی ہوئی خاتمہ بالایمان کی نعمت سے سرفراز ہوئیں اور خالقِ حقیقی کے حضور حاضر ہو گئیں۔ انا للّٰہ وانّا الیہ راجعون۔ کاش یہ ایڈیشن بھی اُن کی زندگی میں شائع ہوتا اور میرے لیے اُن کی مزید دعاؤں کا ذریعہ بنتا۔ لیکن اللّٰہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے کس کو مجال ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اُن کی دعاؤں کو ہمارے شاملِ حال بنائے (آمین)

کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو میں نے ایک نسخہ انہیں پیش کرتے ہوئے یہ درخواست کی کہ اس پر کچھ تحریر فرما دیں۔ اُن کی یہ تحریر میرے لیے سکون و اطمینان اور اعزاز کا باعث ہے۔

> ''کفیل احمد میں نے تم کو اللّٰہ سے گڑگڑا کر لیا تھا۔ اللّٰہ تعالیٰ اپنی ہر نعمت، برکت سے تم کو نوازیں۔ محنت تو تمہاری ہی ہے۔ جیسے میرے دل کو خوش کیا ہے، اللّٰہ تعالیٰ اولاد کی نیکی، فرماں برداری اور صاحبِ علم ہونے کی صورت میں تم کو اجر دیں (آمین ثم آمین)
>
> دنیا و آخرت کی ہر نعمت عطا ہونے کی دعاؤں کے ساتھ
>
> تمہاری اپنی امّی
>
> یکم رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ، ۲؍ستمبر ۲۰۰۸ء
>
> دارِ بنی ہاشم''

والدہ ماجدہ کی یادداشتوں میں بہت کچھ محفوظ تھا۔ مجھے اپنی غفلت کا احساس ضرور ہے کہ میں اُن سے مکمّل نفع نہ اٹھا سکا لیکن اپنی استطاعت کے مطابق جو ہو سکتا تھا اس سے دریغ نہیں کیا۔ حق تعالیٰ شانہٗ اُن کی اس کاوش کو قبول فرمائیں اور اُن کے درجات بلند فرمائیں (آمین)

قارئین سے بھی دعاءِ مغفرت کی درخواست ہے۔

سید محمد کفیل بخاری

یکم ربیع الاوّل ۱۴۳۴ھ، ۱۴؍جنوری ۲۰۱۳ء

فہرست

تبرکات

مخلوق میں جب تک خالق کا نظام نہیں چلایا جاتا
دنیا میں امن نہ ہو گا۔

[illegible]

۲۸ دسمبر ۴۵ء

مجلس دفتر بلال گنج

وہ دلکشا ہوا رنگ دھواں اول اول
وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر

قیامت کا طوفاں صحرا میں اول
غبار رہِ کارواں آخر آخر

چمن میں عنادل کا سجود اول
دور گیا وہ رہ گلرخاں آخر آخر

داستانوں میں ہے گویا ہوا چاروں طرف سے جھول

پھر بھی کھلا ہی پڑا ہے کیا خوش مزاج ہے

[illegible]

[illegible]

دار بنی ہاشم ملتان شہر

لے پیچ جس کا مہینہ شہاں نا پو لگتی
پھر مہاں تے قلب کا گہرا اپنا ن نا جی لگتی
پھر دے حسن کو نزلا پیا
عشق دا ڈلو دا بیاں نال لگی

•

غم نے شمع دی رات گزرو لگی
جلنے بجھنے حیا ستگ لگی

میری بیٹی

میری بیٹی......، میرے ظاہری اسباب میں سے، میری حیات کا باعث ہے۔ اللہ بیٹوں کو بھی سلامت رکھے، مگر بیٹی سے مجھے محبّت بہت ہے۔

اس نے کئی بار مجھے کہا:

ابا جی! اب تو اپنے حال پر رحم کریں، آپ کو چین کیوں نہیں آتا، کیا آپ سفر کے قابل ہیں، چلنے پھرنے کی طاقت آپ میں نہیں رہی، کھانا پینا آپ کا نہیں رہا، یہ آپ کا حال ہے، کیا کر رہے ہیں آپ؟

میں نے کہا:

تم نے میری دُکھتی رگ پکڑی ہے، میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں؟

بٹیا! تم بہت خوش ہوگی اگر میں چارپائی پر مروں؟ میں تو چاہتا ہوں کسی کے گلے پڑ کے مروں۔ تم اس بات پہ راضی نہیں کہ میں باہر نکلوں میدان میں، اور یہ کہتا ہوا مر جاؤں......

لَا نَبِیَّ بَعْدَ مُحَمَّد، لَا رَسُوْلَ بَعْدَ مُحَمَّد، لَا اُمَّةَ بَعْدَ اُمَّةِ مُحَمَّد(صلی اللہ علیہ وسلم)

بٹیا! دعا کرو

عقیدۂ ختم نبوت بیان کرتے ہوئے اور کلمۂ طیبہ پڑھتے ہوئے مجھے موت آجائے۔ **لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه**

لَا نَبِیَّ بَعْدَهٗ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدَهٗ

(راولپنڈی میں جلسۂ عام سے خطاب، ۱۹۵۶ء)

رہِ عشقِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مسافر

ہم چاروں بہن بھائی جیل کے پھاٹک پر کھڑے تھے کہ سامنے سے ہشاش بشاش ابا جی آتے دکھائی دیئے۔سنتری نے تالا کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے ۔ڈیوڑھی میں سیڑھیاں تھیں ۔ابا جی ہمارے ساتھ ہی اوپر آ گئے ۔کمرے میں ایک لمبا میز اور کرسیاں رکھی تھیں ۔ایک پر جیلر بیٹھ گیا ۔ایک پر ابا جی اور باقی پر ہم ۔انھوں نے گھر کا حال پوچھا ، بھائیوں سے تعلیم کا پوچھا اور نصیحتیں کیں ۔ پون گھنٹہ کے قریب ہم بیٹھے۔حبس ،تپش ،خراب آب و ہوا ، ناقص غذا اور اسی قسم کی دیگر ابتلاؤں کے سبب صحت بہت دگر گوں تھی ۔بالخصوص چہرہ اور سینہ پھوڑوں اور پھنسیوں سے بھرا ہوا تھا ۔مگر ابا جی نے اپنی کسی تکلیف کا ذکر تک نہیں فرمایا ۔ پھر وہ ہمارے ساتھ ہی سیڑھیاں اترے۔ اور ہم سلاخوں سے لگے'انہیں جیل کے اندر جاتا دیکھتے رہے ، جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے ۔انھوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔رہِ عشقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مسافر پیچھے مڑ کر دیکھا بھی کب کرتے ہیں؟

تحفّظِ ختم نبوت کا حق

''آخر ہوا ہی کیا ہے؟ یہی کہ تمہاری اماں اور بہن کے سامنے پولیس والوں نے بدزبانی کی اور گالیاں بکیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے تحفّظ کے لیے اس سے بھی زیادہ بدسلوکی ہوتی تو ہماری سعادت ہوتی۔ اگر تمہاری اماں اور بہن کو سڑک پر گھسیٹ کر لاتے اور ان کو مارتے تو میں سمجھتا کہ تحفّظ ختم نبوت کا کچھ حق ادا ہوا۔ اللہ کے دین کے کاموں میں سختیاں اور امتحانات نہ آئیں اور مار نہ پڑے، یہ ہو نہیں سکتا۔ دین کا کام کرو گے تو مار بھی پڑے گی۔ اس کے لیے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھو۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی رؤف ورحیم ہستی کو دین کے نام پر کتنی تکالیف اٹھانی پڑیں۔ جانتے نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو زخمی کیا گیا اور اسی زخم سے وہ شہید ہوئیں۔

ہماری کیا حیثیت ہے؟ اس لیے صبر کرو اور دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس حقیر سی قربانی کو قبول فرمائے۔''

(بڑے بیٹے ......سید ابوذر بخاریؒ کو فہمائش، ۱۹۵۳ء)

جدّ وجُہدِ آزادی میں میرا حصہ *

شاہ جی! جد و جہدِ آزادی میں آپ کی کارگزاری (Contribution) کیا ہے اور آزادیٔ ہند کا وہ کون سا مثبت نظریہ ہے جس کے لیے آپ کوشاں ہیں؟

فرمایا: یہ فیصلہ تو آپ کیجیے کہ میری کارگزاری کیا ہے؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہن سے انگریزوں کو نکال پھینکا ہے۔ میں نے کلکتہ سے خیبر تک اور سری نگر سے راس کماری تک دوڑ لگائی ہے۔ وہاں پہنچا ہوں جہاں دھرتی پانی نہیں دیتی۔

رہا یہ سوال کہ آزادی کا وہ کون سا تصور ہے جس کے لیے میں لڑتا رہا تو سمجھ لیجیے کہ اپنے ملک میں اپنا راج۔

آپ غالباً مجھ سے کسی کتابی آئیڈیالوجی کا پوچھ رہے ہوں گے؟

بابو! یہ کتابی نظریے عموماً روگ ہوتے ہیں۔ فی الحال جو مرحلہ درپیش ہے وہ کسی مثبت تصور کا نہیں، منفی تصور کا ہے۔

ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ غیر ملکی طاقت سے گلوخلاصی ہو، اس ملک سے انگریز نکلیں، نکلیں کیا؟ نکالے جائیں۔ تب دیکھا جائے گا کہ آزادی کے خطوط کیا ہوں گے؟ آپ تو نکاح سے پہلے چھوہارے بانٹنا چاہتے ہیں۔ پھر میں کوئی دستوری نہیں، سپاہی ہوں۔ تمام عمر انگریزوں سے لڑتا رہا اور لڑتا رہوں گا۔ اگر اس مہم میں سور بھی میری مدد کریں تو میں اُن کا منہ چوم لوں گا۔ میں تو اُن چیونٹیوں کو شکر کھلانے کے لیے تیار ہوں جو ''صاحب بہادر'' کو کاٹ کھائیں۔ خدا کی قسم! میرا ایک ہی دشمن ہے، انگریز۔ اس ظالم نے نہ صرف مسلمان ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی، ہمیں غلام رکھا اور مقبوضات پیدا کیے، بلکہ خیرہ چشمی کی حد ہوگئی کہ قرآن حکیم میں تحریف کے لیے مسلمانوں میں جعلی نبی (مرزا قادیانی) پیدا کیا، پھر اس ''خودکاشتہ پودے'' کی آبیاری کی اور اب اِس کو چہیتے بچے کی طرح پال رہا ہے۔

تم فرنگی کو نہیں جانتے۔ اس نے روحیں قتل کر دی ہیں، روحیں۔ اسلام اُٹھ گیا، مسلمان رہ گئے۔ ہائے اکبر کس وقت یاد آیا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

(ایک سوال کے جواب میں گفتگو، دفتر احرار، لاہور۔ ۱۹۴۰ء)

---

*سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، سوانح و افکار، شورش کاشمیری، ص ۲۷، ۲۸

میرا رزق

بعض لوگ تعجّب سے پوچھتے ہیں کہ میرا ذریعۂ آمدن کیا ہے اور میں کہاں سے کھاتا ہوں؟ میرا ذریعۂ معاش اللہ کی ذات پر توکل ہے۔ میاں کیا پوچھتے ہو؟ میرے رب کا مجھ سے معاملہ ہی عجیب ہے۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ کبھی دَھن دھنا، کبھی مُٹھی بنا، کبھی یہ بھی منع۔
ہائے اصغر کس وقت یاد آ گئے:

میں رندِ بادہ کش بھی، بے نیازِ جام و ساغر بھی
رگِ ہرتاک سے آتی ہے کھنچ کر میری قسمت

میرا ہاتھ ہمیشہ اللہ کی ڈھیری پر رہا ہے۔ میرا رزق میرے پیچھے دوڑتا ہے۔ جتنا چاہتا ہوں اٹھا لیتا ہوں، اپنی ضرورت پوری کر لیتا ہوں اور باقی چھوڑ دیتا ہوں۔ میں تو اپنے اللہ کا کوڑھی ہوں۔ وہ مجھے صرف رزق دیتا ہی نہیں بلکہ میری ٹھوڑی سے پکڑتا ہے اور میرے منہ میں ڈالتا ہے:

بے مگس ہرگز نہ باشد عنکبوت
رزق را روزی رساں پر می دہد

میں نے کبھی اللہ کے سوا کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ میں صرف اپنے ربّ اور رزّاقِ حقیقی کے در کا سائل ہوں:

لا تَسْئَلَنْ بَنِی آدَمَ حَاجَةً وَاسْئَلِ الَّذِی اَبْوَابُہٗ لا تُغْلَقٗ
واللّٰہُ یَغْضِبُ اِنْ تَرَکْتَ سُؤَالَہٗ وَ بَنُوا آدَمَ حِیْنَ یُسْئَلُ یَغْضِب

ترجمہ:

آدم کی اولاد سے کوئی حاجت نہ مانگ
اُس سے مانگ جس کے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے
اللہ اُس وقت ناراض ہوتا ہے جب تو اُس سے مانگنا چھوڑ دے
اور اولادِ آدم اس وقت ناراض ہوتی ہے جب اُس سے کوئی مانگے

(''چٹان'' سالنامہ ۱۹۶۲ء، صفحہ ۹۰)

وفاداری کے طالب

میں نے جو کچھ کیا، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیا۔ مجھے ایک لحظہ کے لیے بھی اپنی کسی حرکت پر ندامت نہیں۔ میرا دماغ غلطی کرسکتا ہے لیکن میرے دل نے کبھی غلطی نہیں کی۔ مجھ سے وفاداری کا ثبوت مانگنے والے پہلے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفاداری کا ثبوت دیں۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو یہ صدا دیتے پھریں کہ ہم تو شئہ وفاداری لیے پھرتے ہیں۔ میری انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلو اور جس مقتل میں چاہو مجھے ذبح کردو ایسا کبھی نہیں ہوگا، ہرگز نہیں ہوگا۔ میں خوش ہوں، میری خوشی بے کراں ہے کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی حصے میں بھی سامراج کو نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس کو قرآن و اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں۔

میں ان لوگوں میں بھی نہیں جو انسانی ضمیر کی سوداگری کرتے ہیں۔ میں اس شخص کو دھوپ چھاؤں کی اولاد سمجھتا ہوں جو قوم کو بیچتا پھرے، ملک سے غداری کرے اور جس ہنڈیا میں کھائے اسی میں چھید کر ڈالے۔

میں نے صرف ایک اللہ کے سامنے جھکنا سیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کا وارث نہیں جنھوں نے درباروں کی دہلیزیں چاٹی ہیں۔ میں ان کا وارث ہوں جو شہادت کے راستہ میں سروں کو ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ میں نے جو کچھ کہا اس پر میرا ضمیر مجھے کسی بھی لمحہ طعن نہیں کرتا۔ اللہ شاہد ہے میں نے کچھ بھی اپنے ذاتی مفاد کے لیے نہیں کیا۔

تم میرے بارے میں جو چاہو سوچ لو۔ مسلمانوں کا شعار ہوگیا ہے کہ وہ برائیاں عقاب کی آنکھ سے چنتے اور صبا کی رفتار سے پکڑتے ہیں۔ کبھی کبھی نیکیوں پر بھی نگاہ کرلیا کرو! تمہاری فطرتیں اس سے خوبصورت ہوتی چلی جائیں گی۔ عیبوں پر پردہ ڈالنا، عفو و درگزر اور چشم پوشی ربانی صفت ہے۔ تم بھی چشم پوشی سے کام لیا کرو۔

(ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور، بیادِ امیر شریعت، سالنامہ جنوری ۱۹۶۲ء)

دومظلوم

قرآن اور بخاریؒ

ادیب الاحرار منور غوری مرحوم کی روایت ہے کہ جنوری ۱۹۴۸ء میں قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے ملنے خان گڑھ تشریف لے گئے۔ نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب انہیں شاہ جیؒ کے مکان پر لے چلے......

مردان خانہ کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ شاہ جیؒ دھوپ میں بیٹھے قرآنِ پاک کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔نواب زادہ نصر اللہ خان نے شاہ جیؒ کو خاص کیفیت میں مصروفِ مطالعہ پا کر......

بے اختیار کہا......قاضی......!

وہ دیکھو! دومظلوم!

''قرآن اور بخاری''

ایک لازوال مصحف!......اور ایک معتوبِ روزگار انسان!

دونوں ہی انسانیت کی گمراہی پر ملول ہیں۔

ایک جھکا ہوا

ایک پھٹا ہوا

☆☆☆

میرا نسب نامۂ حریت

میں ان سوٗروں کا ریوڑ بھی چرانے کو تیار ہوں جو برٹش امپریلزم کی کھیتی کو ویران کرنا چاہیں، میں کچھ نہیں چاہتا، ایک فقیر ہوں، اپنے نانا کی سنت پر مرٹنا چاہتا ہوں اور کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس ملک سے انگریز کا انخلاء۔ دو ہی خواہشیں ہیں۔ میری زندگی میں یہ ملک آزاد ہو جائے یا پھر میں تختۂ دار پر لٹکا دیا جاؤں۔

میں ان علمائے حق کا پرچم لیے پھرتا ہوں جو ۱۸۵۷ء میں فرنگیوں کی تیغِ بے نیام کا شکار ہوئے تھے۔ ربِ ذوالجلال کی قسم مجھے اس کی کچھ پروا نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں......لوگوں نے پہلے ہی کب کسی سرفروش کے بارے میں راست بازی سے سوچا ہے۔ وہ شروع سے تماشائی ہیں اور تماشا دیکھنے کے عادی۔ میں اس سرزمین پر مجدد الف ثانیؒ کا سپاہی ہوں، شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کا متبع ہوں۔ سید احمد شہیدؒ کی غیرت کا نام لیوا اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی جرأت کا پانی دیوا ہوں۔ میں اُن پانچ مقدمہ ہائے سازش کے پابہ زنجیر صلحائے امت کے لشکر کا ایک خدمت گزار ہوں جنھیں حق کی پاداش میں عمر قید اور موت کی سزائیں دی گئیں۔ ہاں ہاں! میں انہی کی نشانی ہوں......انہی کی صدائے بازگشت ہوں۔ میری رگوں میں خون نہیں آگ دوڑتی ہے۔ میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں قاسم نانوتوی کا علم لے کر نکلا ہوں۔ میں نے شیخ الہند کے نقش قدم پر چلنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ میں زندگی بھر اسی راہ پر چلتا رہا ہوں اور چلتا رہوں گا......میرا اس کے سوا کوئی مؤقف نہیں۔ میرا ایک ہی نصب العین ہے اور وہ برطانوی سامراج کی لاش کو کفنانا یا دفنانا......

......ہر شخص اپنا شجرہ نسب ساتھ رکھتا ہے۔ میرا یہی شجرۂ نسب ہے۔ میں سر اونچا کر کے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس خاندان کا ایک فرد ہوں۔ (لاہور، ۲۳ / مارچ ۱۹۳۹ء)

(ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور، سالنامہ جنوری ۱۹۶۲ء)

شجرۂ نسب

۱۔ امیر المومنین سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ (ابن ابی طالب)

(بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا زوجہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ)

نمبر		
۲۔	حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ	حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ
۳۔	حضرت سید حسن مثنیٰؒ	حضرت علی زین العابدینؒ
۴۔	سید عبداللہ محضؒ	سید محمد باقرؒ
۵۔	سید موسیٰ الجونؒ	سید جعفر صادقؒ
۶۔	سید داؤدؒ	سید محمد علاء الدینؒ
۷۔	سید محمدؒ	سید کمال الدینؒ
۸۔	سید زاہدؒ	سید عبداللہؒ
۹۔	سید یحییٰؒ	سید طاہرؒ
۱۰۔	سید عبداللہؒ	سید ابو احمدؒ
۱۱۔	سید موسیٰؒ	سید ابو محمدؒ
۱۲۔	سید صالحؒ	سید ابو الجمالؒ
		سید عبداللہ صومعیؒ
		سیدہ فاطمہؒ (والدہ ماجدہ شیخ عبدالقادر جیلانی)

۱۳۔ سیدنا شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانی قدس سرہٗ

۴۷۰ھ — ۵۶۱ھ ۱۰۷۸ء — ۱۱۶۶ء

۱۵- سید عبداللہؒ
۱۶- سید نورالدینؒ
۱۷- سید یحییٰؒ
۱۸- سید باقرؒ
۱۹- سید عبدالکریمؒ
۲۰- سید عبدالرحمٰنؒ
۲۱- سید احمدؒ
۲۲- سید ابراہیم

۲۳- سید حامدؒ
۲۴- سید محمد بخاریؒ
۲۵- سید عبدالغفار بخاریؒ
۲۶- سید عبداللہ بخاریؒ
۲۷- سید محمد سعید بخاریؒ
۲۸- سید محمد صادق بخاریؒ
۲۹- سید عطاء اللہ بخاریؒ (اوّل)
۳۰- سید نعمت اللہ بخاریؒ

۳۱- سید بہاء الدین بخاریؒ

۳۲- سید (اکمل الدین) محمد شاہ بخاریؒ
۳۳- سید نورالدین بخاریؒ
۳۴- سید ضیاء الدین بخاریؒ
امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

سید امان اللہ شاہ بخاریؒ
سید مصطفیٰ شاہ بخاریؒ
اہلیہ امیر شریعت
سید عبدالحمید بخاریؒ

سید (عطاء المنعم) ابومعاویہ ابوذر بخاریؒ
سیدہ ام کفیل بخاری
سید عطاء الحسن بخاریؒ
سید عطاء المؤمن بخاری
سید عطاء المہیمن بخاری

مختصر سوانحی خاکہ

اسم گرامی:

دد ھیالی نام: سیدعطاء اللہ بخاری

ننھیالی نام: سیدشرف الدین احمد

کنیت: ابوالعطایا

لقب: امیر شریعت

تخلّص: ندیم

ولادت:

بروز جمعہ: بوقتِ سحر

یکم ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ ۲۳ستمبر ۱۸۹۲ء (اپنے نانا) حافظ حکیم سید احمد اندرابی کے مکان واقع کوچہ لنگر، محلّہ خانہ باغ، پٹنہ، عظیم آباد، صوبہ بہار، انڈیا

اساتذہ:

مولانا سید الفت حسین بہاری، مولانا عبدالرحیم بہاری، امام القراء سید عمر عاصم (ترکی) حضرت مولانا قاضی عطاء محمد (ساکن موضع راجووال ضلع گجرات)، حضرت مولانا عبدالصمد کاشمیری امرتسری، حضرت مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی کاشمیری امرتسری، حضرت مفتی محمد حسن تھانوی امرتسری، حضرت مولانا نوراحمد صاحب پسروری (امرتسری)، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن مکی، مولانا محمد دین غریب امرتسری رحمتہ اللہ علیہم اجمعین

بیعت واسترشاد:

بیعت: اُولیٰ: بدست مرشد گرامی پیر سید مہر علی شاہ حسنی، گیلانی، قادری، چشتی، نظامی، گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ۔ ۱۹۱۵ء

بیعتِ امیر شریعت:

اِسترشاد و حصولِ سعادت بیعتِ امیر شریعت از حجتہ الاسلام علامہ محمد انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ

بیعتِ ثانیہ:

بدستِ مرشدِ عظیم حضرت مولانا شاہ عبدالقادر چشتی، قادری، سہروردی، نقشبندی، رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ۔ ۱۹۳۷ء بر مکان مولانا عبداللہ فاروقی رحمہ اللہ لاہور، (حضرت نے چاروں

سلسلوں میں آپ کو اجازتِ بیعت بھی عطاء فرمائی)

آبا وَ اجداد:

کل آبا وَ اجداد تا سیدنا علی رضی اللہ عنہ: چونتیس

کل نکاح: ایک

کل اولاد: نو (چار بیٹے، پانچ بیٹیاں)

زندہ اولاد: دو (دو بیٹے) (۱) سید عطاء المؤمن بخاری (۲) سید عطاء المہیمن بخاری

کل احفاد و نبائر:

(پوتے، نواسے، نواسیاں) تیرہ

چار پوتے: حافظ سید محمد معاویہ بخاری، حافظ سید محمد مغیرہ بخاری، سید عطاء اللہ بخاری،
حافظ مولوی سید عطاء المنان بخاری

دو نواسے: حافظ سید محمد کفیل بخاری ، پروفیسر سید محمد ذوالکفل بخاری شہیدؒ
(مدفون: جنت المعلیٰ مکہ مکرمہ)

تین نواسیاں ، چار پوتیاں

قید و بند:

کل گرفتاریاں: گیارہ

کل قید: نو سال چار مہینے انیس دن پونے سولہ گھنٹے

وفات:

بروز پیر، بعد العصر، چھے بج کر تریپن منٹ، ۹؍ربیع الاوّل ۱۳۸۱ھ، ۲۱؍اگست ۱۹۶۱ء، ملتان

کل عمر:

اکہتّر سال سات دن

نمازِ جنازہ:

بروز منگل ۱۰؍ربیع الاوّل ۱۳۸۱ھ، ۲۲؍اگست ۱۹۶۱ء، بعد عصر، ایمرسن کالج گراؤنڈ ملتان

زیرِ امامت: فرزندِ اکبر سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ

تدفین:

چھے بجے شام، جلال باقری قبرستان، ملتان

بہنوں اور بھائیوں کی تفصیل

(۱) سیّدِہ خدیجہؒ:

سب سے بڑی بہن ۱۹۲۱ء میں ننھیالی ،ددھیالی گاؤں ''ناگڑیاں''، ضلع گجرات میں پیدا ہوئی۔ننھیالی نام ''سیّدہ صَفِیہّ''اور ددھیالی نام ''سیّدہ خدیجہ'' تھا۔سوا ماہ کی ہوکر فوت ہوگئی ۔اُسے ابا جی نے دیکھا بھی نہیں ۔تب وہ میانوالی جیل میں ''تحریک خلافت'' کے سلسلے میں تین برس کی قید کاٹ رہے تھے۔

(۲) سیّدِہ صالحہؒ:

۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء (امرتسر) سوا سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

(۳) سیّدِ عطاءُ المنعم (ابومعاویہ ابوذر) بخاریؒ:

پیدائش: ۷؍جمادی الاخریٰ ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۳؍دسمبر ۱۹۲۶ء بروز سوموار (امرتسر)

وفات: ۲۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۳؍اکتوبر ۱۹۹۵ء بروز سوموار (ملتان)

(تقریباً ستر برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ابا جی اور اماں جی کے درمیان آسودۂ خاک ہوئے۔)

دادا جی حضرت حافظ سید ضیاء الدین بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے بھائی جان کا نام ''عطاءالمنعم'' رکھا۔ ۱۹۴۸ء تک اسی نام سے پکارے جاتے رہے۔دورانِ تعلیم سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے احوال پڑھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ ''ابوذر بخاری'' نام اختیار کرلیا۔پھر اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطاء فرمایا تو اس کا نام محمد معاویہ رکھا اور ابومعاویہ کنیت اختیار کر لی۔تا دم آخر سید ابومعاویہ ابوذر بخاری لکھتے رہے۔

(۴) سیّدِہ اُمّ کلثومؒ:

(۱۹۳۰ء۔۱۹۳۱ء۔امرتسر) سوا سال کی عمر میں انتقال کرگئی ۔یہ چار ماہ کی تھی، جب ابا جی اپنے چھ ماہ کے تاریخی دورہ پر گھر سے روانہ ہوئے اور اسی دوران ''دیناج پور'' (مشرقی بنگال) سے گرفتار ہوگئے ۔جب اس کا انتقال ہوا، اس وقت ڈم ڈم جیل کلکتہ (مغربی بنگال) میں قید تھے۔

(۵) سیّدِہ صادقہ:

(۲۴ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۳۲ء بروز اتوار۔ امرتسر)

راقمہ، جو ابا جی کے زمانۂ اسارت ہی کے دوران پیدا ہوئی۔ تب وہ ملتان سنٹرل جیل میں ''تحریک کشمیر'' کے سلسلے میں قید تھے اور حضرت مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ (جو ساتھ قید تھے) نے میرا نام ''صادقہ'' رکھا۔ [1]

(۶) سیّدِ عطاءُ المحسن بخاریؒ:

پیدائش: ۱۸ ذوالقعدہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۱ جنوری ۱۹۳۸ء بروز جمعہ۔ امرتسر

وفات: ۳ شعبان ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۹۹ء بروز جمعہ۔ ملتان

(تقریباً اکسٹھ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ ابا جی اور اماں جی کے قدموں میں آسودۂ خاک ہوئے)

(۷) سیّدِ عطاءُ المؤمن بخاری:

(۷ ربیع الاوّل ۱۳۶۰ھ مطابق ۵ اپریل ۱۹۴۱ء بروز ہفتہ۔ امرتسر)

(۸) سیّدِ عطاءُ المہیمن بخاری:

(۱۶ رجب ۱۳۶۳ھ مطابق یکم جولائی ۱۹۴۴ء بروز ہفتہ۔ امرتسر)

(۹) سیّدِہ سالمہؒ:

پیدائش: ۱۴ شعبان ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۴ جولائی ۱۹۴۶ء بروز اتوار۔ امرتسر

وفات: ۵ فروری ۱۹۴۸ء۔ خان گڑھ، ضلع مظفرگڑھ

یہ سب سے چھوٹی بہن تھی، جس کا پونے دو برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ تب ابا جی، نواب زادہ نصر اللہ خان مرحوم کے ہاں خان گڑھ میں مقیم تھے۔ ہماری اس بہن کی قبر بھی نواب صاحب کے آبائی قبرستان کے احاطے میں ہے۔

---

[1] انتقال: ۲۰ جمادی الاوّل ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۳ اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعتہ المبارک، ملتان

تقدیم

حضرت امیرِ شریعت مولانا سید عطاء اللّٰہ شاہ بخاری رحمہ اللّٰہ کی ہمہ گیر اور جامع الصفات شخصیت پر معاصرین اور متأخرین نے بہت کچھ لکھا۔ پہلی سوانح اُن کی زندگی میں خان غازی کابلیؒ نے جون ۱۹۴۰ء میں اور دوسری شورش کاشمیریؒ نے ستمبر ۱۹۵۶ء میں شائع کی۔ تیسری کتاب جانباز مرزاؒ نے نومبر ۱۹۶۹ء میں اُن کے انتقال کے آٹھ سال بعد شائع کی۔ اس کے علاوہ کئی مضامین اور منتخب خطبات کے چند چھوٹے چھوٹے مجموعے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ قومی اخبارات و رسائل کے خاص ایڈیشن اس پر مستزاد ہیں، جو اُن کے یومِ وصال پر ہر سال شائع ہوتے ہیں۔ مجھے یہ احساس ہمیشہ دامن گیر رہا کہ ''شاہ جی'' کی اولاد میں سے کوئی اُن کی سوانح پر قلم اٹھائے اور اُن سے محبّت کرنے والوں کو ایک مستند سوانح پڑھنے کو ملے۔ آپ کے فرزندانِ گرامی، ابّا کی نشانی ''مجلس احرارِ اسلام'' کی تنظیم، شیرازہ بندی اور بقا میں مصروف ہو گئے۔ تبلیغی و تنظیمی اسفار اور مشاغل میں ایسے الجھے کہ اس ذمہ داری سے عہدہ بر آ ہونے کی فرصت ہی نہ ملی۔ سب سے بڑے فرزند و جانشین مولانا سید ابوذر بخاری رحمہ اللّٰہ (۱۹۲۶ء۔ ۱۹۹۵ء) نے آپ کا مجموعۂ کلام ''سواطع الالہام'' کے عنوان سے مارچ ۱۹۵۵ء میں اُن کی زندگی میں شائع کیا۔ اس میں اُن کے کلام کے علاوہ مختصر سوانحی حالات اور کئی اہم واقعات خود شاہ جی کی زبانی شامل تھے۔ جن سے شورش کاشمیریؒ اور جانباز مرزاؒ نے بھرپور استفادہ کیا۔ شاہ جیؒ کے انتقال (۲۱ راگست ۱۹۶۱ء) کے بعد انھوں نے ایک مفصّل سوانح اور مکاتیب شائع کرنے کا اعلان کیا۔ بہت سا مواد جمع بھی کیا، لیکن بیٹھک کی الماریوں میں کھلے پڑے ہوئے مختلف مسودات اور بعض مکاتیب چوری ہو گئے۔ حتیٰ کہ ''اخوان الصفاء'' کا ایک ''طائفۂ مقدسہ'' آدھی سے زیادہ مجلس احرار اسلام بھی چرا کر لے گیا۔ زندگی کے آخری دنوں میں انھوں نے بڑی محنت کر کے ایک سوانح مرتب کی، اس کی

کتابت بھی ہوگئی لیکن کاغذات کے انبار میں ایسی گم ہوئی کہ سابقہ حوادث کی بِنا پر انھیں اس کے بھی چوری ہونے کا یقین ہوگیا۔ وہ اس نقصان پر اتنے مغموم اور دل برداشتہ ہوئے کہ میں نے انھیں بلک بلک کر روتے ہوئے دیکھا۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل دفتر کے ایک خادم کو صفائی کے دوران یہ مسودہ مل گیا، لیکن اس کے کچھ صفحات غائب تھے۔ اس نے خوشی خوشی جا کر پیش کیا تو وہ دیکھ کر آب دیدہ ہوگئے۔ تب وہ مرض الوفات میں تھے۔ لکھنے پڑھنے اور بولنے کی طاقت نہ رہی تھی۔ وہ کتاب پر نظرِ ثانی کرنا چاہتے تھے لیکن علالت کی شدت کی وجہ سے نہ کرسکے۔ حتیٰ کہ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ ابنِ ابوذر بھائی سید محمد معاویہ بخاری حفظ اللہ نے مجھے بتلایا کہ یہ مسودہ اُن کے پاس محفوظ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ہمت دے اور اسے شائع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

دوسرے فرزند مولانا سید عطاء المحسن بخاری رحمہ اللہ (۱۹۳۸ء۔۱۹۹۹ء) نے شاہ جیؒ کے چند خطبات مرتب کرکے ''بخاری کے زمزمے'' کے عنوان سے اپریل ۱۹۸۴ء میں شائع کیے۔ انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں شاہ جی کی بعض نجی مجالس کی گفتگو اور نصائح کو قلم بند کیا اور کچھ سوانحی اشارات لکھے۔ چونکہ یہ صرف اشارات تھے اس لیے انھیں وہی مرتب کرسکتے تھے۔ اُن کا مصمّم ارادہ تھا کہ وہ اس ذمہ داری سے ضرور سبک دوش ہوں گے۔ میں مسلسل اصرار کرکے گزارش کرتا کہ ماموں جی! انھیں مرتب کردیں۔ فرماتے کہ بھائی جان جو کچھ لکھ رہے ہیں، دعا کرو وہ طبع ہوجائے۔ میں چاہتا ہوں کہ تکرار نہ ہو، جو مواد بھائی جان کی کتاب میں آنے سے رہ جائے گا، اُسے میں مرتب کردوں گا۔ اسے حادثہ ہی کہیے کہ نہ اُن کی کتاب طبع ہوئی اور نہ یہ مرتب کرسکے۔

والدہ ماجدہ ہم بہن بھائیوں کو بچپن سے ہی نانا ابا جی رحمہ اللہ کی باتیں اور واقعات سناتیں۔ دین ومذہب، زبان وبیان، بول چال، لغت ومحاورہ، شعروادب، تاریخ وسیاست، استقامت وخودداری، ایثار وقربانی، تہذیب واخلاق، عادات واطوار، آدابِ مجلس، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، چھوٹوں سے شفقت، بڑوں کا ادب، تعلیم وتربیت غرض جس موضوع پر بھی گفتگو ہو وہ نانا ابا جی کی کوئی نہ کوئی بات ہمیں سناتیں۔

والدہ ماجدہ مدظلہا اس وقت حیاتِ مستعار کی پچھتر منزلیں عبور کرچکی ہیں اور میں زیست کی پچاس بہاریں دیکھ چکا ہوں۔ وہ اپنی شدید علالت اور ضعفِ حافظہ کے باوجود اب بھی

روزانہ کوئی واقعہ یا جملہ ضرور سناتی ہیں۔ انھیں اپنے ابا جی سے محبّت ہی بہت ہے۔ ہم بہن بھائیوں نے ہمیشہ اصرار کیا کہ آپ ان واقعات کو قلم بند فرما دیں۔ وہ ہماری فرمائش سن کر ایک آہ بھرتیں اور پھر اپنے ابا جی کی یادوں میں گم ہو جاتیں۔ میں نے ایک رجسٹر اُن کی جائے نماز کے ساتھ رکھ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اُن کا زیادہ وقت مُصلّے پر ہی گزرتا ہے۔ یہ درخواست بھی کی کہ جس وقت، جو یاد آجائے اس میں تحریر فرما دیا کریں۔ چنانچہ انھوں نے کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کر دیا۔

میں نے فروری ۱۹۸۸ء میں اپنے مربیّ ومحسن ماموں مولانا سید عطاء المحسن بخاری رحمہ اللہ کے حکم پر مجلس احرار اسلام کا ترجمان ماہنامہ ''نقیبِ ختم نبوت'' ملتان سے جاری کیا۔ اُن کی تربیت میں کم وبیش بیس سال گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ چند حرفوں اور لفظوں سے شناسائی ......اُنہی کا فیضانِ نظر ہے۔ بڑے ماموں جی (حضرت مولانا سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ) علم وتقویٰ میں بہت بلند درجے پر فائز تھے۔ اُن کی خدمت وصحبت میں رہ کر عقیدہ وفکر کی پختگی اور اصلاحِ اعمال کی نعمت حاصل ہوئی۔ والدہ ماجدہ اُن سے چھے سال چھوٹی تھیں، لیکن دونوں کے مزاج میں بہت ہم آہنگی تھی۔

۱۹۴۹ء میں بڑے ماموں جی نے ملتان سے ایک دینی، علمی و ادبی ماہنامہ ''مستقبل'' کے نام سے جاری کیا۔ میری والدہ بھی اس میں لکھا کرتیں۔ دونوں بہن بھائی مل کر مجلّہ تیار کرتے۔ یہ ۱۹۵۱ء تک شائع ہوتا رہا۔ ایک عظیم باپ نے ان کو گھر میں جو دینی و روحانی اور علمی و ادبی ماحول فراہم کیا، اس سے سب بہن بھائیوں نے خوب استفادہ کیا۔

اگست ۱۹۸۸ء میں ماہنامہ ''نقیب ختم نبوت'' نے امیر شریعت کی یاد میں خاص اشاعت کا اہتمام کیا۔ والدہ ماجدہ نے میری درخواست پر اس کے لیے ایک مضمون تحریر فرمایا جو ''تیری حیات ہے قندیل، رہ دکھاتی ہے'' کے عنوان سے ''امیر شریعت نمبر'' کی زینت بنا۔ یہ مضمون بائیس صفحات پر مشتمل تھا۔

دسمبر ۱۹۹۲ء میں امیر شریعت کے صد سالہ یومِ ولادت کے موقع پر پانچ سو چالیس صفحات پر مشتمل ''نقیبِ ختم نبوت'' کا ''امیر شریعت نمبر'' شائع ہوا۔ یہی مضمون چند اضافوں کے ساتھ اس میں مکرر شائع ہوا۔

اپریل ۱۹۹۵ء میں پانچ سو پچھتر صفحات پر مشتمل ''نقیبِ ختم نبوت'' کا ایک اور ''امیر شریعت نمبر''

شائع ہوا، جس میں سات صفحات کا ایک نیا مضمون ''کچھ پریشاں تذکرے'' کے عنوان سے تحریر فرمایا۔ اس کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے امیرِ شریعتؒ کے نام تین غیر مطبوعہ خطوط پہلی مرتبہ اس میں شائع ہوئے جن پر ''توضیحات'' کے عنوان سے تین صفحات کا ایک مضمون شامل تھا۔

میرے ایک محترم دوست پروفیسر محمود الحسن قریشی مرحوم (م: ۲۴/ جنوری ۲۰۰۶ء) بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ''اردو ادب وخطابت کی روایت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمات'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ 1 انھوں نے ایک سوال نامہ مرتب کر کے مختلف شخصیات کو بھجوایا۔ والدہ ماجدہ کو بھی اس کی ایک نقل بھجوائی۔ چنانچہ اس کے جوابات انھوں نے تحریر فرمائے۔

اخبارات میں گاہے بہ گاہے مختلف لوگوں کے مضامین، یادداشتیں، آپ بیتیاں اور انٹرویوز شائع ہوتے رہے۔ اُن کے مطالعے کے دوران جہاں کوئی غلطی نظر آئی، والدہ ماجدہ نے تحریری طور پر اس کی تصحیح فرمائی۔ اس کے علاوہ انھیں اپنے ابا جی کی گھریلو مجالس میں بہت کچھ سننے کا موقع ملا۔ جو باتیں حافظے میں رہ گئیں، انھیں بھی مختلف اوقات میں تحریر کرتی رہیں۔

''سیّدی واَبی'' دو ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب سوانحی تذکرہ ہے۔ یہ ۱۹۸۸ء کے اُسی مضمون کا تتمہ وتکملہ ہے جو ۲۲ صفحات سے شروع ہو کر اب ۱۳۴ صفحات میں پھیل چکا ہے۔ والدہ ماجدہ جب بھی کوئی واقعہ سناتیں میں فوراً درخواست کرتا کہ اسے تحریر فرما دیں۔ یوں مسلسل اضافوں سے اس مضمون نے کتاب کی شکل اختیار کر لی۔ اب اس کتاب میں اُن کی درج بالا تمام تحریریں شامل ہیں۔ قارئین کی سہولت اور تفہیم کے لیے عنوانات میں نے لگائے ہیں نیز دو تین مقامات پر حواشی بھی۔

دوسرے باب میں مکاتیبِ امیرِ شریعت ہیں۔

یہ کُل تئیس (۲۳) مکاتیب ہیں جنھیں زمانی ترتیب سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ سب

---

1 پروفیسر محمود الحسن قریشیؒ نے اپنے مقالے کے صرف دو ابواب خطابت کی تاریخ کے حوالے سے مرتب کیے تھے۔ شاہ جیؒ کی خطابت کے متعلّق انھوں نے جو مواد جمع کیا، وہ زیادہ تر میں نے ہی انھیں فراہم کیا۔ اس حصے کو وہ مرتب نہ کر سکے اور ۲۴/ جنوری ۲۰۰۶ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔

غیر مطبوعہ نجی خطوط ہیں اور پہلی بار شائع ہو رہے ہیں۔

پہلا خط حضرت امیر شریعت کا اپنی والدہ ماجدہ رحمہا اللہ کے نام ہے۔۱۹ خطوط اپنی بیٹی (جنھیں وہ ''بٹیا'' کہتے) کے نام ہیں جن میں ۱۴ خطوط تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے ایامِ اسیری میں سنٹرل جیل سکھر اور سنٹرل جیل لاہور سے تحریر کردہ ہیں۔ جب کہ ۵ خطوط ۱۹۵۴ء میں رہائی کے بعد کے ہیں۔ایک خط اپنی اہلیہ کے نام، ایک منہ بولی بیٹی کے نام اور ایک سمدھی کے نام۔

ان خطوط کے حواشی والدہ ماجدہ مدظلہا نے تحریر فرمائے۔۱۹۹۵ء میں مکاتیب کا مسودہ مکمّل کر کے انھوں نے اشاعت کے لیے میرے سپرد کر دیا۔ مجھے اپنی نالائقی کا اعتراف ہے کہ میں اِنھیں بر وقت شائع نہ کر سکا۔اب بھی صرف اُن کی دعاؤں کی برکت سے یہ تاریخی دستاویز طبع ہو رہی ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ کی اولاد میں اب میری والدہ ماجدہ ہی سب سے بڑی ہیں۔ میرا جی چاہتا کہ وہ اپنے اباجی سے متعلّق جو باتیں بھی بیان فرماتی ہیں، وہ اس کتاب کا حصہ بن جائیں۔بس میری یہی خواہش تاخیر کا سبب بنی۔ بہت سی باتیں اخی العزیز سید محمد ذوالکفل بخاری حفظہ اللہ نے والدہ ماجدہ سے سنی تھیں۔انھوں نے وہ تمام کی تمام والدہ ماجدہ سے لکھوا کر کتاب میں شامل کیں اور مسودۂ کتاب کا مطالعہ کر کے بہت ہی قیمتی مشوروں سے نوازا۔حضرت امیر شریعت کا مکمّل شجرۂ نسب پہلی مرتبہ شائع ہو رہا ہے۔ جو والدہ ماجدہ کے اکلوتے ماموں سید عبدالحمید بخاری رحمہ اللہ اور چچازاد سید سعید الرحمٰن شاہ صاحب مرحوم کے ہاں محفوظ تھا۔ جواُن کی اہلیہ محترمہ نے عنایت فرمایا، اسی طرح خالِ مکرم سید محمد یونس بخاری حفظہ اللہ نے خاص شفقت فرمائی۔انھوں نے شجرہ بھی عنایت فرمایا اور اپنے والد ماجد سید عبدالحمید بخاری رحمہ اللہ کی خاندانی یادداشتوں پر مشمل کاپی بھی۔اللہ تعالیٰ انھیں جزاءِ خیر عطاء فرمائے (آمین) والدہ ماجدہ نے اپنے بہن بھائیوں کی تواریخِ ولادت اسی کاپی سے نقل کی ہیں۔

مختصر سوانحی خاکہ بڑے ماموں جی حضرت مولانا سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ کے قلم سے ہے۔اس میں بعض اساتذہ کے ناموں اور پوتے، پوتیوں کا اضافہ میں نے کیا ہے۔

چند بنیادی کتابوں کو چھوڑ کر اس وقت شاہ جی کے نام پر کئی غیر معیاری چھوٹی بڑی کتابیں بازار میں موجود ہیں۔بعض ''محبّین'' نے اِدھر اُدھر سے بے ربط، بے حوالہ اور غیر مستند واقعات جمع کر کے مختلف کتابیں بناڈالیں اور بعض ماہرین نے شورش کاشمیریؒ اور جانباز مرزاؒ کی

کتابوں سے طویل اقتباسات حتیٰ کہ والدہ ماجدہ کی تحریریں بھی سرقہ کر کے اپنی کتابوں میں شامل کر لیں۔ایسی کتابوں کے مطالعے سے نئی نسل کے ذہنوں میں شاہ جی کی عظیم شخصیت کے بارے میں وہ تأثر قائم نہیں رہتا جواُن کی ہمہ جہت، ہمہ گیراور ہمہ پہلو شخصیت کا تقاضا ہے۔اسی مقصد کے پیش نظر آئندہ کے اشاعتی منصوبے میں شاہ جی کی شخصیت پر معیاری مضامین کا ایک مجموعہ اور ''خطباتِ امیرِ شریعت'' کی تدوین سرِفہرست ہے۔

''سیّدی وأبی'' پیش خدمت ہے۔''ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا'' اس کا قصوروار میں ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ اب اس کتاب میں بہت کچھ آ گیا ہے۔ یہ اس لحاظ سے مستند ہے کہ حضرت امیرِ شریعت کی بیٹی کی تحریر ہے۔معروف انداز میں یہ کوئی باقاعدہ سوانح نہیں لیکن اس کتاب میں سوانح بھی ہیں اورافکار بھی۔ خاندانی حالات کی تفصیل بھی ہے اور آباء واجداد کی تاریخ بھی واقعاتی زندگی کی جھلک بھی ہے اور انفرادی واجتماعی زندگی کے نقوش بھی۔ ماضی کی معروف وغیرمعروف اور ہم عصر شخصیات کا تذکرہ بھی ہے اور پند ونصائح کا خزانہ بھی۔خصوصاً گھریلو مجالس میں ہونے والی گفتگو اور واقعات بہت ہی اثر انگیز ہیں۔اسلوب انتہائی سادہ اوردل نشیں ہے۔

ایک خوبی یہ بھی ہے کہ تحریکِ آزادیٔ ہند میں مجلس احرارِ اسلام کی تاریخی جد وجہد کے کئی مخفی گوشے سامنے آ گئے ہیں۔

قارئین سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ میری والدہ ماجدہ مدظلہا کو صحت و سلامتی سے نوازیں،اُن کا سایۂ شفقت ہمارے سروں پر سلامت رکھیں اوراُن کی اس کتاب کو نافع بنائیں۔(آمین)

طالبِ دعا

سید محمد کفیل بخاری

دارِ بنی ہاشم ملتان

یکم محرم ۱۴۲۹ھ/۱۰ر جنوری ۲۰۰۸ء

تمہید

اگر مہر نیم روز کے سامنے مٹی کا دیا جلا کر سورج کی روشنی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے یا شب ماہتاب میں شمع جلا کر رات کی تاریکی کم کی جا سکتی ہے یا نسیمِ سحر کے روح پرور اور جاں فزا جھونکوں کے روبرو دستی پنکھے ہواؤں کو روح میں اتار سکتے ہیں تو پھر میرے ابا جی کی شخصیت کا حسن و وقار الفاظ سے اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ اولاد ہونے کے ناتے ابا جی ہمارے لیے تو دنیا و آخرت کی سب سے بڑی نعمت تھے...... ع

پھر ان کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ہمارے لیے تو ان کی زندگی کے تمام نشیب و فراز ہی اصول زیست تھے اور ہیں۔ کبھی ان کی قدر و منزلت ان کو ر بصر اپنوں، بیگانوں سے بھی پوچھی جائے کہ جنھوں نے ان سے نہ صرف یہ کہ اختلاف کیا بلکہ مخالفت کی پستیوں میں اترتے چلے گئے۔ الزام و دشنام کے ہر ہر گوشے کو اِن ''مسلمان'' کہلانے والوں نے یوں گرمایا کہ ہر سو شرافت دم توڑ گئی اور حیا سرنگوں ہو گئی۔

پھر حالات کو ان کے پیش کردہ خدشات کے مطابق ڈھلتے دیکھا تو یہ ''غدار'' کہنے اور گالیاں دینے والے، روتے ہوئے ان کی چوکھٹ پر آئے اور انھوں نے گلے لگاتے ہوئے وہی سلوک کیا جو ایک شفیق باپ بے وقوف اولاد کے نادم ہونے پر کرتا ہے۔

جب بھی وہ یاد آتے ہیں تو ذہن میں ایک طوفان سا برپا ہو جاتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر اُن کی یادوں کو قلم بند کروں تو کہاں سے شروع کروں۔ میرے بچے جب بھی ان کی باتیں سنتے ہیں تو باصرار ان کی فرمائش ہوتی ہے کہ اپنی یادداشتیں قلم بند کر دوں۔ مگر پہلے گھر کے کام اور بچوں کی نگہداشت سے فرصت نہ ملتی تھی۔ بچیوں نے گھر کا کام سنبھال لیا تو اپنی صحت جواب دے

گئی۔نورالعیون، کفیل احمد اور محمد ذوالکفل سلمہما کا دھیما دھیما اصرار کئی دن سے جاری ہے اور میں عجوزۂ مصر کی طرح سوت کی انٹی لے کر خریداری کا ارادہ باندھ رہی ہوں تو اس لیے کہ وہ جس کی نگاہ برق اور چہرہ آفتاب تھا۔وہ جو مجھ پر محبّتوں کی بارش برسانے والا، میرا باپ تھا۔آج اس کی یادوں کو سمیٹنے کے لیے قلم اٹھا رہی ہوں۔

محبّت صَرفی نحوی قواعد اور تعبیر وانشاء کی ترکیب وترتیب سے آزاد ہوتی ہے۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ابا جی کی یاد میں چند بار مرحوم بھائی عطاءالمحسن نَوَّرَاللّٰہ مَرقَدَہٗ کی پُرزور فرمائش پر یا بعد میں کسی تحریک پر جو جہاں یاد آیا ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنے دِلی جذبات صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتی رہی۔ابا جی کے جو خطوط میرے پاس تھے بھائی مرحوم ہی نے کہا ان کے ساتھ اگر کوئی واقعہ بھی متعلّق ہو تو حاشیہ میں لکھ دیں۔کفیل احمد سلمہ اللہ اب چاہتے ہیں، سب کو اکٹھا کر کے شائع کر دوں۔اس مجموعہ میں جو خوبی ہے وہ ابا جی کی ذاتِ گرامی کی وجہ سے ہے اور جو خامی ہے وہ میری کم علمی کی وجہ سے۔بس یہ ایک بیٹی کا اپنے عظیم القدر باپ کی خدمت میں نذرانہ ہے اور کچھ نہیں۔

میں اپنے شفیق وعظیم باپ کی کن کن خوبیوں کا تذکرہ کروں اور انھیں کن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کروں؟

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

(آپ کی ذات تو خوبیوں کا مجموعہ ہے میں آپ کو کس نام سے پکاروں)

’’تری حیات ہے قندیل، رہ دکھاتی ہے‘‘

اُمّ کفیل

۲۱ربیع الاوّل ۱۴۲۹ھ/۳۰مارچ ۲۰۰۸ء

دارِبنی ہاشم، ملتان

بچپن کا پہلا واقعہ:

مجھے اپنے بچپن کا سب سے پہلا واقعہ جو یاد آتا ہے وہ چار برس کی عمر کا ہے۔ امرتسر میں ہمارا مکان گلوالی دروازہ کے اندر تکیہ بابا ستار شاہ سے ورے اور مولانا بہاءُ الحق قاسمی مرحوم کے گھر کے سامنے تھا۔ ہمارے گھر کا دروازہ سڑک پر کھلتا اور گھر کی جنوب مشرقی سمت کی کھڑکیاں بھی سڑک پر کھلتی تھیں۔ محلے کی سڑک تھی شاہراہ نہ تھی۔ ٹریفک کی کمی کی وجہ سے بچے سڑک کے اِس پار سے اُس پار آسانی سے آجاسکتے تھے۔ سڑک پر خوانچے والے پے درپے گزرتے، اور گزرتے بھی صدائیں لگاتے ہوئے تو کسی وقت ایمان ''متزلزل'' ہو ہی جاتا!

ایک دن بیر بیچنے والے کی آواز کان پڑی تو میں نے اماں جی سے ایک پیسہ مانگا جو مل گیا اور میں ''بانو'' کے ہمراہ دروازہ پر پہنچی تو بیر والا پچھواڑے میں ''گورکنوں'' کی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ ہم نے اس سے بیر لیے اور اسی گلی میں بانو مجھے اپنے گھر لے گئی۔ وہاں کچھ دیر ہوگئی، ادھر میری تلاش شروع ہوگئی۔ ڈھونڈنے والا یاد نہیں کون تھا۔ بہرحال وہ ''بانو'' کے مکان تک پہنچ گیا اور ہمیں لے کر گھر آگیا۔ ابا جی اس تاخیر پر پریشان تھے۔ انھوں نے اظہارِ ناراضی اور تنبیہ کے لیے ایک ہلکا سا تھپّڑ میرے گال پر سجادیا۔ میرے لیے تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں جو اونچی آواز سے ڈانٹ سننے کی عادی نہ تھی، رخسار پر طمانچہ کھا کے پھوٹ پھوٹ کر روئی اور روتے روتے وہیں ابا جی کے پاس ہی سوگئی۔

اس واقعہ کو نصف صدی بیت چکی ہے اور مجھے خوب یاد ہے کہ جس وجہ سے میری آنکھ کھلی وہ یہ تھی کہ میرے ابا جی، میرے گال اسی جگہ سے چوم رہے تھے جہاں انھوں نے طمانچہ مارا تھا۔

ایک اور شخصیت:

ہمارے گھر میں ۱۹۳۸ء تک (۳۸ء میں بھائی عطاءالمحسن کی ولادت ہوئی) میرے اور بھائی جان (سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ) کے علاوہ ایک شخصیت اور تھی جو سن شعور کو پہنچنے تک ہمارے ہاں بطور فردِ خانہ مقیم رہی اور وہ تھی ''بانو''۔ بانو، محلّہ کے ایک غریب کشمیری خاندان کی لڑکی

تھی جو کسی استاد کے قابو میں نہ آتی تھی ۔اس کی والدہ‘اماں جی کے پاس اسے قرآن مجید پڑھنے کے لیے بٹھا گئی ۔ مجھے بانو کی آمد کا سماں آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ہمسایوں کے لڑکے بانو کے ہاتھ پاؤں پکڑے اس کا ’’ڈولی ڈنڈا‘‘ بنا کر اٹھائے ہوئے لے آئے اور بانو بھی ہاتھ پاؤں مارتی چلاتی ہوئی اپنا آپ ان ’’ظالموں‘‘ سے چھڑانے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی ۔اور پھر چند دن تک یہ منظر دیکھنے میں آتا رہا کہ محلے کے ہمسایہ بچوں کی ’’دستی زنجیر‘‘ میں جکڑی ہوئی بانو تڑپتی پھڑکتی ہمارے ہاں پہنچائی جا رہی ہے ۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بانو ہم بہن بھائیوں کے ساتھ یوں گھل مل اور رچ بس گئی گویا ہماری حقیقی بہن ہے ۔بانو کے اس انقلاب میں میرے ابا جی کے روح میں اتر جانے والے پیار کا بہت زیادہ حصہ تھا ۔اگر چہ اماں جی نے بھی اس سے کم محبّت نہیں کی تھی مگر وہ اس کی معلّمہ بھی تھیں ۔اس ناتے کبھی کبھار ’’مرمت‘‘ بھی ہو جاتی لیکن ابا جی کی مؤدَّت ورأفت سے بانو اس گھر کے ایک فرد کی صورت میں ڈھل گئی تھی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ماہ و سال گزر گئے ۔ مجھ میں اور بانو میں جدائی کا تصور بھی کبھی نہ ابھرا تھا ۔کیا ہوا جو بانو مہینے میں کبھی کبھار اپنے ماں باپ کے گھر بھی ہو آئے ۔اُس کے والدین نے جب اس کی شادی کرنا چاہی تو ابا جی تبلیغی سفر پر تھے ۔شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ۔گھر جانے کے نام پر وہ رونا شروع کر دیتی ۔ محلے کی چند لڑکیوں نے ہمارے ہاں ہی اس کو مہندی لگا دی ۔بارات والے دن اس کی والدہ آئی اور ہنستے ہوئے کہنے لگی:

’’بی بی جی!ہُن ایہنوں گھر بھیجو‘رات ڈولی کنوں پاواں گی؟‘‘

(بی بی جی!اب اسے گھر بھیجو ۔رات ڈولی میں کسے بٹھاؤں گی؟)

اس نے یہ سن کر دروازے کو پکڑ کر چیخیں مارتے ہوئے کہا:

’’بی بی جی!اَج تُسی مینوں کیوں اپنے کول نئیں رکھدے؟

اَج میں تہانوں کیوں نئیں چنگی لگدی؟

اَج مینوں کیوں گھروں کڈھدے او؟‘‘

(بی بی جی! آج آپ مجھے اپنے پاس کیوں نہیں رکھتیں؟ آج میں آپ کو کیوں اچھی نہیں لگتی؟ آج مجھے کیوں گھر سے نکال رہی ہو؟)

بیٹیوں کی رخصتی کی تاریخ میں وہ انوکھا دن تھا۔اماں جی نے پاس بٹھا کر پیار کیا اور سمجھایا۔اس نے گھر جانے کی تین شرطیں پیش کیں:

(۱) ''بی بی جان'' نوں بھیجو گے۔(یعنی مجھے)

(۲) جے ''وڈے شاہ جی'' آ گئے تے او ہناں نوں بھیجو گے۔(مراد ابا جی ہیں)

(۳) ''چھوٹے شاہ جی'' آ گئے تے او ہناں نوں وی بھیجو گے۔(یعنی بھائی جان)

اماں جی نے فرمایا: ''سب کو بھیجوں گی۔'' یوں وہ اپنی والدہ کے ساتھ گھر جانے پر تیار ہوئی۔اس کی محبّت کی کشش تھی کہ اسی شام بھائی جان خیر المدارس جالندھر سے چھٹی پر گھر آئے اور ابا جی عین اس وقت پہنچ گئے' جب اس کی بارات ہمارے گھر کے سامنے سے گزر کر ان کے ہاں پہنچی تھی۔مجھے بھائی جان کے ساتھ ان کے گھر بھیجا گیا۔گھنٹہ بھر بیٹھی پھر بھائی جان واپس لے آئے۔با دلِ نا خواستہ اُن کا حکم مانا۔گھر پہنچے تو بانو کا والد اور بہنوئی ابا جی کو لینے آ گئے۔ابا جی اسی وقت اُن کے گھر گئے۔ساتھ یہ فرمایا کہ مجھے پوچھ کر تاریخ رکھتے تو میں اپنے گھر سے رخصت کرتا۔ان کے گھر پہنچے تو وہ ابا جی سے لپٹ کر خوب روئی۔ابا جی سر پر پیار دے کر روتے ہوئے واپس آ گئے اور کہنے لگے: ''بلائی'' نے مجھے بھی رلا دیا۔'' یہ اُس دور کی بات ہے جب بیٹیاں میکے چھوڑتے رویا ہی کرتی تھیں۔ہماری بانو جواب اس دنیا میں نہیں ہے اس کی محبّتوں کا تذکرہ تفصیل چاہتا ہے۔روحِ وفا، جانِ اخلاص بانو! تیری تربت پہ اللہ کی رحمتوں کا نزول ہو۔

مولانا سید محمد یوسف بخاریؒ کی ابا جی کو نصیحت:

ابا جی، ناگڑیاں (ضلع گجرات) سے حصول تعلیم کے لیے امرتسر آنے لگے تو خاندان کے بزرگ حضرت مولانا سید محمد یوسف بخاری رحمہ اللہ سے ملنے گئے۔وہ دادا جی کے چچیرے چچا، ہمارے نانا سید مصطفیٰ بخاری صاحبؒ کے بڑے بھائی اور اماں جی کے حقیقی تایا تھے۔مسلکاً

ہمارے خاندان کے واحد اہل حدیث بزرگ اور حضرت مولانا نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے ۔ پیر جماعت علی شاہ علی پوری رحمہ اللہ بھی کچھ عرصہ ان کے ہم سبق رہے تھے۔انھوں نے پیدل سفرِ حج کیا اور ایک سال بعد گھر واپس آئے۔گاؤں میں اس زمانہ میں وزیر آباد سے مستری بلوا کر شاندار مسجد تعمیر کرائی تھی جو اب تک موجود ہے۔گھر اور مسجد کی دیوار ایک ہے۔اسی مسجد میں تشریف رکھتے ۔ ابا جی فرماتے تھے: میں مسجد میں حاضر ہوا اور عرض کیا بابا جی پڑھنے جا رہا ہوں نصیحت فرمائیے ۔انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور سورۂ لقمان کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

یَا بُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَأمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلیٰ مَا اَصَابَکَ اِنَّ ذَالِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ o

[اے بیٹے ! قائم رکھ نماز اور سکھلا بھلی بات اور منع کر برائی سے اور تحمل کر، جو تجھ پر پڑے ۔ بے شک یہ ہیں ہمت کے کام (سورۃ لقمان: ۱۷)-------]

میں نے سلام اور مصافحہ کیا اور اٹھ کر آ گیا ۔اس سے بڑی نصیحت اور کیا ہوتی ؟

بابا جی کا مزار اب بھی گاؤں میں مرجع عوام ہے ۔ ان کی بنائی ہوئی مسجد میں قریباً چالیس سال ہمارے دادا جی حضرت حافظ سید ضیاء الدین بخاری رحمہ اللہ نے امامت کی اور تراویح میں کلام پاک بھی سنایا ۔ ان کے بعد خاندان کے ایک دو افراد نے امامت کی ۔کافی عرصہ بعد ۱۹۸۵ء میں ہماری اکلوتی خالہ مرحومہ کی خواہش پر بھائی عطاء المحسن رحمہ اللہ نے وہاں قرآنِ کریم کے حفظ و ناظرہ کا مدرسہ قائم کیا۔خالہ جی ۱۹۸۵ء میں ہی انتقال کر گئیں، لیکن مدرسہ بحمد للہ آج بھی قائم ہے۔جو یقیناً خاندان کے تمام اسلاف کے لیے صدقۂ جاریہ اور ذریعۂ نجات ہے۔اللہ تعالیٰ اس مدرسہ کو قائم رکھیں اور ترقی عطا فرمائیں (آمین)

اماں جی فرماتیں کہ ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت کے ضمن میں جب تمہارے ابا جی گرفتار ہو کر میانوالی جیل میں قید تھے تو میں گجرات سے گاؤں آ گئی ۔انہی دنوں بابا سید محمد یوسف شاہ

صاحبؒ ہمیں گھر میں پنجابی ترجمے کے ساتھ قرآن کریم پڑھایا کرتے ۔میں نے چار پارے ترجمہ کے ساتھ انہی سے پڑھے۔

ننھیالی گھر اور مسجد کی دیوار ایک تھی ۔ ہماری نانی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کو تلاوت کا بہت شوق تھا، سینکڑوں لڑکوں لڑکیوں کو قرآن مجید پڑھایا۔ ابا جی کا امرتسر آنے سے پہلے مسجد میں روزانہ ختم قرآن کا معمول تھا۔ نانی جی پیڑھی بچھا کر مسجد کی دیوار کے ساتھ بیٹھ جاتیں اور قرآنِ کریم سنتی رہتیں ۔اللہ پاک سب کی ارواح پر رحمت نازل فرمائیں (آمین ثم آمین)

اجداد کی کشمیر سے ہجرت اور پنجاب میں آمد

ہمارے لکڑ دادا سید محمد شاہ صاحب بخاری اور ان کے بھائی سید امان اللہ شاہ بخاری، سید عبدالصمد شاہ بخاری، سید احمد شاہ بخاری ...... یہ وہ حضرات تھے جنھوں نے کشمیر سے پنجاب کا رخ کیا' اور ہجرت کر کے ناگڑیاں آن بسے۔ پنجاب میں یہ رنجیت سنگھ کا دور تھا۔ ناگڑیاں کے قریب ایک جگہ ہے ''سرہالی'' ۔ پہلے پہل یہ حضرات وہاں آئے اور پھر ناگڑیاں ۔

سید محمد شاہ صاحب کا مکمّل نام' ابا جی ''اکمل الدین محمد'' بتلایا کرتے تھے ۔لیکن خاندان میں بالعموم ''بابا محمد شاہ'' کے نام سے ہی ذکر کیے جاتے تھے ۔شجرۂ نسب میں بھی یہی نام درج تھا۔ وہ شاہ غلام علی دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز تھے' اور سرہالی، صبور اور ناگڑیاں وغیرہ میں ان کے کئی مرید تھے ۔شاید اِنھی لوگوں کے بلانے سے یہ حضرات' پنجاب آئے تھے ۔اس وقت کے حالات نے ایسا کیا پلٹا کھایا اور کیا اسباب بنے ، پنجاب میں سکونت کے؟ مجھے ایسی کسی تفصیل کا سننا یاد نہیں۔ ڈوگرہ راج کی وحشت ناکی اپنی جگہ ایک مستقل عذاب تو تھی ہی ۔ بہت ممکن ہے وہی سبب بنی ہو۔

کرشمہ ہائے جذب:

سید محمد شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا جذب البتہ بہت مشہور تھا۔ اور خاندان میں اس سے وابستہ کئی حکایات روایت کی جاتی تھیں ۔ اکثر حالت جذب ہی میں رہتے تھے ۔اسی حالت میں

ایک دفعہ گھر سے نکلے تو ایک نوجوان برہان الدین اچانک سامنے آ گیا۔ بابا محمد شاہ صاحبؒ نے اسے دیکھتے ہی دو ہتڑ رسید کیا۔ یک لخت ہی اس کی حالت بھی مجذوبانہ ہوگئی۔ گاؤں والے اسے ''سائیں برام'' کہا کرتے تھے۔ ہماری دوسری دادی صاحبہ کے بھائی حافظ حبیب اللہ شاہ صاحب فوج میں امام تھے اور فوجی دستے کے ساتھ عدن گئے ہوئے تھے۔ ایک دن ''سائیں برام' اچانک گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو حافظ صاحب کی اہلیہ کے سر سے دوپٹہ کھینچ کر زمین پر پھینک دیا اور ساتھ کہتے جاتے تھے: گولی لگ گئی، گولی لگ گئی۔ بابا یوسف شاہ صاحبؒ (حافظ صاحب کے چچا) نے کمر پکڑ لی اور بولے خیر نہیں ہے۔ چند دن بعد حافظ صاحب کی شہادت کی اطلاع آ گئی۔ وہ وہیں عدن میں دفن کیے گئے۔

خاندان میں نسل سید محمد شاہؒ (ہمارے دادا جی کے دادا) اور سید امان اللہ شاہؒ (ہمارے نانا جی کے والد) سے ہی چلی۔ سید عبدالصمدؒ لاولد رہے۔ سید احمد شاہؒ کلکتے چلے گئے تھے۔ پھر وہاں سے نہ وہ خود لوٹ کر آئے اور نہ ہی کبھی اُن کی کوئی اطلاع آئی۔

غیرتِ فقر:

سید محمد شاہ صاحبؒ ہی کا قصہ ہے۔ ایک دفعہ گھوڑے پہ سوار' گاؤں سے باہر کہیں جارہے تھے۔ راستے میں ایک سکھ تھانیدار اور دو چار سپاہی ملے۔ تھانیدار نے چھوٹتے ہی رعونت سے کہا...... ''ڈھل جاسگدا''! یعنی' گھوڑے سے اتر جاؤ۔ اور ''سید' کی بجائے اس نے ''سگ' کہا۔ گالی کا سننا تھا کہ طیش میں آ گئے۔ تلوار ان کے پاس ہوا ہی کرتی تھی۔ ایک ہی وار سے، تھانیدار کی لات کاٹ ڈالی۔ اس سے پہلے کہ پولیس والے سنبھلتے' آپ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور یہ جا وہ جا۔ راستے میں ایک جگہ کسی قافلے نے پڑاؤ کیا ہوا تھا۔ قریب پہنچے تو دیکھا کہ یہ کشمیری ''ہاتو'' تھے۔ سوڈیڑھ سو افراد۔ انہیں اپنا تعارف کرایا اور یہ ماجرا بھی سنایا۔ انھوں نے نہایت تعظیم وتکریم کی۔ اتنے میں وہ پولیس والے بھی تعاقب کرتے ہوئے آ نکلے۔ آن کی آن میں' وہ سوڈیڑھ سو کشمیری ڈنڈے سونٹے اٹھا کر ''ہتھیار بند'' ہو گئے اور پولیس والوں نے پسپائی اور فرار

سے جان بچائی۔ بابا محمد شاہ صاحب علیہ الرحمۃ' سیدھے امرتسر پہنچے اور میر عبدالصمد سے ملے۔ یہ ہمارے خاندانی عقیدت مند تھے اور رنجیت سنگھ کی حکومت میں کسی اچھے منصب پر تھے۔ امرتسر میں ''صمدو کا تالاب'' (تالاب عبدالصمد) انہی سے منسوب تھا۔ میر صاحب سے بابا جیؒ نے سکھ تھانیدار کی شکایت کی۔ انھوں نے فوراً ''گرفتار کر کے پیش کرو'' کا حکم دیا۔ چنانچہ بابا محمد شاہؒ جب امرتسر سے' گھر کو لوٹ رہے تھے تو راستے میں انھوں نے دیکھا کہ وہی تھانیدار' گرفتار ہو کر امرتسر لے جایا جا رہا تھا۔

نشۂ درویشی:

ایک بات اور بھی یاد آ گئی۔ غالباً ۱۸۵۶ء کے بندوبست اراضی کا موقع تھا۔ انگریزی راج تھا اور سرکاری عملہ گاؤں گاؤں پہنچ کر اراضی کے ملکیتی ریکارڈ کو درست کر رہا تھا۔ ناگڑیاں اور اس کے نواحی دیہات میں کتنے ہی قطعات اراضی تھے جو مریدین نے ہمارے ان بزرگوں (سید محمد شاہ اور سید امان اللہ ...... رحمتہ اللہ علیہما) کے نام کر رکھے تھے۔ ان حضرات سے عرض کیا گیا کہ آپ صرف ایک بار چل کر سرکاری عملہ اراضی سے مل لیں۔ جہاں جہاں جو جو اراضی آپ کے نام کی ہے' وہ نئے ریکارڈ کا حصہ بن جائے گی، لیکن بزرگوں کا متّفقہ اور اٹل فیصلہ یہ ٹھہرا کہ اس طرح کی فدویانہ حاضریوں اور پیشیوں اور اراضی کے اس سارے جھنجھٹ پر ہی تین حرف بھیجو۔ بیل ذبح کیے، ہل پنجالی، کلہاڑے سے کاٹے اور دیگیں پکا کر گاؤں والوں کو کھانا کھلا دیا۔ غیرت فقر کہیے، خون کا اثر، یا کچھ اور...... لیکن واقعہ یہی ہے۔ یوں الحمدللہ، اس خاندان کو وراثتی جھگڑوں اور جاگیردارانہ بیماریوں سے اللہ نے محفوظ فرما لیا۔ بہت سی زمینیں تقسیم کے بعد تک محکمہ مال کے اندراج میں ہمارے بزرگوں ہی کے نام تھیں۔ ہمارے ماموں سید عبدالحمید بخاریؒ سے علاقے کے پٹواریوں نے اُن دنوں کہا بھی کہ آپ آئیں اور ملکیتی کاغذات وصول فرما لیں۔ قبضہ و ملکیت میں قانوناً کچھ مانع نہیں تھا، لیکن ماموں جان علیہ الرحمۃ نے بزرگوں کے سو سال پرانے فیصلے ہی کو بحال رکھا۔

وہ زمانے میں معزز تھے......

سید محمد شاہ صاحبؒ کے پانچ بیٹے تھے اور سید امان اللہ شاہ صاحبؒ کے چھے 1 ۔

1 ......(الف) سید محمد شاہ صاحبؒ کے بیٹے تھے......سید نورالدینؒ (ہمارے پردادا)، سید حیدر شاہؒ (سید محمد مقیمؒ کے والد، سید محمد حامدؒ کے دادا)، سید پیر شاہؒ، سید حسام الدینؒ اور سید عبدالغنیؒ جبکہ تین بیٹیاں تھیں۔ سید نورالدینؒ کے بیٹے تھے......سید ضیاءالدینؒ، سید عباسؒ (نوجوانی میں کنوارے ہی چل بسے) اور سید صدرالدینؒ (شیر خوارگی میں فوت ہوگئے)۔

(ب) سید امان اللہ شاہ صاحبؒ کے بیٹے تھے......سید امیر شاہؒ، سید محمد یوسفؒ، سید مصطفیٰ شاہؒ (ہمارے نانا)، سید فضل شاہؒ، سید حسن شاہؒ، سید نظام شاہؒ۔

دادا جان سید ضیاءالدین رحمۃ اللہ علیہ کے چاروں چچا حافظ سید حیدر شاہ صاحب، سید پیر شاہ صاحب، سید حسام الدین شاہ صاحب، سید عبدالغنی شاہ صاحب بسلسلۂ تجارت پٹنہ، گیا' شہروں میں آمدورفت رکھتے تھے۔ پڑدادا سید نورالدین صاحب کا انتقال جوانی میں ہی ہوگیا۔ دادا جی دس برس کی عمر میں یتیم ہوگئے۔ پھر چچاؤں کے ساتھ تجارتی سفر میں پٹنہ گئے اور طویل قیام کیا۔ سید محمد اسحاق شاہ صاحب، سید عبدالغنی صاحب کی واحد اولاد تھے۔ ہزاری باغ (بہار) سے سب انسپکٹر پولیس ریٹائر ہوئے۔ لاولد تھے۔ امرتسر میں قیامِ پاکستان تک قیام رہا۔ بعد ازاں گجرات شہر میں اقامت اختیار کی اور وہیں انتقال ہوا۔ پیر شاہ صاحب بھی بے اولاد تھے۔ حسام الدین شاہ صاحب کی تین بیٹیاں عمر طبعی کو پہنچیں، صاحبِ اولاد ہوئیں۔ بیٹا ان کا بھی نہیں تھا۔ حافظ حیدر شاہ صاحب کے بھی ایک ہی بیٹے تھے' سید محمد مقیم۔ انھوں نے بی اے کیا۔ پولیس میں سب انسپکٹر ہوکر طویل عرصہ کلکتہ میں تعینات رہے۔ ۳۰ء میں ابا جی کے طویل دورہ کے وقت کلکتہ ہی میں تھے۔ ان کے گھر ابا جی گئے تو انھوں نے خضاب لگا کر حلیہ تبدیل کردیا۔ اگر ان کے گھر سے ابا جی برآمد ہوتے تو وہ بھی نوکری سے جاتے۔ ابا جی کے ہر صوبہ سے وارنٹ گرفتاری جاری ہوچکے تھے۔ ۱۴ تک تعداد پہنچی تھی کہ دیناج پور میں میزبان کے گھر سے گرفتار ہوئے۔ ایک دفعہ بتایا کہ صبح نماز پڑھ کر بیٹھا تھا کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو ایک صاحب جو دراصل پولیس والے تھے' پوچھنے لگے کہ سنا ہے یہاں کوئی پیر صاحب آئے ہوئے ہیں' وہ کہاں ہیں۔ میں فوراً سمجھ گیا اور کہا فرمائیے کیا کام ہے؟ انھوں نے سمن گرفتاری پیش کردیئے۔ پہلے دیناج پور، پھر ڈم ڈم جیل میں قید رہے۔ مقیم شاہ صاحب کا بھی ایک ہی بیٹا تھا۔ باپ بیٹا دونوں وفات پاچکے ہیں۔ مقیم شاہ صاحب چودھویں صدی کے پہلے دن کی پیدائش تھے۔ تقریباً ۱۰۰ سال عمر پائی۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں وفات پائی۔ حافظ حیدر شاہ صاحب کا نکاح بھی پٹنہ ہی کے اندرابی سادات میں ہوا تھا۔ اس طرح ابا جی اور مقیم شاہ صاحب کا ننھیال ایک ہی تھا۔ ہماری دادی صاحبہ اور ان کی والدہ رشتہ میں بہنیں تھیں۔

بڑی بوڑھیاں بتلاتی تھیں کہ یہ حضرات کبھی گھر سے اکٹھّے نکلتے تھے تو گاؤں والے کہتے:

''شاہنیاں دی جنڑ نکلی اے''

(جواں مردانِ سادات کی منڈلی نکل آئی ہے)

قد وقامت، کلے ٹھلے اور روپ رنگ میں اللہ پاک نے کوئی کمی نہ رکھی تھی۔ چہرے روشن، سینے روشن تر۔ فارسی عربی گھر کی چیزیں تھیں۔ بابا محمد شاہؒ کے بیٹے سید حیدر شاہؒ حافظ قرآن تھے۔ سید نور الدینؒ (ہمارے پر دادا) حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ کے مسترشد اور خلیفہ مجاز تھے۔ ایک اور بیٹے سید پیر شاہؒ فارسی کے ایسے فاضل تھے کہ ایک ہی رات میں ایک مثنوی تصنیف فرمائی۔ اس کا ایک شعر اماں جیؒ ہمیشہ سنایا کرتی تھیں کہ:

چند کہگل می کنی دیوار بے بنیاد را

پند سودے کے کند رسوائے مادر زاد را

بابا امان اللہ شاہؒ کے بیٹے سید محمد یوسف شاہؒ جیّد عالم دین تھے۔ جن کا ذکر اوپر گزرا۔ دوسرے بیٹے سید نظام شاہؒ حافظ قرآن تھے۔ گھروں میں خواتین بھی انہی روایات کو تھامے ہوئے تھیں۔ حفظِ قرآن، ترجمۂ قرآن، ضروری شرعی مسائل۔ یہ سب کچھ گھروں میں پڑھا اور پڑھایا جاتا۔ لوگوں نے ہمارے بڑوں سے قرآن پڑھا، دین سیکھا، ان کے ہاتھوں پر توبہ تائب ہوئے اور عورتوں نے ہمارے گھروں سے دین سیکھا۔ یہ فیض کئی نسلوں میں منتقل ہوا۔

خود ہماری اماں جیؒ نے قرآن اپنی والدہ سے پڑھا۔ پھر چند پاروں کا ترجمہ، پنجابی میں، اپنے چچا سید محمد یوسف شاہ صاحبؒ سے پڑھا۔ کچھ کتابیں عقائد اور مسائل کی اس زمانے میں ہمارے گھروں میں اہتماماً پڑھی اور پڑھائی جاتی تھیں۔ ایک تھی ''احوال الآخرت''۔ ایک اور کتاب شاید ''زینت الاسلام'' تھی۔ ایک آدھ شاید اور بھی ہو۔ یہ سب سنی ہوئی باتیں ہیں۔ بہت کچھ بھول گیا اور کچھ کچھ یاد ہے۔ اماں جی نے امرتسر اور ملتان میں جتنے بچے، بچیوں کو قرآن پڑھایا، ان کی تعداد سینکڑوں میں تو ضرور ہی ہوگی۔

بچپن میں ہی انگریز سے نفرت:

ابا جی کے بچپن کا قصہ ہے ۔قریباً دس گیارہ برس کی عمر کے ہوں گے۔گاؤں میں کوئی انگریز افسر آیا۔گاؤں کے بڑے مثلاً ذیلدار،نمبردار،زمیندار حضرات وغیرہ جمع تھے ۔ہمارے نانا جی سید مصطفیٰ شاہ صاحبؒ بھی موجود تھے ۔(خاندان کے کئی بزرگ چونکہ فوج میں امام تھے، اس لیے ایسے مواقع پر انہیں حاضری کی رسم نبھانی پڑتی تھی)۔ابا جی بھی ’’تماشا‘‘ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔گاؤں کے عمائدین قطار بنا کر کھڑے تھے اور وہ افسر باری باری سب سے مصافحہ کرتا آرہا تھا۔نانا جی نے ابا جی سے کہا تم بھی ہاتھ ملاؤ مگر انھوں نے کہا میں ہاتھ نہیں ملاؤں گا اور فوراً قطار سے پیچھے ہٹ کر کھڑے ہوگئے ۔اماں جی بتایا کرتیں کہ نانا جی نے گھر آکر کہا۔’’ویکھو ایس منڈے دا کم میں ایہنوں کہیا توں وی ہتھ ملا لے‘ ایہنے کہیا میں نہیں ملانا (اس لڑکے کے کام دیکھو۔میں نے کہا بھی کہ ہاتھ ملالو۔بولا:نہیں ملاؤں گا)۔

قرآن سے محبّت:

قرآنِ کریم سے جتنا لگاؤ اور جتنی محبّت‘ابا جی کو بچپن ہی سے پیدا ہوگئی تھی‘اُسی کا اثر تھا کہ عمر بھر انھیں قرآن کا پڑھنا پڑھانا ،سننا سنانا اور سمجھنا سمجھانا سب سے زیادہ محبوب رہا۔ہمیشہ یہی فرماتے رہے کہ ’’مجھے ایک چیز سے محبّت ہے اور وہ ہے قرآن،اور ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے انگریز۔‘‘ابا جی کے نانا میر سید احمد اندرابیؒ حافظ قرآن تھے اور حد درجہ خوش آواز۔جبکہ ابّا (یعنی ہمارے دادا)سید ضیاء الدین بخاریؒ اتنے پختہ حافظ تھے کہ بایدوشاید۔

حضرت حافظ سید ضیاء الدین بخاری رحمہ اللہ

ایک رکعت میں چھبّیس پارے:

دادا جی (حضرت حافظ سید ضیاء الدین بخاری رحمہ اللہ) کی نوعمری کا ہی قصہ ہے (جو کئی جگہ معمولی کمی بیشی سے نقل بھی ہوا ہے) جب انھوں نے ایک رکعت میں چھبّیس پارے ختم کیے تھے ۔یہ پٹنہ کا واقعہ ہے ۔دادا جی دس برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے اور کسبِ معاش کے سلسلے میں خاندانی بزرگوں،چچا تایا صاحبانؒ کے ساتھ مشرقی ہند کو جایا کرتے تھے ۔یہ حضرات پنجاب اور کشمیر

سے پشمینہ، زعفران، عنبر، کستوری اور عرق گلاب وغیرہ لے جا کر وہاں فروخت کرتے تھے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ دادا جی، پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ مسجد میں عشاء اور تراویح کی نماز پڑھی تو دیکھا کہ کئی حافظ صاحبان باہم مشورے سے طے کر رہے ہیں کہ آج شبینے میں ختم قرآن کے لیے کون کتنے پارے پڑھے گا؟ دادا جی نے حیرت سے پوچھا: کیا آپ سب لوگ مل کر ایک قرآن ختم کریں گے؟ ایک ہی آدمی شبینہ نہیں پڑھ سکتا کیا؟ یہ سننا تھا کہ سب کی نظریں ان کی طرف اٹھیں۔ انھوں نے بات ہی ایسی کہی تھی جو نہ وہاں کے رواج میں تھی اور نہ ہی کسی کے خیال میں۔ چنانچہ مختلف آوازیں اٹھیں۔ کسی نے کہا: خوب یہ اچھی کہی۔ کسی نے کہا: پنجاب میں ایسا ہوتا ہے کیا؟ کسی نے کہا: میاں صاحبزادے تو آپ ہی پڑھ دیجیے نا! فرمایا: بہت اچھا ہمیں پڑھے دیتے ہیں۔ چنانچہ مصلّے پر کھڑے ہو گئے اور نماز شروع کر دی۔ ایک ہی رکعت میں چھبّیس پارے تلاوت کیے۔ رکوع کی نوبت تب آئی جب ایک جگہ اٹک گئے۔ رکوع کیا، رکعت مکمّل کی اور دوسری رکعت میں کھڑے ہوئے تو بجائے باقی پارے ختم کرنے کے، مختصر سی تلاوت کر کے دو رکعتیں پوری کر دیں۔ تلاوت کی اس روانی اور جوش کا کیا عالم رہا ہوگا' اس کا تو تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ ابا جی بتلاتے تھے کہ دادا جی فرمایا کرتے: ''جب میں پہلی رکعت میں اٹکا تو طبیعت سخت منغص ہو گئی۔ اپنے آپ ہی پر غصہ آیا کہ میں اٹکا ہی کیوں؟ بس اسی غصے میں یا افسوس میں' قرآن ختم نہیں کیا۔ جتنا پڑھ چکا تھا اسی پر بس کیا اور نماز پوری کر دی۔'' دادا جی کی عمر تب بمشکل بارہ تیرہ برس کی ہوگی۔ جب انھوں نے سلام پھیرا تو پیچھے صرف تین مقتدی تھے۔ باقی حافظ صاحبان کی اکثریت کھسک چکی تھی۔ اور جو موجود تھے وہ تھکے ہارے یا تو لیٹے ہوئے تھے' یا بیٹھے ہوئے تھے۔ تینوں مقتدیوں نے بہت اصرار کیا کہ اب قرآن کو ختم کر ہی لیجیے' مگر فرمایا ''بس ہم نے کہہ دیا' ہم اور نہیں پڑھیں گے۔'' اس واقعے نے شہر بھر میں دھوم مچا دی۔ ایک ہنگامہ اور چرچا ہو گیا کہ پنجاب سے ایک نوعمر حافظ آیا ہے جس نے ایک رکعت میں چھبّیس پارے پڑھ ڈالے ہیں۔ وہ تین مقتدی جو آخر تک ثابت قدم رہے' اُن میں ایک مولانا محمد لدھیانویؒ تھے جو ان دنوں پٹنہ میں مقیم تھے' دوسرے میر سید احمد اندرابیؒ (ابا جی کے نانا) تھے اور تیسرے ایک بزرگ اور تھے جن کا نام اب ذہن سے اتر گیا ہے' غالباً وہ اسی مسجد کے مؤذن

تھے۔ یہ مولانا محمد لدھیانویؒ، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے دادا تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے جرم میں حکومت کو مطلوب تھے اور اُن دنوں پٹنہ میں روپوش تھے۔ جبکہ میر سید احمد اندرابیؒ حکیم تھے اور طبیہ کالج لکھنؤ کے فارغ التحصیل۔ سادات کے ایک نہایت علمی اور دینی خاندان کے فرد' خود حافظ قرآن۔ اُن کی ساس (ابا جی کی پرنانی صاحبہ) حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کی نواسی تھیں۔ ''میر'' اُس زمانے میں ایک لقب تھا جو سادات کے لیے بطور تکریم بولا جاتا تھا۔ حکیم سید احمد اندرابیؒ کو اس نوجوان (یعنی ہمارے دادا جی) کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ اُسے داماد بنالیا۔ ساتھ میں گھر بھی دیا۔ دونوں خاندانوں میں تعارف پہلے سے تھا۔ دونوں ہی کے بزرگوں نے کشمیر سے ہجرت کی تھی۔ کشمیر سے نکل کر' چند دن کے لیے اندرابی بزرگ پنجاب میں ہمارے ددھیالی بزرگوں کے مہمان ہوئے تھے۔ بعد میں بہار کا رُخ کیا۔

دادا جی کے قرآن پڑھنے کا یہ واقعہ' چوک بازار پٹنہ کی مسجد خواجہ عنبر کا ہے۔ خواجہ عنبر، اکبر کے دور کے کوئی عہدہ دار تھے۔ انھوں نے یہ مسجد بنوائی اور اُنہی کے نام سے منسوب ہوئی۔ یہ مسجد ابا جی کے ننھیالی گھر (کوچہ خانہ باغ، گلی لنگر) سے متّصل تھی۔ ابا جی نے یہیں قاری سید عمر عاصمؒ سے فن قرأت سیکھا۔ ابا جی بتلاتے تھے کہ دادا جی نے قرآن' گھر میں ہی اپنی پھوپھی صاحبہ سے حفظ کیا تھا۔ ان کا نام غلام فاطمہ تھا۔ انھوں نے یتیم بھتیجے کو حفظ کرایا اور یوں کہ کبھی ایک انگلی تک نہیں لگائی۔ چنانچہ پٹنہ کی اس رات کی کیفیت دادا جی یوں بیان فرمایا کرتے تھے ''مجھے یوں لگا کہ پھوپھی صاحبہ سامنے بیٹھی ہیں۔ میں ایک ایک سطر پہ انگلی رکھے پڑھتا جارہا ہوں اور وہ ورق الٹتی جاتی ہیں۔'' دادا جی کے حفظ کی کیفیت یہی تھی۔ پھر اسی اہتمام اور توجہ سے انھوں نے ابا جی کو حفظ کرایا۔ اوقات کی پابندی و حفاظت اور کڑی نگرانی کے ساتھ۔

ابتدائی تعلیم، مجاہدہ وریاضت:

ابا جی نے ابتدائی کتابیں خصوصاً فارسی کی' ننھیال ہی میں پڑھیں۔ مسجد خواجہ عنبر پٹنہ میں ایک مُلّا تھے (نام بھول گیا) ان کی خدمت میں رہ کر۔ ان کی ایک دلچسپ بات بھی سنایا کرتے تھے۔ فرماتے کہ دوپہر میں طلباء مسجد ہی میں آرام کرتے تھے۔ ایک روز ہمارے ایک ساتھی نے استاد

صاحب کی عدم موجودگی سے ''فائدہ اٹھاتے ہوئے'' خوب ترنم سے اور لے سے یہ شعر پڑھا کہ:

گلستاں بوستاں ہرگز نہ پڑھیو
کٹاری باندھ کر ' دشمن سے لڑیو

استاد صاحب نے' جو اسی اثناء میں خاموشی سے تشریف لا چکے تھے' ڈپٹ کر فرمایا:

''حرمجادے، اپنے باوا سے لڑیو''

ابا جی نے قرآن پاک حفظ تو دادا جی سے ہی پٹنہ میں کرلیا تھا۔ جب ناگڑیاں مستقل واپس آگئے تو پھر روزانہ ختم قرآن کا معمول بنا لیا اور ساتھ روزہ بھی رکھتے ۔فرماتے ، فجر اور ظہر کے درمیانی وقت تقریباً چھے گھنٹے میں قرآن ختم کیا کرتا تھا۔ ایک دن دادا جی مسجد میں آکر پاس بیٹھ گئے اور ٹھیٹھ گجراتی پنجابی میں کہا ''جو میں آہا او وہ توں نئیں ہیں۔ جو میں ہاں او وہ تو نہیں ہوناں ۔ختم بے شک کر، تے روزہ نہ رکھ'' (جو میں تھا، وہ تم نہیں ہو۔ جو میں ہوں' وہ تم نہیں ہوگے۔ روزانہ ختم قرآن ضرور کرو مگر روزے مسلسل نہ رکھو) پھر بُکل میں سے پیالہ نکال کر کہا ''ایہہ لے ایہہ چوری کھالے'' چوری ......جو وہ اپنے ہاتھ سے بنا کر لائے تھے ۔ابا جی کو کھلائی ۔ابا جی کے مجاہدہ اور ریاضت کے ان معمولات کو کچھ عرصہ تک دادا جی دیکھتے رہے۔ پھر ایک روز فرمایا:

''دن بھر قرآن بھی پڑھتے ہو، روزے بھی رکھتے ہو' مگر میں تم سے راضی نہیں''

ابا جی فرماتے کہ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ میں نے سوچا ۔ یہاں تو باپ ہی راضی نہیں' اللہ پاک کی رضا کیسے ملے گی؟ عرض کیا: آپ ہی فرمادیں، جو حکم ہو بجالاؤں گا۔ فرمایا:

''جاہل کی عبادت معتبر نہیں۔ پہلے دین پڑھو پھر عبادت اور ریاضت بھی کرو۔''

چنانچہ ابا جی کا امرتسر کا سفر طے ہوگیا۔ اسی دوران میں شادی بھی ہوگئی۔ اور وہ مدرسہ نصرت الحق میں حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کی خدمت میں پہنچ گئے ۔ یہ مدرسہ کٹڑا کمہاراں کی مسجد میں تھا' جس کے خطیب حضرت مولاناؒ تھے ۔مولانا کی خدمت میں ان کی یہ دوسری حاضری تھی۔ قریباً دو سال پہلے بھی پٹنہ سے آکر یہاں قیام کر چکے تھے۔ تب وہ اپنی رائے سے اور اپنے ہی شوق سے یہاں چلے آئے تھے۔ دادا جی کو بعد میں پتا چلا اور وہ اس پر خفا تھے ۔ یہ خفگی تب دور

ہوئی جب وہ امرتسر تشریف لائے اور ابا جی ناگڑیاں قیام کے لیے بے چون و چرا ان کے ساتھ چل دیئے۔ سال بھر ان کی خدمت میں رہے۔ ان کی توجہ اور فیض سے جھولی بھری۔ عبادت و ریاضت کا ذوق اس عرصے میں بلند تر اور پختہ تر ہوا۔ دادا جی نازبرداری بھی کرتے اور تربیت بھی۔ ''کھلاؤ سونے کا نوالہ، دیکھو شیر کی آنکھ سے'' ہمیشہ سے یہ ان کا مزاج رہا۔ ابا جی کبھی فہمائش کے انداز میں بیٹوں کو فرمایا کرتے کہ ''شکر کرو تم عطاء اللہ کے گھر میں پیدا ہوئے، ضیاء الدین کے گھر میں پیدا ہوتے تو تمہیں پتا چل جاتا۔'' اپنے حفظِ قرآن کے دنوں کے پٹنہ کے قصے سنایا کرتے تھے۔ دادا جی دو یا تین بجے شب جگا دیتے۔ دو پارے منزل سنتے اور پھر سلا دیتے۔ پھر نمازِ فجر کے لیے اٹھاتے۔ نماز پڑھ چکتے تو سبق ہوتا۔ قرآن یوں زبان پر جاری ہوا کہ ایک شب سوتے میں کئی پارے پڑھ لیے۔ آنکھ کھلی تو دادا جی نے فرمایا: اتنے پارے تو تم نے پڑھ لیے اب اٹھو اور باقی منزل بھی پوری کرلو۔ دن میں بھی نمازوں اور آرام کے وقفے کے علاوہ بجز حفظ اور دہرائی کے اور کسی ''مصروفیت'' کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ لیکن ''دوسری مصروفیات'' کے لیے بہرحال فرصت نکال لی جاتی۔ مثلاً پتنگ اڑانے کا شوق تھا۔ ادھر دادا جی کسی نہ کسی کام سے گھر سے نکلے، اُدھر ابا جی نے ماموؤں [1] میں سے کسی کو لیا اور چھت پر پہنچے۔ لیکن دھیان برابر نیچے ہی کا رہتا کہ ابھی پکڑے گئے اور ابھی شامت آئی۔ گھر میں ایک بوڑھی ''ماما'' ''بُدھیا'' نام کی تھیں۔ وہ اکثر بروقت متنبّہ کیا کرتیں: ''اے میاں ''سفر دین''! باوا بلاویں ہیں''۔ ننھیالی نام ''شرف الدین احمد'' تھا، اسی کو وہ ''اپنی زبان'' میں پکارا کرتیں۔ دادا جی نے نو برس کی عمر تک بیٹے کو خود ہی پالا پوسا، اپنے ساتھ سلایا اور اچھے سے اچھا کھلایا۔ ابا جی بتلاتے کہ فرمایا کرتے: بیٹا! جب اللہ مرغ دے رہا ہے تو روٹی کیوں کھاؤ گے؟

---

[1] ابا جی کے تین ماموؤں کے نام مجھے یاد ہیں...... سید علی ہاشم، سید ابوالبرکات اور سید فرید الدین۔ سید علی ہاشم کے دو بیٹے تھے۔ ایک بیوی سے سید محمد عاصم اور سید محمد سالم۔ دوسری اہلیہ سے ایک بیٹی اور دو بیٹے سید نصیر احمد، سید نذیر احمد تھے۔ وہ پٹنہ ہی میں رہے اُن سے کبھی رابطہ نہ ہوا۔ سید محمد سالم کی اولاد کراچی میں ہے۔ سید محمد واسم (مرحوم)، سید محمد خاتم، سید محمد غانم، سید محمد ناعم۔ سید فرید الدین بھی کراچی آ کر فوت ہوئے تھے۔

داداجی کا توکّل علی اللہ:

اماں جی ہمارے ددھیالی گھر (ناگڑیاں) کا یہ واقعہ بڑے عجز و انکسار کے ساتھ سنایا کرتیں۔ایک دفعہ گھر میں کچھ معاشی پریشانی تھی۔شام ہوئی تو ہماری دادی صاحبہ نے داداجی سے اس صورتِ حال کا شکوہ کیا۔داداجی جلال میں آکر فرمانے لگے:

''تو اللہ کو مانتی نہیں۔ہم سب اللہ کے در کے بھکاری ہیں۔اپنی مخلوق کا رزق اُس نے اپنے ذمے لیا ہے۔''

اس کے بعد یقینِ کامل کی کیفیت میں ارشاد فرمایا:

''دیکھ! میں سورۃ یٰسین کی تلاوت کرنے لگا ہوں اور جب میں ''ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ'' پر پہنچوں گا تو دروازہ کھٹکے گا۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔داداجی نے سورۃ یٰسین بآوازِ بلند پڑھنا شروع کی اور جب اس آیت پر پہنچے تو دروازے پر دستک ہوئی۔وہیں سے دروازے کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے دادی جی سے فرمایا:''ہوں۔ہوں''۔کہ اب دروازے پر جاؤ اور اللہ کی قدرت دیکھو۔دادی جی دروازے پر گئیں تو گاؤں کا ایک آدمی آٹے کی بوری، گھی کا ڈبہ اور گڑ لے کر کھڑا تھا۔اس نے کہا کہ یہ حافظ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں۔

اللہ اکبر! اللہ تعالیٰ کی ذات پر اتنا اعتماد و توکل اور نتیجہ بھی فوراً۔

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ اور جو اللہ پر بھروسہ کرے اُسے اللہ کافی ہے

سوتیلی ماں کا احترام:

ابا جی نے اپنی حقیقی ماں تو گویا دیکھی ہی نہیں۔چار برس کے تھے جب ماں کا انتقال ہوا۔داداجی نے دوسرا نکاح اُس وقت کیا جب ابا جی کی عمر نو دس سال کے درمیان تھی۔ہماری دوسری دادی صاحبہ رشتے میں پردادا کی بھتیجی (داداجی کی چچازاد) تھیں۔داداجی پنجاب آئے، نکاح کیا اور واپس پٹنہ پہنچے۔۱۹۱۲-۱۳ء تک پٹنہ ہی میں رہے۔پھر پنجاب آگئے اور آبائی گاؤں

''ناگڑیاں''(ضلع گجرات) میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔اُدھر ابا جی امرتسر جا پہنچے۔ کچھ ہی عرصہ مدرسہ میں پڑھے، پھر دادا جی کے حکم پر واپس ناگڑیاں آنا پڑا۔سوتیلی والدہ کا ادب ویسے ہی کیا جیسا اپنی حقیقی والدہ زندہ ہوتیں تو کرتے۔ان آنکھوں نے ان کو سوتیلی ماں کے پاؤں اپنے چہرے پر مَلتے دیکھا ہے۔اُن کے بطن سے دو سوتیلے بھائی تھے۔سید عطاء المنان بخاری، جو کم سنی میں انتقال کر گئے اور دوسرے تھے حافظ سید عطاء الرحمٰن بخاری (رحمہ اللہ) وہ اپنے مزاج سے مجبور تھے، الگ تھلگ رہے۔کوئی مجبوری ہوتی تو مل لیتے۔اس کے باوجود ابا جی نے ہر مشکل میں ان کی ہر طرح مدد کی۔ایک سوتیلی بہن تھی۔عورت کی شکل میں فرشتہ۔ میں نے پھوپھی جان کو نہیں دیکھا لیکن ان کے خلوص، سادگی، نیکی اور محبّت کے قصے والدین سے سنے۔نند بھاوج کا رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے لیکن میں قسم کھا سکتی ہوں کہ اماں جی نے پوری زندگی میں ایک لفظ پھوپھی جان کے خلاف نہیں کہا۔ان کی ازدواجی زندگی کچھ اچھی نہ گزری۔ ہمیشہ ان کی مظلومیت پر دکھ کا اظہار کرتی رہیں۔ پھوپھی جان کا انتقال جواں عمری میں غالباً ۱۹۳۴ء میں ہوا اور دادا جی کا ۱۹۴۹ء میں۔ آبائی گاؤں ''ناگڑیاں'' میں مدفون ہوئے اور باپ بیٹی دونوں کی قبریں ساتھ ساتھ ہیں۔دادا جی کے انتقال کی خبر پہنچی تو ابا جی نے ایک سرد آہ بھری۔انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا:

''واہ رے عطاء اللہ! اب تمھیں عطاء اللہ کہہ کر بلانے والا کوئی نہیں
سب امیر شریعت اور شاہ جی کہنے والے رہ گئے۔''

اُن کے متعلّق فرمایا کرتے:

''وہ میرے باپ بھی تھے، استاد بھی تھے اور یار بھی تھے۔''[1]

---

[1] وصال: حضرت حافظ سید ضیاء الدین شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ
بروز یک شنبہ (اتوار)، ۲۸رشعبان ۱۳۶۸ھ مطابق ۲۶رجون ۱۹۴۹ء، مادۂ تاریخ
قال اللّٰہ البدیع: ان المتقین فی مقام امین ۱۳۶۸ھ
قال اللّٰہ الی القادر: ان المتقین فی جنت وعیون ۱۹۴۹ء
وصال محبوب رب سید ضیاء الدینؒ ۱۳۶۸ھ
(ضیاء الرحمٰن جالندھری)

اساتذہ:

ابا جی نے پٹنہ میں قیام کے دوران درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں مولانا سید الفت حسین بہاریؒ اور مولانا عبدالرحیم بہاریؒ سے پڑھیں۔اسی دور میں ترکی سے آئے ہوئے قاری سید عمر عاصمؒ سے تجوید وقرأت کی مشق کی۔پھرنا گڑیاں (ضلع گجرات) میں قیام کے دوران قریبی موضع راجووال میں قاضی عطا محمد صاحب سے پڑھتے رہے۔پھر دوبارہ امرتسر چلے آئے اور تقسیم ملک تک یہیں کے ہورہے۔تعلیم کا سلسلہ پہلے مدرسہ نصرت الحق میں مولانا مفتی غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کے یہاں اور پھر مدرسہ نعمانیہ ہال بازار (مسجد خیرالدین) میں مولانا نوراحمد پسروریؒ اور حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ (بانی جامعہ اشرفیہ لاہور) کے یہاں چلا۔مولانا عبدالصمد کشمیری امرتسریؒ سے بھی چند کتابیں پڑھیں۔مولانا نوراحمد پسروریؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمتہ اللہ علیہ کے جبکہ مفتی محمد حسنؒ، حضرت مولانا عبدالجبار غزنویؒ اور حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے۔ابا جی نے مولانا مفتی غلام مصطفیٰ قاسمیؒ سے فقہ، مولانا نوراحمد پسروریؒ سے تفسیر اور حضرت مفتی محمد حسنؒ سے مشکوٰۃ، مسلم، ترمذی اور حدیث کی دیگر کتابیں پڑھیں۔

١٩٢١ء میں تحریک خلافت کے سلسلے میں میانوالی جیل کی طویل قید میں مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ سے حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب ''حجتہ اللہ البالغہ'' کے چند اسباق لیے۔مولانا حبیب الرحمٰن مکیؒ سے ابوداؤد شریف اور بخاری شریف پڑھی۔مولانا حبیب الرحمٰن مکیؒ بھی حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔اس طرح ابا جی صرف ایک واسطے سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن اور علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہما اللہ کے شاگرد ہیں۔مولانا محمد دین غریبؔ امرتسری سے شاعری میں اصلاح لی۔

قاری سید عمر عاصم رحمہ اللہ:

ابا جی بتایا کرتے کہ قاری سید عمر عاصم رحمہ اللہ ترکی کے رہنے والے تھے۔سلطان ترکی کے نواسوں کے استاد تھے۔اُن سے کوئی اَن بن ہوئی تو ہندوستان آگئے۔مسجد خواجہ عنبر پٹنہ میں ڈیرہ لگالیا۔امامت نہیں کراتے تھے۔مسجد میں بیٹھ کر قرآن کریم پڑھاتے۔غضب کے خوش آواز،

فنِ تجوید وقرأت کے امام، بہت اعلیٰ خوش نویس (خطاط)، بہترین گھڑی ساز اور فقر و غیرت کے پیکر انسان تھے۔ مزدوری کر کے رزق کماتے، کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے۔ مسجد میں ہی بیٹھ کر گھڑیاں مرمت کرتے رہتے۔ قاریٔ قرآن ایسے کہ سبحان اللہ۔ وہ جب طلباء کو مشق کراتے تو مسجد کے باہر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا۔ حجازی لَے میں اُن کی قرأت سے لوگ تڑپ اٹھتے، قلوب منور ہو جاتے اور ایمان میں بہار آجاتی۔ ابا جی نے اُن کی قرأت سن کر چند بار نقل اتاری تو انھوں نے بلا کر پاس بٹھا لیا۔ بہت خوش ہوئے اور شفقت و مہربانی کرتے ہوئے مشق شروع کرادی۔ فنِ تجوید وقرأت ابا جی نے اُنہی سے سیکھا اور پڑھا۔ بچپن کے دوست حافظ محمد سعیدؒ بھی ہم سبق تھے۔

بھائی عطاء المحسن رحمہ اللہ بھائیوں میں سب سے زیادہ خوش آواز تھے۔ ان کے متعلّق ابا جی فرماتے یہ میرے انداز میں پڑھے گا اور واقعی بھائی مرحوم کی قرأت میں ابا جی کی بہت جھلک تھی۔ انھوں نے حضرت قاری عبدالمالک رحمہ اللہ سے فنِ تجوید پڑھا اور انہی کے حکم سے اجراء ومشق کے لیے قاری عبدالوہاب مکی رحمہ اللہ سے استفادہ کیا۔ سب سے چھوٹے بھائی پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری نے بھی قاری عبدالوہاب مکی رحمہ اللہ سے تجوید وقرأت میں کسبِ فیض کیا۔ بھائی عطاء المحسن رحمہ اللہ نے ایک دفعہ بتلایا کہ قاری عبدالوہاب مکّی رحمہ اللہ نے مشق کے دوران مجھے فرمایا کہ ''اپنے ابا کی طرح آواز پھینکو، آواز بنانا کوئی کمال نہیں۔ پھر فرمایا کہ حجاز کے مختلف لہجوں میں ایک ''حِراب'' ہے اور تمہارے ابا ''حِراب'' میں پڑھتے تھے۔''

خطابیہ، ندائیہ اور حُزنیہ کیفیات سے مرصع لحن میں جب وہ تلاوت کرتے تو لوگ اس کی تاثیر میں ڈوب جاتے اور وجد وجذب میں جھومنے لگتے۔ اُن پر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم تھا۔ وہ اپنے استاد قاری سید عمر عاصم رحمہ اللہ کے فیض کامل کی لازوال مثال تھے۔ قاری سید عمر عاصمؒ بعد میں کویت چلے گئے۔ پٹنہ سے جاتے ہوئے خطباتِ جمعہ کا ایک نادر مجموعہ ابا جی کو ہدیۃً عنایت فرمایا۔ اُسی میں سے ایک خطبہ ابا جی جمعہ میں پڑھا کرتے۔ اس خطبہ میں آل واصحابِ رسول علیہم الرضوان کے بہت مناقب تھے۔ ہمارے آبائی گاؤں ''ناگڑیاں'' والے گھر میں ایک عرصہ تک یہ

مجموعۂ خطبات موجود رہا۔ پھرابا جی امرتسر آگئے تو عدم حفاظت سے کہیں ضائع ہوگیا ۔

مولوی عبداللہ ڈارا مرتسری ایک دفعہ امرتسر ہمارے گھر تشریف لائے اورابا جی کو بتایا کہ میں کویت گیا تھااور قاری سیدعمر عاصم صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے پوچھا کہ ایک نوجوان سیدعطاءاللہ بخاری میرے پاس مشق کیا کرتا تھا، کہاں ہےاورکس حال میں ہے؟ میں نے اُن کو بتایا کہ آپ جس نوجوان سیدعطاءاللہ شاہ بخاری کوقرأت کی مشق کراتے تھےاس کا شماراب ہندوستان میں تحریک آزادی کےصفِ اوّل کے رہنماؤں میں ہوتا ہے۔سن کر بہت خوش ہوئے اوردعائیں دیں۔

حضرت مولانا نوراحمدؒ کا اندازِ تربیت:

ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا نوراحمد پسروریؒ سے سبق پڑھ کر اقامت گاہ کو جارہا تھا۔راستے میں ریڑھی پر سنگترے بک رہے تھے۔ابا جی کو یہ مرغوب بھی بہت تھے۔ چنانچہ سنگترے خریدے اورفرمانے لگے کہ: چھیل کرایک پھانک منہ میں ڈالی دوسری ہاتھ میں تھی کہ پیچھے سے کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھااور کہا:''حافظ جی !بازار میں کھڑے ہوکر کھانے والے کی گواہی شریعت میں معتبر نہیں۔'' وہ استاذ حضرت مولانا نوراحمدؒ تھے۔ابا جی کہنے لگے وہ پھانک گلے میں پھنستی محسوس ہوئی۔پھر بازار میں کھڑے ہوکر کبھی نہیں کھایا۔یہ واقعہ خوب یاد ہے کہ ابا جی نے امرتسر کے ایک جلسہ میں بھی سنایا تھا۔۱۹۴۶ء میں چچاجان شیخ حسام الدینؒ امرتسر سے الیکشن میں کھڑے تھےاور ہرالیکشن میں ان کے مدمقابل شیخ صادق حسن ہی ہوا کرتے تھے۔چوک فرید میں جلسہ تھا۔ابا جی نے دورانِ تقریر اسلامی اعمال واحکام کےضمن میں یہی واقعہ بیان کیا تھا۔ایک واقعہ اوریاد آیا۔ایک بار توکل کے سلسلہ میں گھر میں بات کررہے تھےتو مولانا داؤدغزنویؒ سے سنا ہوا قصہ سنایا کہ اُن کے داداصاحب کے ہاں ایک دفعہ بڑی عسرت کاوقت تھا۔ان کے والد ماجد نے کچھ شکایت کی ۔کچھ دیر بعد ہی کوئی آدمی کھانے کےخوان اور دیگراشیاء لے کرآگیا۔تو انھوں نے فرمایا:''عبدالجبار تماشہ بخورہنوزصبح نشدی''۔

حضرت مفتی محمد حسن رحمتہ اللہ علیہ:

انگریز کا ظلم وستم اپنے عروج پر تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جنرل ڈائر نے جلیاں والا باغ امرتسر میں آزادی کا مطالبہ کرنے والے ہندوستانیوں پر گولیاں برسا کر درجنوں افراد مار ڈالے۔ مرنے والوں میں مسلمان، ہندو اور سکھ سبھی شامل تھے۔ سانحہ اتنا بڑا تھا کہ پورا ہندوستان سوگوار ہوگیا۔ ابا جی کی طبیعت پر بھی بہت اثر ہوا۔ یہی حادثہ اُن کی سیاسی زندگی کا سرِ آغاز تھا۔ ابا جی اُن دنوں امرتسر میں حضرت مفتی محمد حسن رحمہ اللہ سے دورۂ حدیث کی کتب جامع ترمذی اور مسلم شریف کے علاوہ منطق کی کتاب ''حمد اللہ'' (شرح تصدیقات سُلّم از مولانا حمد اللہ) کے اسباق لیا کرتے۔ فلسفہ ومنطق سے طبیعت کو مناسبت نہ تھی۔ ایک دن حضرت مفتی صاحب سے پنجابی میں مخاطب ہوکر عرض کیا:

> ''مولانا! تُسی حَمدُ اللہ دے دُوالے ہووو تے میں بیت اللہ دے دُوالے ہوناں، میری تہاڈی بس!''
>
> (مولانا! آپ حَمدُ اللہ لے کر بیٹھیں اور میں بیت اللہ کے گرد ہوتا ہوں۔ میری، آپ کی بس) یعنی آپ حمد اللہ پڑھائیں اور میں بیت اللہ اور مسلمانوں کے دشمن انگریز کا مقابلہ کرتا ہوں۔

یہ کہہ کر اٹھے اور سیاسی واجتماعی جدوجہد میں شامل ہوگئے۔ پھر تحریک خلافت شروع ہوگئی تو اس میں مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رفاقت میں مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ تین سال کے لیے میانوالی جیل میں قید کردیئے گئے۔ اجتماعی زندگی اور قید وبند کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ رہا ہوئے تو پھر تعلیم شروع کردی۔ ابوداؤد اور بخاری کے اسباق مولانا حبیب الرحمٰن مکی سے لیے۔

بھائی عطاء المحسن مرحوم نے اپنی یادداشتوں میں ابا جی کی ایک مجلس کی گفتگو نقل کی ہے۔ فرمایا: ''حضرت مفتی محمد حسن رحمہ اللہ سے جامع ترمذی شریف کا سبق پڑھ رہا تھا کہ مولانا

ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' آیا۔ جس میں انگریز (نصاریٰ) مردود کے ترکوں پر مظالم کا حال بالتفصیل تھا۔ سبق سے فارغ ہو کر اس کا مطالعہ کیا تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے حضرت الاستاذ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ ''حمداللہ'' کے پیچھے لگیں اور میں بیت اللہ کے گرد ہوتا ہوں۔ پاس ہی حضرت الاستاذ مولانا مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی تشریف فرما تھے۔ انھوں نے میری طرف دیکھا اور منہ میں انگلی رکھ کر فرمانے لگے: ''عطاء اللہ! پڑھ لو۔ ابھی یہ نہ کرو لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا۔

چھوٹے بھائی پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری نے بتایا کہ ایک دفعہ چند علماء ابا جی سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ اساتذہ کی مہربانیوں اور توجہات کا ذکر ہوا تو ابا جی نے اپنا ایک واقعہ اُن کو اس طرح سنایا:

> ''میں دن کو مدرسہ میں پڑھتا اور رات کو امرتسر کے مختلف محلوں میں منعقد ہونے والے دینی و تبلیغی اور سیاسی جلسوں میں تقریریں کرتا۔ ایک دن مسلم شریف کا سبق تھا۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب پڑھا رہے تھے۔ عبارت پڑھنے کی میری باری تھی۔ مفتی صاحب نے فرمایا، عطاء اللہ عبارت پڑھو۔ عبارت کہاں سے پڑھتا۔ رات تو جلسے میں گزاری تھی۔ ساتھ بیٹھے ہوئے ہم سبق ساتھی نے مدد کی اور کہا کہ یہاں سے پڑھو۔ میں نے عبارت پڑھ دی۔ مفتی صاحب نے فرمایا: ترجمہ کرو، میں نے ترجمہ کر دیا۔ پھر فرمایا: مطلب بیان کرو، میں نے عرض کیا: مطلب نہیں آتا۔ مفتی صاحب نے اپنی عینک ذرا نیچے کر کے اُس کے اوپر سے مجھے دیکھتے ہوئے جلال آمیز لہجے میں فرمایا: کیا کہا، نہیں آتا؟ میں نے فوراً عرض کیا: آ گیا، اور پھر مطلب بھی بیان کر دیا۔ یہ واقعہ سنا کر ابا جی فرمانے لگے: بھائی ہم نے تو دین استاد کی آنکھوں سے پڑھا ہے۔''

سندِ تعلیم:

بعض حضرات سوال کرتے ہیں کہ شاہ جی کس مدرسہ کے پڑھے ہوئے تھے اور انھوں نے کون سے مدرسہ سے سند حاصل کی؟ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ابا جی، روایتی طور پر کسی

مدرسہ کے فارغ التحصیل نہ تھے مگر انھوں نے بہرحال علومِ دینیہ کی تحصیل مکمّل کی۔ دارالعلوم (دیوبند) کے قیام سے پہلے ہمارے اکثر علماء واکابر کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ جید عالم دین ہونے کے باوجود اُن کے پاس کسی مدرسہ کی سند نہیں تھی۔ تو کیا اُن کو مروّجہ معنوں میں ''غیر مستند'' کہنے کی جسارت کی جاسکتی ہے؟ آج علم کی بے قدری کا یہ عالم ہے کہ ''فارغ التحصیل اور مستند'' ہونے کے باوجود ایک بڑی تعداد دنیا کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ جو علم اور عمل دونوں سے محروم ہے۔ (اِلّا ماشاءاللہ) ہمارے اسلاف علماء کا مقصود حصولِ علم اور اپنے اساتذہ کا اعتماد تھا، نہ کہ سند۔ تب استاد کی نسبت ہی سند ہوا کرتی تھی۔ ابا جی بھی انہی علماء ربانیّین کی باقیات میں سے تھے۔ انھوں نے وقت کے جیّد علماء سے مدارس میں ہی پڑھا۔ اُن کا کمال یہ تھا کہ دینی وسیاسی، قومی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو بھی نبھایا اور جہاں جیسے وقت ملا ساتھ ساتھ تعلیم کو بھی مکمّل کیا۔ جتنے دن باہر رہے اساتذہ کے پاس جاکر پڑھتے رہے، جب قید ہوگئے تو جیل میں کسی رفیق قیدی عالم سے استفادہ کرتے رہے۔ انھوں نے وقت اور علم دونوں کی قدر کی اور علم وعمل میں یکسانیت پیدا کرکے اساتذۂ کرام کی دعاؤں، توجہات اور اعتماد کی سند حاصل کی۔ انھوں نے تو ۱۹۲۱ء کی تحریکِ خلافت میں میانوالی جیل میں مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ سے ''حجتہ اللہ البالغہ'' کے چند اسباق پڑھے۔ اسی دوران مولانا غزنویؒ روہتک جیل بھیج دیے گئے۔ اسی قید کے دوران معروف سیاسی کارکن بیرسٹر آصف علی سے انگریزی پڑھنا شروع کردی اور آصف علی اُن سے ترجمۂ قرآن پڑھتے۔ اسی طرح ۱۹۳۲ء کی تحریکِ کشمیر میں سنٹرل جیل ملتان میں مشہور کمیونسٹ رہنما شیر جنگ سے انگریزی پڑھتے اور خود شیر جنگ کو ترجمۂ قرآن پڑھاتے۔ سبق کے دوران ایک دن شیر جنگ نے ابا جی سے کہا کہ میں حیران ہوں جس قوم کے پاس قرآن جیسی کتاب موجود ہے وہ غلام کیسے ہے؟ پورے قرآن میں انسان کی غلامی کا کوئی تصور نہیں ہے۔

حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب نوراللہ مرقدہ' سے تعلّق:

ابا جی' امرتسر کے زمانۂ طالب علمی ہی میں حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب قدس سرہ' سے (۱۹۱۵ء) گولڑہ جاکر بیعت ہوئے۔ پیر صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت کے بارے میں

ابا جی فرماتے تھے کہ میں گولڑہ کی خانقاہ میں حاضر ہوا اور کئی دن تک وہاں ٹھہرا۔ حضرت پیر صاحب سے بیعت کے لیے جب بھی درخواست کی آپ ٹال جاتے ۔ایک دن میں نے دیکھا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر خانقاہ سے باہر تشریف لے جا رہے ہیں۔ میں نے لپک کر رکاب تھام لی۔

فرمانے لگے: کیا بات ہے؟

میں نے عرض کیا: توبہ کروا دیجیے۔ کئی دن سے درخواست کر رہا ہوں ۔

اس پر حضرت نے یہ شعر پڑھا:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

پس بہر دستے نہ باید داد دست

میں نے کہا: اسی لیے تو آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں۔ خدانخواستہ کسی ''ابلیس'' کے چنگل میں پھنس گیا تو کل قیامت کو' آپ بھی جواب دہ ہوں گے ۔ چنانچہ حضرت نے اسی وقت بیعت فرما لیا۔ پھر پڑھنے کے لیے یومیہ وظیفہ کے طور پر کلمۂ تمجید اور سورۃ اخلاص کا ورد تلقین فرمایا۔ میں نے عرض کیا: اوروں کو تو آپ قصیدۂ غوثیہ بتلایا کرتے ہیں ۔کیا میں بھی پڑھا کروں؟ فرمانے لگے۔ میں نے تمہیں وہ چیز بتلائی ہے جسے پڑھ کر غوث' غوث بنے تھے۔

تعلیم تکمیل کے مراحل میں تھی کہ جلیاں والا باغ کے خونیں حادثے ،تحریک خلافت اور ترکِ موالات (نان کوآپریشن) کی تحریکوں نے ابا جی کو آزادی کی جدوجہد میں کھینچ لیا۔ فرماتے تھے کہ میں نے حضرت پیر صاحبؒ سے درخواست کی کہ ترک موالات کے فتوے پر دستخط فرما دیں اور تحریک خلافت کی سرپرستی بھی فرمائیں ۔مگر آپ غیر سیاسی مزاج کی بنا پر عذر فرماتے تھے۔ پھر میں نے خواجہ ضیاء الدین سیالوی صاحب علیہ الرحمۃ سے درخواست کی ۔سیال شریف، حضرت پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا پیر خانہ تھا۔ خواجہ ضیاء الدین علیہ الرحمۃ پوری توجہ اور قوت سے تحریک میں شامل تھے۔ چنانچہ انھوں نے بنفس نفیس حضرت پیر صاحبؒ کی خدمت میں یہی درخواست کی۔ حضرت نے فرمایا:

''میں فقیر ہوں ، میں دعا کروں گا''

اس پر خواجہ صاحب نے عرض کیا:

''حضرت! اگر صرف دعاؤں سے کام چلتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم احد کی لڑائی میں اپنے دندان مبارک شہید نہ کرواتے۔''

ظاہر ہے کہ حضرت سے یہ عرض معروض خواجہ ضیاءالدین صاحبؒ ہی کر سکتے تھے۔

اسی دوران میں جب (مارچ ۱۹۲۱ء میں) ابا جی گرفتار ہو گئے' اور تین سال قید با مشقّت کی سزا ہوئی تو حضرت پیر صاحب رحمتہ اللہ علیہ برابر ان کے لیے دعائیں فرمایا کرتے تھے۔ مریدوں سے فرماتے: ''اس شودے واسطے وی دعا منگو۔'' (اس بے چارے کے لیے بھی دعا کرو)۔ تحریک خلافت کے بعد ابا جی کی زندگی مسلسل مصروفیت کی تھی۔ تقریریں اور اسفار، گرفتاری اور رہائی، پھر سفر، پھر تقریریں۔ چنانچہ حضرت پیر صاحب کی خدمت میں حاضری بھی لمبے وقفوں سے ہوا کرتی تھی۔ آخری حاضری' حضرت کی آخری علالت کے ایام میں ہوئی۔ اسی موقع پر ایک صاحب نے طویل غیر حاضری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طنزاً کہا (پنجابی میں) ''ٹھٹھے ہوئے آ گئے''

تو ابا جی نے جواباً اُن سے کہا: ''ٹھٹھے ہوئے نئیں تر ٹھے ہوئے''

اشارہ اپنی جانگسل مصروفیات اور معترضین کی عافیت کوشیوں کی طرف تھا۔

آغا شورش مرحوم نے ابا جی کا ایک جملہ حضرت پیر صاحب علیہ الرحمتہ کی مشہور پنجابی نعت ''اج سک متراں دی ودھیری اے'' کے بارے میں نقل کیا تھا' جس کا مقطع ہے کہ:

سبحان اللہ ما اجملک ، ما احسنک ما اکملک

کتھے مہر علی ، کتھے تیری ثنا، گستاخ اکھیں کتھے جا اڑیاں

فرمایا کہ: یہاں ''گستاخ اکھیوں'' پر کائنات بھر کی حیا کا پردہ پڑا ہوا ہے۔

خاندان میں بیعت و استرشاد کی روایت:

خاندان کے چند ہی بزرگوں کے متعلّق مجھے معلوم ہے کہ ان کی بیعت کس سلسلہ میں تھی۔ جیسا کہ بھائی جان نے ''سواطع الالہام'' میں لکھا ہے' ہمارے لکڑ دادا سید محمد شاہ صاحبؒ بیعت تھے شاہ غلام علی صاحب دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے اور پر دادا سید نور الدین صاحبؒ، خواجہ شمس الدین سیالوی رحمتہ اللہ علیہ کے۔ دادا جی حافظ سید ضیاء الدینؒ پٹنہ میں بہار کے کوئی بزرگ تھے

مولانا عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ اُن سے بیعت ہوئے۔ابا جی پہلے حضرت مہرعلی شاہ صاحب گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ سے اوران کی وفات [1] کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمہ اللہ کی ترغیب پر حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ سے (لاہور میں مولانا عبداللہ فاروقیؒ کے مکان پر) بیعت ہوئے اور ساتھ ہی خلافت سے نوازے گئے۔ ویسے میری نانی صاحبہ ان کے والدِ ماجد سید غلام حسن شاہ صاحبؒ اور چچا سید محمد عمر شاہ صاحبؒ بھی حضرت مہرعلی شاہ صاحبؒ ہی کی بیعت تھے۔ یہ حضرات چک کمال ضلع گجرات میں رہائش پزیر تھے۔اماں جی ۳۴-۱۹۳۳ء میں شدید بیمار رہیں اور معالجین خصوصاً حکیم ظہیرالدین صاحب امرتسری کے مشورہ پر ہر سال موسم گرما میں ابا جی انہیں کوہِ مسوری پر لے جاتے۔ یہ معمول چار سال تک رہا یعنی ۱۹۳۷ء تک۔

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ:

۱۹۳۷ء ہی میں ابا جیؒ ، حضرت رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے اور کچھ دن بعد اماں جی کو لے کر مسوری چلے آئے۔ وہاں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ ملنے کے لیے آئے تو ابا جی نے اماں جی کی خواہشِ بیعت کا بھی ذکر کیا۔ وہ رائے پور جارہے تھے۔انھوں نے کہا میں ہمشیر کی ''زبانی بیعت'' کرادوں گا۔ چنانچہ انھوں نے رائے پور پہنچ کر حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں درخواست پیش کی اور اماں جی کو ''غائبانہ'' حضرتؒ سے بیعت کرادیا۔ بعدازاں حضرت رحمتہ اللہ علیہ مسوری بھی تشریف لائے۔اماں جی کچھ بہتر ہونے پر ابا جی، ماموں جی، ممانی صاحبہ کے ساتھ کار پر رائے پور بھی حاضر ہوئیں جو مسوری سے قریب تھا اور چند گھنٹے قیام کے بعد واپس مسوری آگئیں۔ بعد میں ماموں جان سید عبدالحمید شاہ صاحبؒ، ممانی جان، ہم پانچوں بہن بھائی حضرتؒ ہی سے بیعت ہوئے۔ میری شادی ہوئی تو نکاح حضرتؒ نے ہی پڑھایا۔شادی کے بعد ابوالکفیل بھی حضرتؒ سے ہی بیعت ہوئے (نکاح ۵۱ء میں اور رخصتی ۵۲ء میں ہوئی)۔ ہماری خالہ صاحبہ دور دراز گاؤں ناگڑیاں (ضلع گجرات) میں رہتی تھیں۔ جب حضرت رحمتہ اللہ علیہ پنجاب تشریف لایا کرتے تو انہیں آنے کا موقع نہ ملتا۔ابا جی کے انتقال پر خالہ صاحبہ ملتان تشریف

[1] ۲۹ رصفر ۱۳۵۶ھ/۱۱رمئی ۱۹۳۷ء

لائیں اور بہت دن اماں جی کے پاس رہیں۔ وہ اس بات پر بڑی حسرت ظاہر فرماتی تھیں کہ: میں حضرت رائے پوری سے بیعت نہ ہوسکی (حضرت تب بقیدِ حیات تھے [1] اور مستقل قیام ''خانقاہ رائے پور'' ...... ہندوستان' ہی میں تھا۔ سال کا ایک دورہ البتہ ضرور پاکستان کا فرماتے)۔ اماں جی نے خالہ صاحبہ سے کہا کہ اب تو ایک ہی بزرگ ادھر باقی ہیں (یعنی پاکستان میں) تم حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے بیعت ہو جاؤ۔ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ ملتان سے واپسی پر لاہور اتریں اور حضرتؒ کی خدمت میں جا کر بیعت ہو گئیں۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ وہ گاؤں پہنچیں اور چند ہی روز بعد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔ [2]

ذکر اللہ کی برکت:

ابا جی بتاتے تھے کہ حضرت رائے پوری سے بیعت ہو کر لاہور سے امرتسر پہنچا' اور اسی روز سے حضرت کے تعلیم فرمودہ نصاب کے مطابق ذکر کا معمول شروع کر دیا۔ فرماتے تھے ایک ہی دن میں یہ حالت ہو گئی کہ اگر چارپائی پر لیٹتا ہوں تو اس میں سے ''اللہ'' کی آواز آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کروٹ بدلتا ہوں تو جب' تکیہ ہلاتا ہوں تو جب' حتیٰ کہ در و دیوار تک سے ذکر کی کیفیت کا مشاہدہ ہونے لگا۔ ایسے میں نیند کہاں آتی؟ رات کاٹی خدا خدا کر کے۔ یعنی...... ''اللہ اللہ'' کر کے۔ اگلے روز صبح' پہلا کام یہ کیا کہ امرتسر سے بس پکڑی اور لاہور پہنچا۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر گزشتہ شب کی روداد سنائی اور دست بستہ عرض کیا کہ حضرت! میں مسافر آدمی ہوں۔ رات رات بھر تقریر، پھر سفر، پھر تقریر۔ ایسے میں یہ واردات اور مشاہدات ہجوم کر آئیں تو آرام کس وقت کروں؟ حضرت بے ساختہ کھلکھلا دیئے۔ فرمایا...... بہت اچھا۔ آپ یوں کیجیے کہ جب بھی بیان شروع کریں' ذکر کی نیت کر لیا کریں۔

---

[1] تاریخِ وفات: ۱۴ر ربیع الاوّل ۱۳۸۲ھ/ ۱۶ر اگست ۱۹۶۲ء

[2] تاریخِ وفات: ۱۷ر رمضان ۱۳۸۱ھ/ ۲۳ر فروری ۱۹۶۲ء

حضرت رائے پوری کی تواضع اور شفقت:

بھائی جان نے ایک بار اباجی سے پوچھا کہ آپ نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی بیعت کیوں نہ کی؟ فرمانے لگے ''بیٹا! حضرت مدنیؒ میں باپ کا جلال تھا اور حضرت رائے پوریؒ میں ماں کی شفقت۔'' اور حضرت کی اس شفقت کا اظہار، اہل تعلّق سے جن جن صورتوں میں ہوا کرتا تھا۔ وہ بہت کچھ تذکروں میں آ ہی چکا ہے۔ خود ہمارے گھر کے لیے جتنی خیر خواہی، جتنی توجہ اور دعائیں حضرت فرماتے تھے، یہ محض اللہ پاک کا کرم تھا۔ بھائی جان کو تو آخر آخر میں اجازتِ بیعت بھی عطا ہوئی۔ اس سے پہلے حضرت نے حکماً رمضان کا مصلّٰی بھی اُن سے سنا۔ یہ رمضان حضرت نے گھوڑا گلی میں گزارا تھا۔ سنہ ۵۴ء تھا۔ حضرت نے بھائی جان کو ختم کے موقع پر اچھی خاصی رقم انعام میں عطا فرمائی۔ بھائی جان کے مؤدبانہ تأمل پر فرمایا: تم کو اس کے لینے پر بھی ثواب ملے گا۔ بھائی عطاء المحسنؒ سے بہ کثرت قرآن کریم سماعت فرمایا کرتے تھے اور کئی کئی رکوع مسلسل۔ حالانکہ یہ معمول نہ تھا اور نہ ہی کسی اور سے کبھی یوں ارشاد فرمایا۔ مولانا محمد علی جالندھری مرحوم کی روایت سے مولانا علی میاںؒ نے حضرت کی سوانح میں ایک جملہ نقل کیا ہے کہ ''یہ شاہ صاحب کے لڑکے ہیں، میں تو ان کا نوکر ہوں۔'' یہ اس تواضع کی انتہا تھی جس کے بارے میں علی میاںؒ نے لکھا ہے کہ ''حب جاہ کا تو وہاں سر کٹا ہوا تھا۔''

خلیفۂ برحق:

قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ قبل جب بھائی جان خیر المدارس جالندھر میں زیرِ تعلیم تھے تو اباجی قرب وجوار میں آتے جاتے جالندھر اتر کر مل لیتے۔ ایک دفعہ اباجی جالندھر پہنچے تو حسن اتفاق سے حضرتِ اقدس رائے پوری بھی تشریف لے آئے۔ زائرین کا ہجوم تھا۔ اچانک اباجی نے دیکھا تو دیہاتی خواتین کا ایک خاصا بڑا ''قافلہ'' زیارت کے لیے آ رہا تھا۔ اباجی جانتے تھے حضرت ایسے ہجوم سے پریشان ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان سے کہا ''مائیو بہنو ادھر آ جاؤ۔'' پھر حضرت سے مسکرا کر کہا: حضرت میں آپ کا خلیفۂ برحق ہوں ناں؟ حضرت نے ساری صورتحال سے محظوظ ہوتے ہوئے فرمایا: ''جی ہاں! حضرت'' پھر حضرت سے ان بیبیوں نے جو دم درود کرانا تھا، وہ اباجی نے کر دیا۔ اور حضرت کو پریشانی سے بچایا۔

مہمانوں کی خدمت:

اماں جی بعض اوقات ابا جی سے مزاحاً گلہ کرتیں کہ آپ کے مہمانوں کا صبح شام تانتا بندھا رہتا ہے۔ جس سے گھر کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ میرا سارا وقت اِن کی خدمت میں نکل جاتا ہے۔ نہ ڈھنگ سے بیٹھنا نصیب ہوتا ہے۔ نہ ذکراذکار کے لیے یکسوئی اور فراغت ملتی ہے۔ ۳۷ء میں حضرت رائے پوریؒ سے بیعت ہوچکیں تو ابا جیؒ سے کہنے لگیں کبھی ''حضرت'' تشریف لائے تو میں یہ بات دریافت کروں گی کہ کیا گھر والیوں کے لیے اللہ اللہ کرنے کا حکم نہیں ہے؟ ابا جی ایسے موقعوں پر عموماً بابا بلھّے شاہ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ

ڈُکّڑ وجے ، درپڑّ پکے ، بلدا رہے چُلھا
آندا جاندا کھاوے پیوے ، راضی رہوے بُلھا

اماں جی ہنس کر فرماتیں: ''بلھّے'' کو چوکی چولہا سنبھالنا نہیں پڑتا ناں اس لیے! اب ہوا یہ کہ اماں جی کی بیعت کے کچھ ہی دنوں بعد حضرت' ازخود رائے پور سے مسوری تشریف لائے۔ مزاج پرسی وعیادت کے لیے۔ گھر کے اندر بھی تشریف لائے۔ اماں جی اور ممانی صاحبہ پردے میں بیٹھ گئیں۔ ابا جیؒ اچانک اماں جی سے فرمانے لگے ''حضرت سے جو کچھ پوچھنے کو کہتی تھیں' اب پوچھ لو۔ اماں جی بے چاری کیا پوچھتیں۔ کہتی تھیں ایک طرف حضرت، دوسری طرف تمہارے ابا جی، میری تو زبان گنگ ہوگئی۔ وہ تو چپکی بیٹھی رہیں۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ البتہ چند منٹ سر جھکائے توقف میں رہے پھر اماں جی سے مخاطب ہوکر ازخود فرمایا...... ''یہ بھی عبادت ہے۔'' (یعنی آپ گھر میں جو بھی خدمت کے کام کیا کرتی ہیں، سب عبادت میں شامل ہیں)۔

عقیدت مندوں کے ذاتی معاملات:

بعض بھولی بسری باتیں اچانک یاد آجاتی ہیں۔ حضرتِ اقدس رائے پوریؒ کے ذکر سے یاد آیا کہ بہت سے متعلّقین اپنے بچوں بچیوں کے لیے بھی حضرت سے دعا کی درخواست کیا کرتے تھے۔ اور حضرت کو ایک باپ اور ایک بزرگ کی طرح' پھر اس کی فکر بھی رہتی تھی۔ کسی سے کچھ کہنا ہو' کسی کو

متوجہ کرنا ہوُیا اپنے تعلّق والے دوخاندانوں کو باہم جوڑنا ہو۔ان امور کے لیے جب بھی کسی نے عرض کیا' حضرت ''وساطت'' کے لیے تیار ہوجاتے تھے۔لیکن اس ضمن میں کہیں گلے شکوے یا ان بن کی صورت پیدا ہوجاتی تو بعض نا دان خواتین اور حضرات' حضرت ہی کے یہاں ان قضیوں کی سماعت کے لیے پہنچ جاتے۔یہ بات عقیدت مندوں کے لیے یقیناً نا گوار ہوتی تھی۔ابا جی بتلاتے تھے کہ ایک بار میں نے ایسے ہی ایک موقع پر بہت منت کے سے انداز میں عرض کیا کہ حضرت! آپ کی جورو نہ جاتا' اللہ میاں سے نا تا ...... یہ معاملات نمٹانا آپ کے شایانِ شان نہیں۔آپ کسی کے کہے سے ان کاموں میں شریک ہوتے ہیں اور پھر مفت کی کوفت اور بدمزگی ہوتی ہے۔ابا جی بتاتے تھے کہ حضرت چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔میں نے حضرت کے پاؤں ہاتھوں میں تھام کر عرض کیا: حضرت! میں ایسے معاملات میں بالکل نہیں پڑتا۔فرمانے لگے: جی ہاں حضرت! آپ بہت اچھا کرتے ہیں۔میں نے عرض کیا حضرت! یہی گزارش آپ سے ہے۔اس پر حضرت مسکرائے اور فرمایا: جی ہاں حضرت! آپ درست فرماتے ہیں، لیکن میں تو اب بھی ایک جگہ ''اسی کام کے لیے جارہا ہوں۔''

حضرت رائے پوریؒ کی امرتسر اچانک آمد:

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت ایک صبح اچانک مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے ہمراہ امرتسر ہمارے ہاں تشریف لائے۔ابا جی حسبِ معمول تبلیغی سفر پر تھے۔گھر میں اماں جی، ماموں جی اور تیسری میں تھی۔ماموں جی نے عرض کیا: حضرت! اطلاع کی ہوتی۔فرمایا: ''لاہور آیا ہوا تھا۔نمازِ فجر سے فارغ ہوا تو شاہ صاحب بہت یاد آئے۔میں نے مولانا حبیب الرحمٰن سے کہا: امرتسر چلو۔شاہ صاحب سے مل کر آتے ہیں۔'' یہ اُن کی ابا جی پر بے پناہ شفقت تھی۔کچھ دیر ٹھہرے۔چائے نوش کی اور ہمیں دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

حضرت رائے پوریؒ سے ایک یادگار ملاقات:

چھوٹے بھائی پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری نے بھائی جان کی روایت سے یہ واقعہ سنایا کہ: ایک دفعہ مرشدی حضرت رائے پوریؒ امرتسر ابا جی سے ملنے تشریف لائے۔واپس روانگی

کے وقت ابا جی انھیں تانگے پر سوار کرانے ساتھ آئے۔ عین اس وقت اچانک بادل گرجے اور رم جھم شروع ہوگئی۔ وقت رخصت، بادو باراں نے عجیب سماں باندھ دیا۔ ابا جی نے حضرت کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا:

ابرو باران و من و یار ستادہ بہ وداع
من جدا گریہ کناں، ابر جدا یار جدا

ابا جی نے یہ شعر کچھ اس انداز میں پڑھا کہ اُن کی اور حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

امرتسر کی یادیں

حافظ شمس الحق صاحب رحمہ اللہ:

بھائی جانؒ نے ناظرہ قرآن مجید تو اماں جی سے ہی پڑھا تھا۔ جب ہم لوگ امرتسر میں مہاں سنگھ کے کٹڑے سے گلوالی دروازے والے مکان میں منتقل ہوئے (جو اپنا خرید کردہ پہلا مکان تھا) تو بھائی جان کو مولانا بہاء الحق قاسمیؒ کے مدرسہ، محلّہ کٹڑہ کمہاراں میں داخل کرا دیا۔ وہاں بارہ بنکی صوبہ بہار کے رہنے والے جناب حافظ شمس الحق صاحبؒ استاد تھے۔ ان کی مدرسہ کے منتظمین سے کچھ ناچاقی ہوئی تو انھوں نے مدرسہ چھوڑ کر واپس گھر جانے کا ارادہ کیا۔ مگر ابا جی نے فرمایا کہ آپ کو مدرسہ سے ۳۰ روپے تنخواہ ملتی ہے، وہ آپ مجھ سے لیں۔ کھانا ہمارے یہاں سے ہی کھائیں اور عطاء المنعم کو پڑھائیں۔ چنانچہ وہ بیٹھک میں بیٹھ کر پڑھاتے۔ سردیوں میں ساتھ والی مسجد ''اَحَدوَازَہ'' میں دھوپ میں بیٹھ کر پڑھاتے۔ بھائی جان نے انہی سے حفظ مکمّل کیا۔ تکمیل سے ایک رمضان پہلے سحری کے وقت بیٹھک میں، نوافل میں پڑھا۔ حافظ صاحب، ابا جی، ماموں جی اور ایک بزرگ اور، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن مکی رحمتہ اللہ علیہ [1] (جو تشریف لاتے تو

[1] مولانا حبیب الرحمٰن مکی رحمہ اللہ، دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ ان کے والد مکی اور والدہ بنگالی تھیں۔ ابا جی نے بخاری شریف اِن سے پڑھی۔

مہینہ مہینہ قیام فرماتے تھے)سامع ہوتے ۔جب حفظ مکمّل ہوا تو ابا جی' سرسکندرحیات (''وزیراعظم'' پنجاب) کے بنائے ہوئے کیس میں قید تھے۔پہلے رمضان میں حافظ شمس الحق صاحبؒ نے خود سنا۔اماں جی کی علالت کے سلسلے میں' ہم لوگ مسوری گئے تو ابا جی' حافظ صاحب کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ مالک مکان کے بچے اور ہم دونوں بہن بھائی وہاں اُن سے پڑھتے رہے۔ بعد میں وہ وطن واپس تشریف لے گئے۔قیامِ پاکستان تک بھائی جان کی اُن سے خط کتابت تھی۔اب یاد نہیں کہ کب ان کی وفات کی اطلاع آئی تھی۔

حضرت قاری کریم بخش رحمہ اللہ:

بھائی جان نے حفظ کے بعد حضرت قاری کریم بخش رام پوریؒ سے دہرائی بھی کی اور لحون کی مشق بھی۔مصری ،حجازی ،مایا،تب کے سنے ہوئے نام ہیں ۔ بھائی جان خیر المدارس جالندھر سے جب سالانہ تعطیلات میں گھر آتے تو پورا رمضان' انہیں منزل سنانے جاتے تھے اور حضرت قاری صاحب ہی تراویح کے لیے سامع اور مسجد منتخب کرتے تھے۔تقسیم تک بھائی عطاء المحسن مرحوم بھی ان سے پڑھتا رہا۔وہ لاہور تشریف لے آئے تھے اور وہیں انتقال فرمایا۔ریڈیو پاکستان سے سال ہا سال پڑھنے والے قاری عبیدالرحمٰنؒ بھی ان کے شاگرد تھے۔ایک بیٹا عطاء الکریم تھا۔قاری صاحب بلامبالغہ سینکڑوں کے استاد تھے۔

شیخ عبدالواحد:

امرتسر میں ابا جی کے دوستوں میں شیخ عبدالواحد، چینی کے برتنوں کی دکان کرتے تھے۔اماں جی بتایا کرتیں کہ اُن دنوں ہماری رہائش ایک چوبارے پر تھی، جہاں مہمانوں کے بٹھانے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ شیخ عبدالواحد جب کبھی ابا جی سے ملنے آتے تو نیچے کھڑے ہوکر یا قریب کسی دکان میں بیٹھ کر بات چیت ہوتی۔ایک دن شیخ صاحب ملنے آئے تو ابا جی نے اوپر کھڑکی میں سے جھانکا۔چونکہ کسی ضروری کام میں مصروف تھے،اس لیے نیچے نہ اترے اور وہیں سے بات چیت کرلی۔ شیخ صاحب اُس وقت تو واپس چلے گئے مگر انھیں یہ بات بہت محسوس ہوئی۔کچھ دنوں بعد وہ دکان چھوڑ کر پشاور چلے گئے اور پھر وہاں سے ایک خط لکھا۔اس خط میں صرف ایک شعر لکھا کہ:

اُس شوخ نے نگاہ نہ کی، ہم بھی چپ رہے
ہم نے بھی کوئی آہ نہ کی، ہم بھی چپ رہے

حکیم غوث محمد جام پوریؒ:

ایک صاحب کئی دن تک امرتسر میں ہمارے ہاں مقیم رہے۔ وہ کالا کمبل اوڑھے بیٹھک میں بیٹھے ہوتے۔ میں پانچ چھے سال کی تھی۔ اماں جی نے بتایا کہ ایک دن تم ڈر کر آ گئی تھیں، کالے کمبل میں لپٹے ان کو بیٹھے دیکھ کر۔ بڑے ہونے پر پتا چلا کہ وہ حکیم غوث محمد صاحب تھے۔ کوٹلہ دیوان تحصیل جام پور، ضلع ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے تھے۔ مجلس احرار میں شامل ہونے کی وجہ سے کتنی ہی قیدیں کاٹیں۔ ابا جی سے بہت عقیدت تھی۔ انھوں نے اس زمانے میں ایک رجسٹر بنایا ہوا تھا اور جن جن لوگوں نے ''امیر شریعت'' بنائے جانے پر ابا جی کی بیعت کی تھی، ان کے نام اس رجسٹر میں بیٹھے لکھتے رہتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ نے انجمن خدام الدین کا سالانہ جلسہ شیراں والا باغ لاہور میں منعقد کیا۔ اس جلسہ میں محدث العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ بھی تشریف لائے۔ انھوں نے فتنۂ قادیانیت کے استیصال کے لیے ابا جی کو امیر شریعت منتخب کیا اور اسی وقت پانچ سو سے زائد علماء نے ابا جی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کا دلچسپ دعوت نامہ:

ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری، غالباً ترکی میں سفیر ہند تھے۔ ''آل انڈیا مسلم مجلس'' کے کسی اجتماع میں شرکت کا دعوت نامہ ابا جی کو بھجوایا۔ جو صدر ''مسلم مجلس'' خواجہ عبدالحمید لے کر امرتسر آئے۔ دعوت نامہ پر ایک تصویر بنی تھی۔ کھجوروں کے جھنڈ میں ایک کچا مکان تھا اور اس کے دروازے پر ایک اونٹنی بیٹھی تھی۔ اس تصویر کے نیچے شوکت اللہ انصاری نے ابا جی کو مخاطب کر کے لکھا:

> ''وہ دیکھو! تمھارے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی ہمارے نانا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے دروازے پر بیٹھی ہے۔''

یہ لکھنے کا مقصد تھا کہ اجتماع میں بہر صورت شریک ہوں۔

امرتسر کا گھر:

امرتسر میں ہمارا گھر سڑک پر تھا۔گلوالی دروازہ سے داخل ہوں تو دائیں ہاتھ تھانہ، بائیں ہاتھ پیپل کے بڑے سے درخت کے سائے میں ایک کوٹھڑی، اس کے آگے چوڑا سا تھڑا۔کوٹھڑی میں چونگی والے بیٹھے ہوتے۔پیپل کے ساتھ لیٹر بکس لگا ہوا تھا اور تھڑے پر سردیوں میں گنے بیچنے والا گنے بیچا کرتا۔کچھ آگے جا کر ایک چوراہا سا پڑتا تھا۔دائیں جانب خانقاہ بابا ستار شاہ' ہمارے اور تھانے کی طرف تو دیواریں تھیں اور دروازہ مغرب کی طرف تھا۔خانقاہ کے ساتھ مولانا بہاءالحق قاسمیؒ کا مکان۔اسی لائن میں چار پانچ مکان چھوڑ کر ایک صاحب غلام جیلانی رہتے تھے۔ان کے تین چار بیٹے تھے۔سعید فوج میں تھا، یٰسین پولیس میں۔محلے میں یٰسین کا عرف ''۴۲۰'' مشہور تھا۔پتا نہیں اُن کے والد کیا کرتے تھے۔پکے مسلم لیگی تھے اور ہمارے گھر سے اللہ واسطے کا بَیر تھا۔محلے میں کوئی قابل مسلم ڈاکٹر تھا ہی نہیں۔ایک سکھ ڈاکٹر مریضوں کو دیکھنے کچھ دن گھر آتا رہا تو ان جیلانی صاحب کا فوجی صاحبزادہ دروازے پر لگے لیٹر بکس میں رقعہ ڈال گیا کہ آپ کے گھر سکھ ڈاکٹر کیا کرنے آتا ہے؟ حکیم غوث اپنے کام سے کام رکھتے۔کسی سے فالتو بات کرتے' نہ بلاتے۔ایک دن اسی مسلم لیگی فوجی نے انہیں سڑک پر پکڑ کر مارا کہ تم سلام کیوں نہیں کرتے؟ وہ مسلم لیگ کے اخلاق کا شکار ہوئے تھے۔ابا جی گھر نہیں تھے' ماموں جی مرحوم (سید عبدالحمید بخاریؒ) نے محلے والوں سے بات کی، بس اتنا یاد ہے۔پھر کچھ دن بعد حکیم صاحب گھر چلے گئے۔خط کتابت ہمیشہ ابا جی سے رہی۔دستخط بہت خوبصورت کرتے اور خط بھی بہت اچھا تھا۔جب ہم لوگ ۱۹۴۷ء میں خان گڑھ آئے 'تب بھی وہ کئی مہینے ہمارے ہاں مقیم رہے۔ملتان بھی چند بار آئے۔انتقال کا سن یاد نہیں۔لطف کی بات یہ ہے کہ اُنہی یٰسین صاحب (عرف ۴۲۰) نے پولیس چھوڑ کر دودھ دہی کی دکان کھول لی تھی اور اپنی بیٹی کو اماں جی کے پاس قرآن مجید پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔اماں جی نے سب باتیں نظر انداز کر کے پڑھایا بلکہ ان صاحب کی ایک ہمشیر کراچی سے بیوہ ہو کر امرتسر آ گئی تو اس نے بھی اپنی تین بچیاں قرآن مجید پڑھنے کے لیے اماں جی کے پاس بھیجیں۔اماں جی نے ان کو بھی پڑھایا۔

سرزنش کا نرالا انداز:

یہ آٹھ نو برس کی عمر کی بات ہوگی ۔ایک دن مولانا بہاء الحق قاسمیؒ کی ایک بیٹی اور میں چھت پر کھیل رہے تھے۔ کھیلتے کھیلتے لڑائی ہوگئی ۔ وہ برا بھلا کہہ کر گھر چلی گئی۔ مجھے اپنا غصہ فرو کرنے کی یہ صورت نظر آئی کہ سلیٹی سے دیوار پر اس کا نام لکھ کر آگے کوئی نازیبا لفظ لکھ دیا۔ کچھ دیر بعد ابا جی چھت پر گئے اور وہ لفظ انھوں نے لکھا دیکھ لیا۔ نیچے آئے اور مجھے آواز دے کر بیٹھک میں بلایا۔ پاس بٹھا کر آرام سے پوچھا کہ اوپر دیوار پر فلاں لفظ تم نے لکھا ہے؟ مارے ندامت اور خوف کے میرا خون خشک ہونے لگا اور قوتِ گویائی جواب دینے لگی۔ مجھے علم تھا کہ وہ ماریں گے نہیں۔ مگر جب کسی غلطی پر وہ فرماتے: بٹیا! یہ حرکت تم نے کی؟ تو جی چاہتا زمین پھٹ جائے اور میں روپوش ہوجاؤں ۔محض اس شرمندگی سے بچنے کے لیے میں نے جھوٹ بولا کہ جی نہیں، میں نے نہیں لکھا۔ بچپنے میں اتنا سوچنے کی ہوش کسے تھی کہ وہ تو ماتھا پڑھ لیتے ہیں۔انھوں نے مارا نہ برا لفظ کہا۔دوتین دفعہ وقفے وقفے سے جب پوچھا: کیا تم نے نہیں لکھا؟ تو محسوس ہوگیا کہ سچ بولنے کے علاوہ نجات کی کوئی صورت نہیں۔ میں نے مان لیا کہ ہماری لڑائی ہوئی تھی اور میں نے ہی لکھا ہے۔فرمانے لگے: ’’تو جھوٹ کیوں بولا؟ آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولنا۔ جاؤ اور جا کر دیوار سے وہ لفظ مٹا دو۔‘‘ یہ واقعہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اخلاقیات کے سلسلہ میں معمولی باتوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔

ابا جی کی یاد:

ایک دفعہ وہ بہت دنوں کے لیے دورہ پر گئے ہوئے تھے۔میرا دل بہت اداس تھا۔ وہ بہت ٹھنڈا پانی پیتے تھے۔ میں نے وہی برتن اٹھایا اور اس سے ابا جی کی طرح ہی منہ لگا کر پانی پیا۔ جب ابا جی واپس آئے اور حسب معمول کھانا کھاتے وقت مجھے ساتھ بٹھا لیا تو میں نے کہا ابا جی میرا دل آپ کے لیے بہت اداس تھا تو میں نے اس برتن سے ویسے ہی منہ لگا کر پانی پیا تھا جیسے آپ پیتے ہیں’’ابا جی! ایہہ وی تے اک طرح دی یاد ای ہے نا؟‘‘(یہ بھی تو ایک طرح کی یاد ہی ہے نا؟)۔ یہ بات ان کے دل کو لگی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

گھریلو زندگی میں مشفقانہ رویہ:

گھر میں ان کا آنا سب کے لیے خوشی کا باعث ہوتا مگر مجھے تو ایسی ہی خوشی ہوتی تھی جیسی بچپن میں عید کی! وہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہیں آتے تھے۔ امرتسر اسٹیشن سے گلوالی دروازہ آتے ہوئے ہال بازار سے موسم کا عمدہ پھل خرید کر آتے۔ اچھے سے اچھے کھانے کھلاتے اور یوں بھی ان کے طفیل اللہ کی نعمتیں گھر کا احاطہ کیے رہتیں مگر جو چیزیں ان کے لیے قطعی نا قابل برداشت تھیں، ہمارے حق میں بالخصوص اور متعلّقین کے لیے بالعموم، وہ تھیں جھوٹ اور چوری۔ بڑے سے بڑا نقصان سچ بولنے پر معاف فرما دیتے۔ سزا نہیں دیتے تھے بلکہ سمجھاتے تھے۔ امرتسر کا مکان مختصر مگر بڑے قرینے کا پختہ بنا ہوا تھا جو ابا جی نے اپنے استاد زادے اور ہم سبق حضرت مولانا بہاء الحق قاسمی مرحوم ومغفور سے خریدا تھا۔ جسے اُن کے والد اور ابا جی کے استاذ حضرت مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی رحمہ اللہ کے مُریدمستریوں نے بڑی عقیدت سے بنایا تھا۔ مولانا مرحوم نے وہ ابا جی کے ہاتھ بیچ دیا اور خود بالکل سامنے اور بنالیا۔ ۱۹۴۷ء تک ہم لوگ آمنے سامنے رہے۔ بیٹھک، صحن اور دونوں ڈیوڑھیوں میں سیاہ وسفید ٹائلوں کا فرش تھا۔ بچپن میں چینی کا کوئی برتن ہاتھ سے چھوٹ جاتا تو کرچی کرچی ہو جاتا۔ اماں جی ہلکی سی سرزنش کرتیں۔ جب کبھی اماں جی چھت پر ہوتیں اور میں نیچے برتن توڑ لیتی تو پھر دل سے بے اختیار ابا جی کی آمد کی ''پرخلوص'' دعائیں نکلتیں۔ کیونکہ سچ بولنے پر ایک تھپّڑ بھی نہیں پڑتا تھا صرف احتیاط سے اٹھانے کا کہتے۔ ویسے بچپن میں مجھ سے برتن ٹوٹے بھی بہت!

ابا جی گھر میں ہوتے تو معمولی باتوں کا بھی دھیان رکھتے۔ کبھی کبھی ہم بہن بھائیوں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے۔ ''کبھی'' اس لیے کہ ابھی سفر سے واپسی پر سامان رکھا جا رہا ہوتا اور ملاقاتی آن موجود ہوتے تھے مگر جب موقع ملتا تو پھر سمجھاتے بھی تھے۔ لقمہ چھوٹا لو، منہ میں پھراؤ مت، منہ بند کر کے ایک طرف رکھ کر چبا کر کھاؤ، چباتے ہوئے آواز نہیں آنی چاہیے، دسترخوان سے سالن والا ہاتھ نہ پونچھتے رہو، ہڈی پاس کسی برتن میں رکھو نیچے مت گراؤ، پھل کھا کر چھلکا

زمین پر مت پھینکو۔ وہ گھر سے رخصت ہونے سے لے کر واپسی تک کی روداد سفر ہمیں سناتے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا کہ ہم ابا جی کے ساتھ ہی تھے۔ یکے بعد دیگرے' بھائی حفظ قرآن کرتے رہے اور جب پہلی دفعہ کوئی تراویح میں پڑھتا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ کئی دفعہ ختم قرآن پر دیگ پکوا کر تقسیم کی۔

حسنِ سلوک:

ہمارے ایک ہی ماموں تھے' سید عبدالحمید بخاری رحمہ اللہ۔ ابا جی نے اصرار سے ان کو گھر پر رکھا تاکہ ان کی عدم موجودگی میں گھر پر کوئی سرپرستی کرنے والا ہو۔ ملازمت ان کی نجی تھی' جب تک امرتسر رہتے گھر رہتے۔ جب فرم کے مالک کسی اور جگہ تبادلہ کر دیتے تو مجبوراً جانا پڑتا۔ اماں جی کے ساتھ ابا جی کا سلوک سنت کے مطابق تھا۔ اماں جی گھر کی مالکہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق کو وہ لاکر ان کے سپرد کر دیتے اور فرماتے' سفر کے لیے کرایہ رکھ لیا ہے' باقی تمہارے سپرد۔ ہم نے کبھی اماں جی کو گن گن کر پیسے لیتے نہیں دیکھا، خاموشی سے رکھ لیتیں۔ عُسر و یُسر میں خندہ پیشانی اور تحمل سے گزارہ کرتے دیکھا۔ ابا جی کا کوئی الگ کھاتہ نہیں تھا۔ کبھی اماں جی حساب دینے کی کوشش کرتیں تو فرماتے مجھے کیا بتاتی ہو جو کچھ ہے تمہارا ہے)

امرتسر میں سکونت:

تحریک خلافت کے دنوں میں ابا جی جتنا عرصہ میانوالی جیل میں رہے(۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۴ء)' اماں جی ناگڑیاں (گجرات) میکے میں رہیں۔ رہائی کے بعد بھی کچھ عرصہ گجرات میں رہیں۔ ابا جی نے' آزاد مسلم ہائی سکول' گجرات اُسی زمانہ میں قائم کیا۔ اب بھی اس کے سنگ بنیاد پر ابا جی کا نام کندہ ہے۔ پھر مستقل امرتسر آ گئے۔ امرتسر میں ہماری رہائش مختلف محلّوں میں رہی۔ تفصیل یوں ہے:

کوچہ جیل خانہ......کوچہ عارف ڈار......چوک فرید......کٹڑہ مہاں سنگھ......کرموں ڈیوڑھی......اور گلوالی دروازہ!

۱۹۱۹ء میں دورانِ مارشل لاء اماں جی پہلی بار امرتسر آئیں۔ نانا جی سید مصطفیٰ بخاریؒ تب میرٹھ میں فوج کے امام تھے۔ ان کو سفر کا ''پاس'' ملا ہوا تھا۔ وہ اپنے ٹکٹ پر ساتھ امرتسر

لائے۔ابا جی تب ''مائی والی مسجد'' میں امام تھے۔ چند دن دادا جیؒ کے پھوپھا سید اسداللہ بخاریؒ اور پھوپھی کے ہاں مہمان رہے۔ پھر کوچہ جیل خانہ میں مکان کرایہ پر لیا۔تحریک خلافت کی قید کاٹ کر جب دوبارہ امرتسر آئے تو کچھ عرصہ کوچہ عارف ڈار چوک فرید میں رہائش پزیر رہے۔ مالک مکان بابا رحیم خان ابا جی کے انتہائی عقیدت مند تھے۔ پھر کٹڑہ مہاں سنگھ میں ٹھیکیدار محمد شریف صاحب کے مکان کا ایک چوبارہ کرایہ پر لیا۔ میں اور بھائی جان وہیں کی پیدائش ہیں۔ پھر جب پہلے الیکشن (۱۹۳۵ء) ہونے والے تھے تو مالک مکان اور ابا جی کے پسندیدہ امیدوار مختلف تھے۔ان کے منہ سے ایک مجلس میں نکلا کہ اگر شاہ جی نے فلاں کو ووٹ نہیں دینا تو پھر مکان کا بندوبست کرلیں۔ چچا عبدالرحیم عاجزؔ وہاں موجود تھے۔انھوں نے آکر ابا جی کو بتایا۔ابا جی نے خاموشی سے مکان کی تلاش شروع کردی۔سید اسداللہ شاہ صاحبؒ کا ایک مکان ''کرموں ڈیوڑھی'' میں تھا۔اُن سے مکان کی ایک منزل کرایہ پر لی۔دوسری منزل پر ان کے سب سے بڑے بیٹے سید محمد قاسم صاحبؒ رہائش پزیر تھے۔ جب سامان اٹھانے لگے تو ٹھیکیدار صاحب کو پتا چلا۔ پھر بڑی منتیں کیں مگر ابا جی نے مکان فارغ کردیا۔محلّے کی تیس چالیس بچیاں اماں جی سے قرآن پاک پڑھتی تھیں ان کے ماں باپ ازحد پریشان ہوئے۔آخر انھوں نے یہ حل نکالا کہ آپس میں ڈیوٹیاں بنالیں۔ روزانہ صبح ایک بچی کا والد محلّہ کی سب بچیوں کو ''کرموں ڈیوڑھی'' اماں جی کے پاس پہنچا جاتا اور شام کو لے جاتا' کسی پر زیادہ بوجھ بھی نہ پڑا اور بچیاں بھی پڑھتی رہیں۔لیکن کچھ عرصہ بعد پھر ٹھیکیدار محمد شریف صاحب معافی تلافی کرکے ابا جی کو واپس کٹڑہ مہاں سنگھ لے آئے۔ ۱۹۳۴ء تک کٹڑہ مہاں سنگھ میں رہائش رہی۔اماں جی فرماتیں کہ آئے دن مکان بدلنے سے میں بہت تنگ ہوتی تھی۔اس اثناء میں مولانا بہاء الحق قاسمیؒ نے اپنا مکان فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے کہا کہ مجھے زیور کی ضرورت نہیں' اسے بیچیے اور مکان لے لیجیے۔ چنانچہ کچھ زیور کی رقم اور کچھ دادا جی کی مدد سے ۳۴۰۰ روپے میں گلوالی دروازہ والا مکان خریدا گیا۔ بھائی جان مرحوم نے بچپن ہی میں مکان کے دروازے کے اندر ''۱۹۳۴ء'' لکھا ہوا تھا۔۱۹۳۴ء میں اس مکان میں رہائش اختیار کی جو تقسیم ملک پر ختم ہوئی۔۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران چھے ماہ کا عرصہ لاہور میں گزرا۔کچھ دن حاجی دین محمد صاحبؒ کے کارخانے (بادامی باغ) میں، کچھ دن

دفترِ احرار کی بالائی منزل پر، سال سے کچھ دن کم نواب زادہ نصر اللہ خانؒ کے ہاں خان گڑھ اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۱ء وفات تک ٹبی شیر خان ملتان کرایہ کے مکان میں مقیم رہے۔حزیں بنارسی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے جو اُن کی لوحِ مزار پر درج ہے' ابا جی نے ہی سنایا تھا۔

حزیں از پائے رہ پیا بسے سرگشتگی دیدم
سرِشوریدہ بربالینِ آسائش رسید ایں جا

ایک ماسی کا قصہ:

ابا جی خود دار تھے۔شکرِ نعمت سے ان کا دل لبریز تھا۔غرور اور تکبّر ان کے پاس سے نہ گزرا تھا۔ ہمارے دادا جی کے دو چچا اور ایک پھوپھی امرتسر میں آباد ہوئے۔ان کی اولاد تقسیم ہند تک وہیں آباد تھی۔ان سب گھروں میں ایک کشمیری خاتون کام کاج کیا کرتی تھی۔ ہمارے بچپن میں وہ ضعیف العمر تھی اور امرتسر میں پورے خاندان کے خورد وکلاں کی ''ماسی''۔ایک دن ابا جی ''کٹڑہ رام گڑھ'' سے گزر رہے تھے' سامنے سے ماسی آ گئی۔ابا جی نے سلام کیا۔وہ وہیں گلی میں بیٹھ کر اپنا حال سنانے لگی۔ابا جی وضع داری میں وہیں اس کی بات ختم ہونے تک کھڑے رہے۔ ماسی بہت خوش ہوئی کہ شاہ جی نے میرا حال سنا۔گھر آ کر یہ قصہ سنایا اور فرمایا کہ جب ماسی نے روکا تو مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم یاد آ گئے۔انھوں نے بھی سیدہ اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا کی باتیں ایسے ہی ایک دفعہ سنی تھیں۔ [1]

---

[1] سیدہ اُم ایمن کا اصل نام ''برکہ'' تھا۔اُن کا شمار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیوں میں ہوتا ہے۔بچپن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کی سعادت حاصل ہوئی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے مکہ مکرمہ میں ''عبید خزرجی'' سے بیاہ دیا۔ان سے ایک بیٹا ''ایمن'' پیدا ہوا۔بعد میں امّ المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے زید بن حارثہ کو آزاد کر کے اُن کا نکاح ام ایمن سے کر دیا۔پھر ان کے بطن سے اسامہ بن زید پیدا ہوئے۔اس طرح اسامہ اور ایمن (رضی اللہ عنہما) دونوں ماں جائے بھائی تھے۔جب حضرت زید بن حارثہ شہید ہوئے' اس وقت سیدہ ام ایمن رضی اللہ عنہا کی عمر پچپن برس تھی۔
(کتاب المعارف' ابن قتیبہ (اردو۔ص ۱۳۰)......(کفیل)

انگریزی فوج میں بھرتی:

ایک روز فرمانے لگے امرتسر میں بیٹھک میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا کہ سڑک پر سے چارپائیاں ٹھونکنے والا گزرا اور اس نے آواز لگائی ''منجی پیڑھی ٹھکا لو''! معاً مجھے خیال آیا یہی حال برطانوی فوج میں شامل ہمارے مسلمان بھائیوں کا ہے۔ یہ ترکھان تو روزی کمانے کے لیے کندھے پر اپنے ہتھیار اٹھائے پھرتا ہے اور مسلمان فوجی کندھے پر انگریز کی بندوق رکھ کے کہتا ہے...... مصری مروالو۔ حجازی مروالو۔ ترکی مروالو۔ شامی مروالو۔ ۱۵۔۱۶ روپے دو اور جس کو چاہو مروالو۔ تب ۱۵۔۱۶ روپے ہی تنخواہ ہوتی تھی۔ ایک روز ایک پٹھان، چھریاں چاقو تیز کرنے والے سے فرمایا کہ:

''تم اتنی محنت کرتے ہو لیکن مسلمان بھائیوں کو قرض سود پر دیتے ہو یہ تو حرام ہے۔''

وہ کہنے لگا:

> ''یہ لوگ یہاں سے جاتے ہیں اور ہم آزاد قبائل پر بم اور گولیاں برساتے ہیں۔ ہمارے بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ بناتے ہیں۔ ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟ کون کا پر کا بچہ (کافر کا بچہ) ان کو مسلمان سمجھتا ہے؟''

اجتماعی زندگی:

ابا جی کی تحریکی اور عملی زندگی، طالب علمی کا زمانہ ختم ہونے کے فوراً بعد ہی شروع ہوگئی تھی۔ وہ امرتسر میں مائی والی مسجد کوچہ جیل خانہ کے خطیب تھے اور جمعہ پڑھاتے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے حادثہ نے دل و دماغ پر مزید اثر ڈالا۔ مولانا محمد داؤد غزنوی مرحوم و مغفور ہم عصر، امرتسر کی نسبت سے ہم وطن اور جیّد علمی خاندان کے فرد تھے۔ انھوں نے ابا جی کی خطیبانہ صلاحیتوں کو بھانپ کر تھوڑا سا مہمیز کیا اور ابا جی شہری و ملکی معاملات پر بولنے لگے۔ پھر خلافتِ اسلامیہ کی بربادی اور اماکن مقدسہ کی توہین، دل پر چوٹ لگانے والے معاملات تھے۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی کوئی تحریک خواہ آزادیٔ ہند کے لیے چلی یا مسلمانانِ ہند کے حقوق کے لیے، خواہ دجالِ قادیان کے فتنہ کے استیصال کے لیے، ابا جی ذاتی اور

جماعتی طور پر صف اوّل میں شریک رہے اور کئی تحریکوں کے سربراہ رہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر جہاں کہیں حملہ ہوا، وہ شاتمانِ رسول پر شیر کی طرح جھپٹے اور انھیں نمونۂ عبرت بنا دیا۔
فرمایا کرتے:

"میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہنوں سے انگریزوں کو نکال پھینکا ہے۔ میں نے کلکتہ سے خیبر تک اور سری نگر سے راس کماری تک دوڑ لگائی ہے۔ وہاں پہنچا ہوں جہاں دھرتی پانی نہیں دیتی۔تمام عمر انگریزوں سے لڑتا رہا اور جب تک زندہ ہوں لڑتا رہوں گا۔میرا ایک ہی دشمن ہے اور وہ ہے انگریز۔اس نے ہمیں غلام بنایا ،قرآن میں تحریف کی اور مسلمانوں میں جعلی نبی پیدا کیا۔پھر اس خودکاشتہ پودے کی آبیاری کی اور چہیتے بچے کی طرح پالا۔"

مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمتہ اللہ علیہ:

حادثۂ جلیاں والا باغ امرتسر،تحریک خلافت اور مجلس احرار اسلام کے قیام جیسے اہم مواقع پر مولانا سید محمد داؤد غزنوی ،ابا جی کے ساتھ شریکِ سفر رہے۔ وہ مجلس احرارِ اسلام ہند کے پہلے سیکرٹری جنرل رہے۔ بعض قومی وملّی تحریکوں میں مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کی، کانگریس کے ہم نوا بھی رہے۔ ایک زمانے میں انھوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

آغا شورش کاشمیری کی روایت ہے کہ مولانا داؤد غزنوی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو سیٹھ سدرشن،شاہ جی کے پاس فریاد لے کر آئے کہ مولانا سے کہیں ،کم سے کم حساب کتاب ہی دے جائیں ،شاہ جی کو سخت غصہ آیا۔ کہنے لگے:

"اوّل تو میرا کانگریس سے کیا تعلّق اور اس کے روپے سے کیا واسطہ؟"
اور آپ کا حساب طلب کرنا بھی عجیب ہے۔
محمود غزنوی نے حساب دیا تھا کہ داؤد غزنوی حساب دیں؟"

چھے ماہ کا تاریخی دورہ اور گرفتاری:

۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی میں انھوں نے پورے چھے ماہ تک مسلسل دورہ کیا۔ امرتسر گھر میں وہ کئی روز کے بعد آئے اور اماں جی سے کہا کہ قیمہ پکاؤ، خود لا کر دیا۔ اماں جی نے ہانڈی چڑھائی تو ڈاکٹر سیف الدین کچلو صدر امرتسر کانگریس کا پیغام بر آیا کہ میٹنگ ہے اور ڈاکٹر صاحب بلارہے ہیں۔ اماں جی سے فرمایا ابھی آتا ہوں۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ کھانا ٹھنڈا ہو گیا۔ آخر ایک آدمی آیا کہ شاہ جی کا بستر (جو بندھا ہی پڑا تھا) اور بکس اٹھا دیجئے دورہ پر جارہے ہیں۔ ایک دو دن میں آجائیں گے۔ اماں جی فرماتیں کہ خون کے گھونٹ پی کر سامان باہر بھجوادیا۔ امرتسر سے، جالندھر، لدھیانہ، انبالہ، سہارنپور، آگرہ، دہلی پہنچے۔ چلتے چلاتے، راستے میں سے ایک پوسٹ کارڈ گھر لکھا کہ میں خیریت کی اطلاع دیتا رہوں گا۔ آپ نے جواب نہیں دینا۔ بمبئی، کلکتہ تک پہنچے۔ مختلف صوبوں سے گرفتاری کے ۱۴ وارنٹ پیچھے تھے۔ مشرقی بنگال کے شہر دیناج پور میں تقریر کی اور میزبان کے گھر بقیہ رات گزاری۔ صبح کی نماز پڑھ کر مصلّے پر بیٹھے تھے کہ مسلمان مخبر کی مخبری پر پولیس والے نے آکر کہا' سنا ہے کہ یہاں کوئی پیر صاحب آئے ہوئے ہیں۔ ابا جی نے فرمایا: '' کہیے! کیا کام ہے''؟ انھوں نے وارنٹ نکالے، دستخط کروائے اور گرفتار کرلیا۔ دیناج پور، علی پور اور کلکتہ میں ایک برس قید کاٹ کر رہا ہوئے۔

سیّدہ اُمِّ کلثوم کا انتقال:

مجھ سے بڑی بہن سیدہ اُمّ کلثوم چار ماہ کی تھی، جب ابا جی سفر پر نکلے تھے اور گرفتار ہوگئے۔ وہ سوا برس کی ہوکر ۱۹۳۱ء میں اللہ کو پیاری ہوگئی۔ وفات کو چند ماہ گزرے تھے کہ اپریل ۱۹۳۱ء میں ڈَم ڈَم جیل کلکتہ سے ابا جی رہا ہوکر گھر تشریف لائے۔ ہماری اماں جی کو قطعاً کوئی گلہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ سب کچھ دین وملت کے لیے کرتے ہیں۔

بھائی جان (مولانا سید ابوذر بخاریؒ) بتایا کرتے کہ جس دن ہماری بہن اُمّ کلثوم کا انتقال ہوا، گھر میں عجیب ماحول تھا۔ اماں جی کے صبر اور حوصلے کا بچپن میں پہلی بار مشاہدہ کیا۔ انھوں نے اپنی معصوم بیٹی کو خود غسل دیا، کفن پہنایا، چارپائی پر لٹایا اور پھر مجھے آواز دی:

''عطاء المنعم! اپنی بہن سے مل لو''

گھر میں اس وقت ماموں سید عبدالحمید بخاریؒ، اماں جی اور تیسرا میں تھا۔ محلے کی چند خواتین بھی جمع تھیں۔ ماموں جی اپنی بھانجی کی میّت خود اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر جنازہ و تدفین کے لیے گئے۔

مجاہدانہ زندگی:

ان کو اللہ نے جس کام کے لیے پیدا کیا تھا' وہی اس نے لیا۔ وہ جیسا بولتے' ویسا ہی صحیح تلفّظ لکھتے لیکن جو لکھتے وہ از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق ہوتا۔ لکھنا ان کے لیے مشکل نہ تھا لیکن تیس برس کے اسفار جو گھوڑے، اونٹ، تانگے، پھٹیچر لاریوں، پیدل، کشتی اور تھرڈ کلاس کے ریل کے ڈبے میں ہوتے تھے' وہ لکھنے کی مہلت نہیں دیتے تھے۔ انھوں نے ۱۰۳ درجہ بخار میں چارپائی پر لیٹ کر بھی تین گھنٹے تقریر کی۔

۳۲-۱۹۳۰ء کی تحریک کشمیر اور ۱۹۳۴ء میں قادیان میں، دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کر کے جمعہ پڑھانا اور گرفتاری وضمانت پر رہائی، یہ سب ان کی تحریکی زندگی ہی کے مظاہر ہیں۔ ۱۹۳۰ء ہی میں امروہہ میں تین دن مسلسل تقریر کر کے جمعیت علماء ہند کے اجلاس سے آزادیٔ ہند کی تحریک میں شمولیت کا ریزولیوشن پاس کرانا' ابا جی کی ہی ہمت تھی کہ جب بڑے بڑے پیر انگریزی توپوں میں ''کیڑے'' پڑنے کی دعائیں مانگ کر ''جہاد'' کر رہے تھے۔ ان کی زندگی کی آخری تحریک ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفّظ ختم نبوت تھی۔ انھوں نے علی الاعلان لاہور، لائل پور (فیصل آباد)، کراچی، پشاور اور ہر بڑے شہر میں فرمایا کہ:

> ''جہاں کہیں کوئی شخص اس تحریک میں شہید ہوا ہے' اس جہان اور آخرت میں اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ اے اللہ! میں ذمہ دار ہوں۔ میں نے لوگوں کو ابھارا ہے کہ وہ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر جانیں قربان کریں۔''

جو انھوں نے کہا، وہ کر کے دکھایا۔

تحریک فوجی بھرتی بائیکاٹ:

۱۹۳۹ء میں جنگِ عالمگیر ثانی کے شروع ہونے پر مجلس احرار اسلام، ہندوستان کی واحد جماعت تھی، جس نے سب سے پہلے فوجی بھرتی کے بائیکاٹ کا ریز ولیوشن پاس کیا۔اسی سلسلہ میں لالہ موسیٰ کی تقریر پر مقدمہ بنا، جس میں لدھا رام سرکاری رپورٹر نے تقریر میں تحریف اور سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب کے کہنے پر مقدمۂ بغاوت بنانے کا راز افشاء کیا۔اسی مقدمہ میں ایک روز ہائی کورٹ لاہور میں سماعت کے دوران سرکاری وکیل مسٹر سلیم (ایڈووکیٹ جنرل) نے سوال کیا کہ کیا آپ نے مرزا قادیانی کو کافر کہا ہے؟ لاہور ہائیکورٹ کا ڈویژن بینچ سماعت کر رہا تھا جو چیف جسٹس ڈگلس ینگ اور جسٹس رائے بہادر رام لال پر مشتمل تھا۔ابا جی نے فرمایا......

''ایک دفعہ؟......اس کو کافر کہتا تھا، کہتا ہوں اور جب تک زندہ ہوں کہتا رہوں گا۔''

اس پر جسٹس ینگ نے انگریزی میں کہا: ''اور پوچھو!''

انگریزی فوج سے نکلنے کا آسان طریقہ:

تحریک فوجی بھرتی بائیکاٹ (۱۹۳۹ء) کے نتیجے میں ہزاروں ہندوستانیوں نے انگریز کی فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کیا۔کئی نوجوان اپنی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے فوج میں بھرتی ہوجاتے مگر ان کے والدین سخت پریشان ہوتے اور ابا جی کے پاس آتے کہ کوئی صورت نکالیں، ہمارا بچہ واپس آجائے۔ چنانچہ ابا جی' مجلس احرار کے لیے پانچ روپے چندہ کی ایک رسید اس نوجوان کے نام کی لکھتے جو فوج میں بھرتی ہو چکا ہو۔ پھر مجلس احرار کے لیٹر پیڈ پر فوجی جوان کے نام ایک خط تحریر کر کے اسے بھیج دیتے۔ جونہی خط پہنچتا' جوان کو فوج سے نکال دیا جاتا اور وہ واپس گھر پہنچ جاتا۔

خاندان کا بابو طبقہ:

ابا جی کبھی کسی کی برائی نہیں سوچتے تھے۔ انگریز اور مرزائی کے سوا......! خاندان کا ''بابو'' طبقہ یوں تو مُلّا سمجھ کر حقارت سے دیکھتا مگر کسی مفاد کے لیے ضرورت پڑتی تو شہرت سے فائدہ اٹھانے سے گریز نہ کرتا۔کبھی قرابت داروں کے ''سلوک'' کا قصہ چھڑ جاتا تو زیادہ سے

زیادہ پانچ منٹ خاموش رہتے۔ پھر فرماتے:

''خدا کے لیے اس تذکرۂ بد کو ختم کردو۔گھر کی برکت اُڑ جائے گی۔اللہ نے تمھیں کس چیز کی کمی دے رکھی ہے؟ اپنا معاملہ اللہ سے درست رکھو' کبھی کسی کا برا نہ مانگو پھر دیکھو اللہ کیا کرتا ہے۔''

کئی تذکرہ نگاروں نے ایک بھانجے کا قصہ لکھا ہے۔بھانجا تو کوئی تھا ہی نہیں۔رشتہ میں ابا جی کی ایک پھوپھی تھیں۔ان کا لڑکا تھا عبدالباسط۔گھر میں کسی شرارت پر کچھ سرزنش ہوئی تو بھاگ کر جبل پور چھاؤنی پہنچا اور فوج میں بھرتی ہوگیا۔ ماں فوت ہو چکی تھی' خالہ جنھوں نے پالا پوسا تھا اور جو چچی بھی تھیں، روتی تھیں۔ برخوردار نازونعم کے پلے ہوئے تھے۔فوج کی مشقّتوں نے چھٹی کا دودھ یاد دلایا تو واپسی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔تب گھر والوں کو ''مولوی صاحب'' یاد آ گئے۔ ابا جی ان کے گھر گئے۔اس کی خالہ نے رو رو کر کوئی تدبیر کرنے کو کہا۔چنانچہ اس کے نام ابا جی کا ایک پوسٹ کارڈ جبل پور چھاؤنی گیا۔خط پہنچتے ہی سنسر ہوا۔ چھاؤنی کے افسرِ اعلیٰ نے عبدالباسط کو بلا کر اس سے' ابا جی کا اور اس کا رشتہ پوچھا۔اسے اپنے پاس روکا۔اس کا سامان منگوایا اور وہیں کھڑے کھڑے ڈسچارج کر دیا۔تیسرے دن برخوردار گھر پہنچ گئے۔اس کی خالہ ہمیشہ ابا جی کو دعائیں دیتی رہی۔ ایسے ہی کئی نوجوانوں کو خطوط لکھ کر فوج سے واپس بلوایا۔

خط کا متن کچھ ایسا تھا:

عزیزم......

السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ بڑی مناسب جگہ پہنچ گئے ہیں۔اپنے کام کی رفتار سے مجھے مطلع کرتے رہنا۔

......(ایک دو جملے اور بھی تھے)

والسّلام

سید عطاء اللہ بخاری

ابا جی کو زہر دیا گیا:

۱۹۴۲ء میں ان کو شجاع آباد (ضلع ملتان) میں جلسہ کے دوران زہر دیا گیا۔ گلے میں کثرت تقریر سے کچھ خرابی محسوس ہوئی ہوگی۔ ایک احرار رضا کار سے کہا کہ پان بنوالاؤ۔ اتنا سنتے ہی کوئی مخالف اٹھا اور رضا کار سے پہلے پان کی دکان پر پہنچ کر پان لگوایا اور شیشی میں سے کچھ نکال کر اس میں ڈالا اتنے میں رضا کار نے پہنچ کر دکان دار کو پان لگانے کا کہا تو وہ شخص بولا یہ میں نے لگوایا ہے۔ تمہیں جلدی ہے یہ تم لے جاؤ' میں اور لگوا لیتا ہوں۔ سادہ لوح رضا کار وہی پان لے کر آ گیا اور ابا جی کو دے دیا۔ رضا کار پر تو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ابا جی نے پان لے کر منہ میں رکھ لیا۔ پیک نگلتے ہی انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے اندر سے کوئی چیز کاٹ رہی ہے۔ ہتھیلی پر تھوڑی سی پیک ڈالی تو ہتھیلی کالی ہوگئی۔ رضا کار سے کہا کہ مجھے کیا ڈال کر دیا ہے؟ اُس نے کہا میں نے خود نہیں لگوایا' اِس طرح ایک آدمی نے دیا تھا۔ اُسی وقت لوگ پان والے کے پاس دوڑے گئے۔ اُس نے کہا میں نے تو کچھ نہیں ڈالا جس شخص نے لگوایا تھا' اُس نے شیشی میں سے کچھ ڈالا تھا' یہ ویسے ہی لے گیا۔ پان تو ابا جی نے تھوک دیا مگر شدید تکلیف شروع ہوگئی۔ فرماتے ایسا لگتا تھا کہ انتڑیاں کٹ کر نکل جائیں گی۔ جوں توں کر کے تقریر ختم کی اور قاضی احسان احمد صاحبؒ کے مکان پر پہنچے جہاں قیام تھا۔ ڈاکٹر نے آ کر کہا کہ زہر دیا گیا ہے۔ قاضی صاحبؒ کے والد قاضی محمد امین صاحبؒ روتے پھرتے تھے کہ اگر میرے ہاں شاہ جی کو کچھ ہو گیا تو میں کیا منہ دکھاؤں گا۔ پھر اجابتیں اور قے شروع ہوگئی کچھ دن وہیں علاج کیا پھر لاہور لائے گئے۔ ہم نے اخبار میں ہی پڑھا۔ لاہور میں حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے برادرِ نسبتی ڈاکٹر عبدالقوی لقمان صاحب کے زیر علاج رہے اور کافی دنوں بعد گھر آئے۔ بہت دن بخار اور قے میں مبتلا رہے اور انتہائی ناتواں ہو گئے۔

زہر دینے والا شخص:

جس شخص نے زہر دیا اس کا نام سید عنایت اللہ شاہ تھا۔ پولیس نے اسی رات اسے گرفتار کر لیا۔ جب اسے ابا جی کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''بھائی! میں نے آپ کا کیا نقصان کیا تھا؟''

پھر پولیس افسر سے فرمایا:

''بھائی! میں اس شخص سے کوئی انتقام نہیں لینا چاہتا۔ میں نے اسے معاف کیا، تم بھی معاف کر دو اور اللہ تعالیٰ بھی اسے معاف فرمائے۔''

پٹنہ اور امرتسر کا ادبی ماحول:

پٹنہ میں ''گلی لنگر، کوچہ خانہ باغ''......ابا جی کی جائے پیدائش ہے۔ بکثرت پھل دار درختوں کی وجہ سے گھر کو خانہ باغ کہتے تھے۔ شاد عظیم آبادی ننھیالی گھر کے ہمسائے تھے۔ نانا اور ماموں ان کے ہاں محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ابا جی کی پرنانی صاحبہ دہلی کی تھیں اور حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی نواسی تھیں۔ اعلیٰ درجہ کی زبان دان تھیں۔ شاد صاحب کو اگر کسی لفظ کے بارے میں کوئی الجھن ہوتی تو وہ تصحیح کے لیے ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ اس ماحول کا قدرتی اثر تھا کہ وہ بہت بڑے شعر شناس تھے۔ شاعر ان کو کلام سناتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔ جوش ایک بار اور جگر کئی بار گھر آئے۔ حفیظ کو ''شاہنامہ'' کی ترتیب کے دوران ان کا تعاون حاصل رہا۔ امرتسر، لاہور کے دفتر احرار یا ملتان میں یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی بڑا شاعر آئے اور ابا جی سے ملاقات کیے بغیر چلا جائے۔ ابا جی اسی شعر پر سب سے زیادہ داد دیتے جو خود شاعر کے نزدیک بھی اس کا سب سے بہتر شعر ہوتا۔ امرتسر میں علامہ محمد حسین عرشی، حکیم فیروز الدین طغرائی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، فیض احمد فیض، صوفی تبسّم اور شیخ حسام الدین اُن کے ہم جلیس تھے۔ اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعروں میں ساحر لدھیانوی، سیف الدین سیف اور ساغر صدیقی بھی ابا جی کی محفلوں میں کبھی کبھی شریک ہوتے۔ صوفی تبسّم اور پطرس بخاری سے گہری دوستی تھی۔ تاجور نجیب آبادی، جگر مراد آبادی، صابر دہلوی، مرتضیٰ احمد خان میکش، چراغ حسن حسرت، اختر شیرانی، احسان دانش، علامہ حسین میر کاشمیری، مجید لاہوری اور ڈاکٹر سید عبداللہ اکثر ان سے ملنے آتے۔ صحافیوں میں مہر و سالک سے بڑی دوستی رہی۔ ان کا روزنامہ ''انقلاب'' مسلم لیگ کا ترجمان تھا۔ لیکن جب سالک نے دیانت کو تحریر سے خارج کر دیا اور مخالفت میں جھوٹی خبریں شائع کرنے لگے تو تعلّقات

ختم کر دیئے۔ قیام پاکستان کے بعد ماہرالقادری مرحوم کراچی سے ملتان آتے تو ضرور مل کر جاتے اور اچھا خاصا مشاعرہ برپا ہو جاتا۔

بھائی جان (سید ابو ذر بخاری نور اللہ مرقدہ) کے مرتب کردہ ابا جی کے مجموعۂ کلام ''سواطع الالہام'' کو دیکھئے اور ان کی نعت:

''ہزار صبح بہار از نگاہ می چکدش''

پڑھیئے تو آپ محسوس کریں گے کہ کسی قدیم ایرانی شاعر کا کلام ہے۔ وہ شعر ساز اور شعر شناس اعلیٰ درجہ کے تھے۔ بچپن میں بہت سی کتابیں پڑھیں۔ کئی ''انشاءات'' کے نام لیا کرتے تھے' اب یاد بھی نہیں۔ لیکن شاعری میں ابتذال ان کو سخت ناگوار تھا۔ قدماء میں سعدی، حافظ، جامی، ابو طالب کلیم، محمد جان قدسی، غالب، حزیں بنارسی کا بہت سا کلام یاد تھا۔

خدمات کا صلہ؟

انھوں نے ملت کے لیے جو صحیح سمجھا وہ کیا۔ انہیں ہندوستان کے علماء، مشائخ، ادباء، شعراء اور چوٹی کے سیاستدانوں کی صحبتیں میسر رہیں۔ انھوں نے بڑی بہادری سے آزادی کی جنگ لڑی۔ انگریزی اقتدار کو للکارا، قید و بند اور سفر کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن تقسیم ہند کے بعد لیگی حکمرانوں اور سیاست دانوں سے پاکستان کے ''غدار'' کی گالی سنی۔

ایک دفعہ انھوں نے فرمایا:

اپریل ۱۹۵۰ء میں علامہ علاؤالدین صدیقی (سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) کسی جلسہ میں شرکت کے لیے جھنگ تشریف لائے تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ چنانچہ ملاقات کے لیے آ گئے اور پوچھنے لگے: ''شاہ جی! کیا حال ہے؟''

میں نے کہا: ''علامہ صاحب! ہم لوگ تو اب مرنے کے لیے جی رہے ہیں۔ کچھ وقت ہم پر گزر رہا ہے اور کچھ ہم وقت میں سے گزر رہے ہیں۔ حال تو اپنا آپ سنائیے' جنھیں ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ ہم تو آپ کے غدار ٹھہرے۔ ہمارا کیا حال ہوگا؟ ساری عمر فرنگی سے ٹکر لی۔ جوانی جیلوں میں غارت کی اور جب چار دن خوشی سے بسر کرنے کا وقت آیا تو دنیا بھر کے مفت

خورے اور انگریز کے بیٹے قوم پر چڑھ بیٹھے۔ اور جنھوں نے اپنا سب کچھ تباہ کیا تھا' وہ غدار بن گئے۔ علامہ مبہوت ہو کر میرا منہ تکتے اور باتیں سنتے رہے۔'' [1]

یہاں مجھے اباجی کے فارسی اشعار یاد آ رہے ہیں۔ جو ان کے ٹوٹے ہوئے دل کی آواز ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری کہانی کہہ دی ہے:

از شاخِ جنوں فِتادہ برگیم ‏ ‏ ‏ مُردیم و در انتظار مرگیم

بایں ہمہ ضعف و ناتوانی ‏ ‏ ‏ دانی! کہ چہ کارہا نہ کردیم؟

ما مسلکِ رُوبہی نہ رفتیم ‏ ‏ ‏ ما پیروئ خَراں نہ کردیم

بر مسندِ فقر یگانہ فردیم

''ہم جنوں کی شاخ سے گرے ہوئے پتے ہیں
ہم موت کے انتظار میں ہیں، حالانکہ ہم مر چکے ہیں
کیا تم جانتے ہو کہ اس کمزوری اور ناتوانی کے باوجود
ہم نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے ہیں
ہم نے لومڑیوں (بزدلوں) کا مسلک اختیار نہیں کیا
اور نہ ہی ہم نے گدھوں (احمقوں) کی پیروی کی ہے
ہم فقر کے بوریا نشین اپنی مثال آپ ہیں۔''

علامہ اقبالؒ سے تعلّق:

وہ اقبال کے ارادت منداور اقبال اُن کے عقیدت مند تھے۔ لاہور میں ہوتے تو اقبال کی مجالس میں بھی شریک ہوتے۔ اقبال باوضو ہو کر بیٹھ جاتے اور اباجی سے فرمائش کر کے قرآن کریم سنتے۔ خاص طور پر سورۃ مزمل۔ پھر ان کی فرمائش پر اپنا کلام سناتے۔ اباجی بتایا کرتے تھے کہ قرآن کریم سنتے وقت اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر اقبال کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ انھوں نے ایک تقریر میں اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

[1] ''سواطع الالہام''، ص ۱۳۹

''مسلمانو! قرآن پڑھا کرو۔ سید احمد شہید کی طرح نہ سہی، اقبال کی طرح ہی پڑھ لو۔ دیکھو! اس نے قرآن کو ڈوب کر پڑھا تو دانشِ افرنگ پر ہلّہ بول دیا۔ اقبال کو قوم سمجھ لیتی تو کبھی غلام نہ رہتی اور انگریز سمجھ لیتا تو وہ تختۂ دار پر ہوتے۔ وہ بت کدۂ ہند میں اللہ اکبر کی صدا تھے۔''

۱۹۲۱ء کی تحریک خلافت میں ابا جی پہلی بار قید ہوئے اور میانوالی جیل میں تین سالہ قید کاٹ کر رہا ہوئے۔ رہائی کے بعد علامہ سے ملنے گئے تو حسبِ معمول انھوں نے باوضو ہو کر قرآن کریم کی تلاوت سنی پھر اپنی ایک نظم سنائی۔ اقبالؒ نے یہی نظم مولانا محمد علی جوہر کی رہائی پر انہیں بھی سنائی تھی۔

اسیری

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشکِ ازفر چیز کیا ہے، اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

''شہپرِ زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند'' [1]

ایک ملاقات میں اقبال نے کہا:

''پیرا! ویکھ میں تیری موت لکھی اے''

---

[1] بانگِ درا۔ ص ۲۵۳

(مرشد! دیکھو میں نے تمہاری موت لکھی ہے)۔ پھر موت کے عنوان پر کچھ کلام سنایا۔ [1]

۱۹۲۶ء میں اقبال نے صوبائی مجلس قانون ساز (پنجاب لیجلیسٹو کونسل) کا الیکشن لڑا تو ابا جی نے ان کے حق میں تقریریں کیں۔

ایک بات یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ بعض اشخاص سرکار کی طرف سے ڈاکٹر اقبال کی نگرانی پر مامور تھے۔ یہ وہ ''احباب'' اور ''خدام'' تھے جنھوں نے' نہ صرف ہمیشہ اُن کی مخبری کی بلکہ ان کی گرد و پیش ایک خاص طرح کی فضا اور ماحول بنائے رکھا۔ مقصود یہ تھا کہ عملی سیاست میں شرکت اور قومی معاملات میں رہنمائی کے اُن ''خطرناک'' فیصلوں سے مرحوم کو باز رکھا جائے' جن کے لیے ہمیشہ سے سرکار کو' اُن کی طرف سے اندیشہ اور خوف رہا۔

مولانا غلام قادر گرامی رحمتہ اللہ علیہ:

مولانا غلام قادر گرامی فارسی کے استاد شاعر تھے۔ علامہ اقبال اُن سے اصلاح لیتے رہے۔ جید عالم اور شعر و ادب میں سند تھے۔ ایک جلسے میں اقبال نے گرامی کا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''آج گرامی کو دیکھ لو، کل فخر کرو گے کہ ہم نے گرامی کو دیکھا ہے۔'' گرامی، ابا جی کی دینی جدوجہد اور فرنگ دشمنی کی وجہ سے اُن سے بہت محبّت کرتے۔ ابا جی سنایا کرتے کہ ایک مرتبہ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو بہت اکرام کیا۔ دودھ کے پیالے سے میری تواضع کی۔ جاتے ہوئے معانقہ کیا۔ میرا ماتھا چوما اور ''میر واعظِ پنجاب'' کا خطاب دیا۔ مسلسل یہ الفاظ دہراتے رہے۔ میر واعظِ پنجاب، میر واعظِ پنجاب، میر واعظِ پنجاب۔ انھوں نے ابا جی پر فارسی میں نظم بھی کہی جو ظفر علی خاں کے اخبار ''زمیندار'' میں شائع ہوئی۔

در شہادت گاہ تکمیلِ رموزِ امر و نہی
آرزو مندِ شہادت جز عطاء اللہ نیست

---

[1] غالباً یہ وہی نظم ہے جو ''ارمغانِ حجاز'' میں ''موت'' کے عنوان سے شامل ہے' اور جس کا پہلا شعر ہے:

شنیدم مرگ با یزداں چنیں گفت
چہ بے نم چشمِ آں کز گِل بزاید

حرفِ حرفش معنیٔ تفسیرِ قرآں است و بس
حرف با حرفش بگیرد آنکہ رمز آگاہ نیست
ہر چہ می گوید قلندر دیدہ گوید اے پسر
در نگاہِ اہل معنی غیر وجہ اللہ نیست
نفی و اثبات شہید دوست در معنی یکیست
ہم عطاء اللہ ہست و ہم عطاء اللہ نیست

ترجمہ:

۱۔ رموزِ شریعت (امرونہی) کی تکمیل کی شہادت گاہ میں

۲۔ عطاءاللہ کے علاوہ کوئی شہادت کا آرزومند نہیں ہے

۳۔ اس (کی گفتگو) کا حرف حرف قرآن کی تفسیر ہے اور بس

۴۔ اس کی گفتگو پر وہی اعتراض کرتا ہے جو رمز (شریعت) سے آگاہ نہیں ہے

۵۔ اے بیٹے! قلندر جو بات کہتا ہے دیکھ کر کہتا ہے

۶۔ حقیقت شناس لوگوں کی نگاہ میں اللہ کی ذات کے سوا کچھ نہیں

۷۔ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے کی موت اور زندگی دونوں معناً یکساں ہیں۔

۸۔ (لہٰذا) عطاءاللہ رہیں یا نہ رہیں (ان کے لیے یکساں ہے)

شعراء وادباء سے تعلّق:

۱۹۴۲ء میں ''وار فنڈ'' جمع کرنے کے لیے امرتسر میں سرکاری اہتمام سے مشاعرہ تھا۔ میں تب پانچویں جماعت کی طالبہ تھی۔ ہماری آپا جی بغیر کسی ٹیوشن فیس کے ہمیں عصر تک پڑھاتی رہتیں، تب امتحان نزدیک تھے۔ اساتذہ نیک نامی کو دولت پر فوقیت دیتے تھے۔

دومنزلہ سکول تھا۔ چھٹی ہوئی تو مائی کے تیار ہونے تک ذرا کھڑکی سے جھانک رہی تھی، جس پر سرکیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا، دو تانگے سواریوں سے بھرے ہمارے گھر کی طرف جارہے ہیں۔ عمِّ مکرم شیخ حسام الدین، علامہ انور صابری، عبدالرحیم عاجز ہمارے گھر کے سوا ادھر

اور کہاں جا سکتے تھے۔ میرا دل خوف سے ڈوبنے لگا۔ یا اللہ! ابا جی ٹھیک ہوں۔ مائی کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتی گھر پہنچی تو بیٹھک آدمیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اماں جی نے چائے بنانے کے لیے بڑا دیگچہ پانی کا چولہے پر رکھا ہوا تھا۔ بیٹھک میں سے واہ واہ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ماموں جی (سید عبدالحمید بخاری مرحوم) چائے بیٹھک میں لے کر جا رہے تھے۔ اس روز جو شاعر جمع تھے' اُن میں چند کے نام یاد رہ گئے ہیں: جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری اور شکیل بدایونی وغیرہ۔ سب نے کلام سنا کر ابا جی سے داد پائی۔ آخر میں' میں نے ماموں جان سے عرض کیا کہ حفیظ صاحب سے شاہنامے والا ''سلام'' سنوا دیجیے۔ چنانچہ انھوں نے ''سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی'' والا سلام سنایا۔ یہ ادب اور ادباء میں مقبولیت ہی تھی جو ایسے لوگوں کو ہمارے غریب خانہ پر لے آتی تھی۔

ایک دلچسپ واقعہ:

محفل برخاست ہوئی۔ مہمان رخصت ہوئے تو ابا جی نے سرہانے رکھی گھڑی وقت دیکھنے کے لیے اٹھانا چاہی۔ وہ غائب تھی۔ کالج کے کچھ نوجوان جو انتہائی عقیدت سے ابا جی کی چارپائی کے ساتھ لگے بیٹھے تھے' شاید اُن میں سے کسی نے پسند کر لی۔ مولانا گل محمد شاہ صاحب' تلمبہ (ضلع خانیوال) کے ایک انتہائی مخلص دوست' ابا جی کی بیماری کا پڑھ کر عیادت کے لیے آئے ہوئے تھے اور شریک محفل تھے۔ انھوں نے اپنی جیبی گھڑی نکالی اور پیش کر دی۔ ابا جی نہیں لے رہے تھے تو بُو اُجی (مولانا کی اہلیہ) کا تبصرہ بڑا دلچسپ تھا' کہنے لگیں: ''شاہ جی لے لو' مولوی کول بڑیاں نیں'' (شاہ جی! لے لیں' مولوی کے پاس بہت گھڑیاں ہیں۔) یہ گھڑی آخر عمر تک ابا جی کے پاس رہی۔ کلائی والی وہ آخری گھڑی تھی جو چوری ہوگئی۔ پھر نہیں باندھی۔

جگر مراد آبادی:

آخری بار جگر ملتان آئے تو صابر دہلوی کی معیت میں گھر آئے لیکن ابا جی اپنے مرشد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ سے ملنے لاہور گئے ہوئے تھے۔ جگر یہ چٹ لکھ کر دے گئے:

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

جگر ادیب، مہاجر دہلی - ملک شہید لکھنؤ

(۱)

عرفی مرحوم کے قصیدے کا ایک شعر ہے:

از در دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

اسی زمین میں ابا جی کا بھی شعر ہے:

آستینم برُخ و داغ بداماں رفتم
بچہ طَور آمدہ بودم بچہ عنواں رفتم

حسنِ اتفاق ہے کہ جگر مراد آبادی بھی حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ سے بیعت تھے۔

عبدالحمید عدمؔ:

مارچ ۱۹۵۹ء میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے سید عبدالحمید عدمؔ ملتان آئے تو اگلے روز حافظ لدھیانوی کے ہمراہ گھر آ گئے۔ عدمؔ نے دو تین غزلیں سنائیں۔ ایک غزل یہ تھی:

وہ باتیں تری وہ فسانے ترے
شگفتہ شگفتہ بہانے ترے
ضمیرِ صدف میں کرن کا مقام
انوکھے انوکھے ٹھکانے ترے
بہار و خزاں کم نگاہوں کے وہم
برے اور بھلے سب زمانے ترے

---

(۱) یہ عکسِ تحریر بھائی جان مرحوم کے پاس محفوظ تھا۔ یہ عکس میں نے اُنہی سے حاصل کیا۔

بس اک داغِ سجدہ مری کائنات
جبینیں تری آستانے ترے
بس اک زخمِ نظارہ حصہ مرا
بہاریں تری آشیانے ترے
عدؔم بھی ہے تیرا حکایت کدہ
کہاں تک گئے ہیں فسانے ترے

دوسرے شعر پر ابا جی نے بہت داد دی۔ اور پھر فرمایا: ''ظالم! یہ تو نے حمد کہہ دی ہے۔''
یہ تبصرہ سن کر عدؔم جھوم گئے۔ کہنے لگے:

''شعر کا یہ مفہوم تو میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ شاہ جی! آپ نے میرے شعر کو بہت بلندی عطا کر دی ہے۔''

ابا جی کی فرمائش پر ذیل کے دو اشعار عدؔم نے اُن کی ڈائری میں یادگار کے طور پر لکھے [1]

ضمیرِ صدف میں کرن کا مقام
انوکھے انوکھے ٹھکانے ترے
عدم
7/4/59

اے ناخدا سفینے کا اب کوئی غم نہ کر
ہم غرق کر چکے ہیں کہ ساحل نہیں رہا
[illegible] عدم
7-3/59

---

[1] یہ ڈائری سید عطاء المحسن بخاری علیہ الرحمتہ کے پاس محفوظ تھی۔ عدؔم کے دست نوشتہ اشعار کا عکس وہیں سے پیشِ خدمت ہے۔ (کفیل)

ضمیر صدف میں کرن کا مقام
انوکھے انوکھے ٹھکانے ترے

....

اے ناخدا سفینے کا اب کوئی غم نہ کر
ہم فرض کر چکے ہیں کہ ساحل نہیں رہا

واپس جا کر عدمؔ نے ابا جی پر ایک نظم لکھی۔ جس کا ایک شعر تھا:

تو آدمی نہیں یزداں کی اک نشانی ہے
ترے بڑھاپے میں احرار کی جوانی ہے

ایک اور نظم ابا جی کی زندگی میں ''امیر شریعت قلندر فقیر'' کے عنوان سے لکھی۔ پھر انتقال پر بھی ایک نظم کہی۔

علماء و مشائخ کا وسیع حلقۂ تعارف:

ان کے وسیع حلقۂ تعارف میں ہندوستان کے ہر طبقہ کا عطر شامل تھا۔ مثلاً حضراتِ مشائخ میں حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی (مرشد اوّل) حضرتِ اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری (مرشد ثانی) محدث العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری (مربیّ) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا احمد خان (خانقاہ سراجیہ کندیاں) حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب (خانقاہ دین پور)، شاہ بدرالدین (امیر شریعت صوبہ بہار) مولانا محمد فاخر الٰہ آبادی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ۔ قومی رہنماؤں اور دیگر علماء کرام میں مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت مفتی محمد کفایت اللہ، مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مفتی محمد حسن (استاذ) حضرت مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی (استاذ) مولانا حبیب الرحمٰن مکی (استاذ) مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا احمد سعید دہلوی، قاری محمد طیب قاسمی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا بدرِ عالم میرٹھی مہاجر مدنی، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا خیر محمد جالندھری، مفتی فقیر اللہ رائے پوری، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی، حضرت مولانا محمد زکریا لدھیانوی (والد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مفتی محمد نعیم لدھیانوی) مفتی محمد شفیع سرگودھوی، مولانا ظہور احمد بگوی، مولانا عبدالشکور لکھنوی، مولانا محمد منظور

نعمانی ،مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہم اللہ تعالیٰ ......اور یہ ’’مشتے نمونہ ازخروارے‘‘ ہے۔مختلف طبقوں کے اثر پزیر لوگوں کا ذکر کیا جائے تو ایک طویل فہرست بنے گی۔

قرآن اور قرّاء سے محبّت:

قرأ حضرات میں حضرت قاری عبدالمالک لکھنوی،حضرت قاری کریم بخش رام پوری، قاری محمد طاہر دیوبندی،قاری عبدالوہاب مکی رحمہم اللہ اوران کے علاوہ مدارس عربیہ کے جتنے بھی معروف قرأ تھے ’گھر آتے تو ان سے قرآن سنانے کی فرمائش ہوتی اور جب جلسوں پر جاتے‘ تو بھی سنتے۔ایک عقیدت مند نے ریڈیو ہدیہ کیا تو اس کا مصرف یہ تھا کہ اردو خبروں کے علاوہ قریباً دو گھنٹے مختلف مقامات سے قرآن پاک سنتے۔بغداد، مکہ مکرمہ،شام،دہلی سے عربی پروگراموں میں جن قراء کی تلاوت سنی گئی ان میں سے کچھ کے نام یاد ہیں۔قاری عبدالباسط عبدالصمد ،قاری محمد عکاشہ، عبدالرحمٰن الدروِی ،قاری ذکی شرف،قاری عبدالفتّاح شاّ شایِ اورقاری صلاح الدین کُبّارا۔قرآن سنتے وقت اکثر رو دیتے۔خصوصاً جب قاری کالحن وتلفّظ بھی اعلیٰ ہوتا۔دہلی کے قاری حامد حسن پرانے دوست تھے۔ریڈیو کراچی سے وہ ہر جمعہ کو شام پانچ بجے تلاوت کرتے اور ابا جی کو اس کا انتظار رہتا۔باقی رہ گئے کوچہ سیاست کے رہنما،رفقا، مخالفین،موافقین ومتبعین تو ان کا شمار مشکل ہے۔اس صف میں مسلمان، ہندو،سکھ سب شامل ہیں۔

گاندھی سے ملاقات:

موہن داس کرم چندگاندھی جو ہندوؤں کے لیے’’مہاتما جی‘‘ تھے(مہا، آتما: بہت بڑی روح)......’’حضرت اقدس‘‘ کا ہندی ترجمہ سمجھ لیجیے۔وہ مقررہ اوقات پر پابندیوں کےساتھ ملتے تھے۔کوئی اشدضروری معاملہ ہوتا تو ابا جی کی اُن سے ملاقات ہوتی،ورنہ اِدھر تصویر بنوانے کی کوئی بے چینی نہیں ہوتی تھی۔۱۹۴۶ء میں جب وزارتی مشن ہندوستان آیا تو ان دنوں گاندھی جی سے ملاقات ہوئی۔وہ اپنی ہرشام کی’’پرارتھنا سبھا‘‘ یعنی مجلس دعا میں وید،انجیل اورقرآن پاک کی آیات پڑھوایا کرتے تھے۔اِس ملاقات میں سورۃ فاتحہ کے مطالب پر ہی گفتگو رہی تھی۔

جواہر لال نہرو کے ہاں قیام:

۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک کے دنوں میں جواہر لال نہرو کے مکان’’آنند بھون‘‘ الہ آباد میں کئی دن مہمان رہے۔تب موتی لال نہرو زندہ تھےاورنہرو کی بیوی کملا دیوی بھی۔

بتایا کرتے کہ صبح اٹھتے ہی بدیشی مال کی دکانوں پر پکٹنگ کے لیے کارکنوں کے ہمراہ پہنچ جاتی تھی۔

سائمن اصلاحات پر تقریر اور غالب کا شعر:

اُسی زمانے میں ایک جلسہ میں موتی لال کے بعد ابا جی کی تقریر تھی۔ سائمن کمیشن کی اصلاحات کے خلاف جلسہ تھا' موتی لال بیرسٹر تھے۔ فرماتے جو نکتہ میں سوچتا وہ اسی پر بولنے لگتے۔ میں سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ کس نکتہ پر بولوں۔ اُن کی تقریر اختتام کو پہنچی تو لوگ سائمن کا جنازہ بنا کر جلسہ گاہ میں لے آئے۔ فرماتے کھٹ سے میرے ذہن میں غالب کا شعر آیا اور میں نے جنازہ کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے اپنی مخصوص لے میں پڑھا :

ہوئے مر کے ''تم'' جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا

یوپی کے تعلیم یافتہ لوگوں کا اجتماع اور یہ برمحل شعر' جلسہ میں واہ واہ کے شور سے ایک قیامت برپا ہوگئی۔ موتی لال مارے حیرت کے ''ارے ارے'' کرتے رہ گئے اور پھر جو طبیعت کھلی تو کئی گھنٹے تقریر کی۔ ہدایت تو من جانب اللہ ہے لیکن ہزاروں ہندو سکھ ان کا قرآن سنتے تھے۔ اور کہتے تھے ''سانوں شاہ جی دا قرآن پڑھنا بڑا چنگا لگدا اے۔'' (ہمیں شاہ جی کا قرآن پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے)۔ ان کا قرآن سن کر اور اخلاق دیکھ کر کئی ہندو، سکھ اور عیسائی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

میانوالی جیل کی شبِ ماہتاب:

تحریکِ خلافت ۱۹۲۱ء میں' جب میانوالی جیل میں قید تھے تو سپرنٹنڈنٹ ہندو تھا' پنڈت رام جی داس۔ ایک شب جو اتفاق سے ''شب ماہتاب'' تھی' صحن میں بیٹھے چاندنی سے محظوظ ہوتے ہوئے سورۃ یوسف کی تلاوت شروع کر دی۔ طویل سورۃ ہے، ترتیل سے پڑھتے ہوئے گھنٹہ بھر گزر گیا۔ فرماتے اچانک کسی نے سسکیاں لیتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ''شاہ جی! خدا دے واسطے، ہن بس کر دیو، ہن میرے کولوں رویا وی نئیں جاندا'' (شاہ جی! اللہ کے لیے اب بس کر دیں۔ اب تو مجھ سے رویا بھی نہیں جاتا)۔ وہ رام جی داس سپرنٹنڈنٹ جیل تھا۔

شورش کاشمیریؒ:

آغا شورش کاشمیریؒ طبعی طور پر ایک شاعر اور ادیب تھے۔ بچپن میں مولانا ظفر علی خانؒ

کا روزنامہ ''زمیندار'' زیرِ مطالعہ رہا۔ پھر مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ''الہلال'' نے ذوقِ تحریر وانشاء کو جلا بخشی اور مفکّرِ احرار چودھری افضل حق ؒ کی فکر انگیز تحریروں نے ذہناً احرار کے قریب کر دیا۔ ۱۹۳۵ء کی تحریک مسجد شہید گنج میں مولانا ظفر علی خان کی ''مجلس اتحادِ ملت'' میں شامل اور مجلس احرار کے مخالف تھے۔ تحریک شہید گنج میں گرفتار ہوئے اور رہائی کے بعد چودھری افضل حق کی تحریک پر مجلس احرار اسلام میں شامل ہو گئے۔

میں نے اپنے بچپن میں انہیں امرتسر میں دیکھا۔ پھر لاہور، خان گڑھ اور ملتان میں قیام کے دوران وہ ابا جی سے ملنے آتے رہے۔ احرار کانفرنسوں میں ان کی تقاریر بھی سنیں۔ مجلس احرار کی ''تحریک فوجی بھرتی بائیکاٹ'' ۱۹۳۹ء کے دوران وہ امرتسر آئے اور ''چبوترے والا چوک'' پر جلسہ ہوا۔ میں سات برس کی تھی۔ محلے کی خواتین کے ساتھ جہلم کے ایک نَومسلم عبدالرحمٰن صاحب کے چوبارے پر جو چبوترے کے چوک پر تھا، بیٹھ کر تقریر سنی۔ تقریر تو یاد نہیں لیکن اس جلسہ میں انھوں نے اپنی ایک نظم پڑھی تھی جس کا ایک مصرعہ حافظے میں رہ گیا ہے:

''آج کھاتا ہوں میں اپنی نوجوانی کی قسم''

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں وہ امرتسر آئے۔ مجلس احرار کی انتخابی مہم کے سلسلے میں جلسہ تھا۔ مجلس احرار میں شمولیت سے قبل انھوں نے ابا جی کے خلاف ایک نظم لکھی جو کچھ اس طرح تھی:

''پنکچر ہوئی جاتی ہے احرار کی لاری ...... یا پیر بخاری''

انتخابات میں مسلم لیگ احرار کی مخالف و مقابل جماعت تھی۔ انھوں نے شورش کی وہی نظم شائع کر کے شہر میں تقسیم کی کہ کل تک احرار اور بخاری کی مخالفت کرنے والا شورش آج اُن کی حمایت کر رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ شورش جلسہ میں جانے کے لیے جب ہمارے گھر سے روانہ ہونے لگے تو ابا جی نے رخصت کرتے ہوئے کہا:

''اوئے شورش!

بولے: ''جی''

ابا جی نے کہا: ''ہتھاں دیاں دِتیاں ہُن منداں نال کھول کے جائیں۔''

(ہاتھوں سے لگائی ہوئی گرہیں اب دانتوں سے کھولنا)

مراد وہی نظم تھی جو مخالفین نے شائع کر کے تقسیم کی تھی۔

اس سے پہلے وہ مولانا ظفر علی خان کی ''مجلس اتحادِ ملت'' کے سٹیج سے مجلس احرار کی مخالفت میں تقریر بھی کر چکے تھے۔

شورش نے اپنے خاص انداز میں ''جے'' (جی) کہا اور ابا جی کو سلام کر کے جلسہ میں چلے گئے۔ بہت پر جوش مقرر اور گرج دار آواز تھی۔ انھوں نے زبر دست تقریر کر کے مخالفین کے پروپیگنڈے کے اثرات کو زائل کر دیا۔

انھوں نے ابا جی پر ایک اور نظم کہی جس کے پہلے دو شعر یہ تھے:

قربانی و ایثار کی تفسیر بخاری
ایمان کے گلزار کی ہے بادِ بہاری
یہ ایک حریفوں کے ہزاروں پہ ہے بھاری
واللہ زبان اس کی ہے شمشیر دو دھاری

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات کے بعد فضا بدل چکی تھی۔ شیخ حسام الدین مجلس احرار ہند کے صدر تھے۔ لاہور میں احرار کا جلسہ اور ابا جی کی تقریر تھی۔ میں نے اماں جی سے اصرار کر کے ابا جی کی تقریر سننے کی اجازت لی۔ اماں جی نے گھر کی خادمہ ''بے بے جانو'' کے ساتھ مجھے لاہور بھیج دیا۔ تب امن وشرافت کا دور تھا۔ دفتر احرار لاہور کے سامنے باغ دہلی دروازہ میں جلسہ تھا۔ خواجہ عبدالرحیم عاجز مرحوم کے بچوں کے ساتھ ہم جلسہ سننے گئے۔ ابا جی نے تقریر شروع کی تو مختلف کونوں کھدروں سے چند مخالفانہ آوازیں بلند ہوئیں۔ شورش نے مائیک پر آ کر کہا کہ:

''میں بحیثیت جنرل سیکرٹری مجلس احرار صوبہ پنجاب احرار رضا کاروں کو حکم دیتا ہوں کہ جو آواز جہاں سے اٹھے اُسے وہیں دبا دیا جائے اور جلسہ گاہ کو شر پسندوں سے پاک کر دیا جائے۔''

پھر کوئی آواز نہیں تھی اور مکمّل سکون میں ابا جی دوبارہ مائیک پر آئے اور فرمایا ''اب مانتے''۔

شورش' مولانا ابوالکلام آزادؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور چودھری افضل حقؒ سے بے حد متاثر تھے۔ ان شخصیات کے احترام میں اُن کا دل ہمیشہ دھڑکتا رہا۔ مجلس احرار اسلام کے سٹیج سے

آزادیٔ وطن کے لیے انھوں نے بہت ایثار کیا اور تکالیف اٹھائیں۔ دس برس قیدِ فرنگ میں گزارے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی حق گوئی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مگر اُن کے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ یہ استقامت اور خلوص اِنھی عظیم شخصیات کی صحبت و رفاقت کا فیض تھا۔

شورش مجلس احرار کے ترجمان روزنامہ ''آزاد'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ۲۶/جنوری ۱۹۴۷ء کو وہ علامہ انور صابریؒ کے ساتھ ابا جی سے ملنے امرتسر آئے۔ تو ''آزاد'' کا ''آزادی نمبر'' لے کر آئے اور ابا جی کو پیش کیا۔ کانگریس کا ملک کی کامل آزادی کا ریزولیشن پنڈت نہرو کی زیرِ صدارت غالباً ۲۶/جنوری ۱۹۲۹ء کو لاہور میں منعقدہ اجلاس میں منظور ہوا تھا۔ جس کی یاد میں سب اخبار اس تاریخ کو خاص نمبر شائع کرتے تھے۔ بھارت کا یوم جمہوریہ بھی اسی تاریخ ۲۶/جنوری کو مقرر کیا گیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں ہم امرتسر سے لاہور دفتر احرار میں آئے تو چند ماہ کے قیام میں بہت سے لوگوں کو دیکھا جو ابا جی کے پاس آتے اور فسادات میں ہونے والے جانی و مالی نقصانات پر روتے۔ شورش مرحوم اُن دنوں مستقل دفتر احرار میں قیام پذیر اور روزنامہ ''آزاد'' کے مدیر تھے۔ ہفتوں گھر نہ جاتے۔ اُن کی اہلیہ آتیں اور ابا جی سے شکوہ کرتیں کہ انہیں گھر کی خبر تک نہیں۔ حالات ہی ایسے تھے کہ ہر طرف فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ ابا جی کے کہنے پر شورش گھر جاتے اور پھر لوٹ آتے۔ دفتر احرار میں احباب کی آمد و رفت رہتی اور ابا جی اپنی مجالس میں جو گفتگو کرتے، شورش مرحوم انھیں قلم بند کرتے رہتے جنھیں بعد میں ابا جی کی سوانح پر اپنی کتاب میں شامل کیا۔ ذہناً تو وہ مرتے دم تک احرار سے وابستہ رہے لیکن عملاً ۱۹۴۸ء میں انھوں نے اپنی راہ جدا کر لی تھی۔ سیاست کو خیرباد کہا اور صحافت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۸ء میں اپنا ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور سے جاری کیا اور قرطاس و قلم کے ہو کر رہ گئے۔ پاکستان میں مجلس احرار، جمعیت علماء یا علماء دیوبند کے خلاف کسی بھی ہرزہ سرائی کے جواب میں شورش ہی کی واحد آواز تھی جو بلند ہوتی اور منہ توڑ جواب دیتی۔ اس میدان میں وہ قلم اور زبان دونوں ہتھیار لے کر اترے اور بڑی بہادری اور بے خوفی سے تنہا لڑے۔

خان گڑھ میں نواب زادہ نصر اللہ خان مرحوم کے ہاں قیام (۱۹۴۸ء) کے دوران وہ

ابا جی سے ملنے یہاں بھی آئے۔ تقسیم ملک کے ہنگاموں اور قتل و غارت گری پر بہت افسردہ اور مغموم تھے۔ ابا جی سے مل کر واپس جانے لگے تو اُن کی ڈائری میں فیض کا یہ شعر لکھ گئے:

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں

ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

ابا جی کے انتقال پر ملتان آئے تو رات کو قاسم باغ میں تعزیتی جلسہ میں اُن کی تقریر نے سماں باندھ دیا تھا۔ وہ خود بھی روئے اور عوام کو بھی رلایا لیکن پھر حوصلہ بھی دیا کہ ہم شاہ جی کا مشن عقیدۂ ختم نبوت کا تحفّظ اور قادیانیت کا محاسبہ جاری رکھیں گے۔ اس روز انھوں نے ابا جی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک طویل نظم بھی کہی جس کا مطلع تھا:

اچھا ہوا کہ آپ بھی ہم سے بچھڑ گئے

ورنہ امید و یاس کا قصہ دراز تھا

ابا جی سے انہیں بے پناہ عقیدت تھی۔ تقریباً گیارہ نظمیں اُن کی یاد میں کہیں۔

ابا جی فرماتے: میری تقریریں تو بہت لوگ سنتے ہیں مگر شورش میرے چہرے پر نظریں جما کر سنتا ہے، آنکھ نہیں جھپکتی۔ اس نے میری خطابت سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ بمبئی میں احرار کانفرنس تھی۔ شورش کی تقریر کے بعد ابا جی نے تقریر نہیں کی۔ فرمایا: عزیزی شورش نے جو باتیں کہہ دی ہیں، کافی ہیں۔ وہ اسی طرح اپنے چھوٹوں اور رفیقوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔

ابا جی کے انتقال کے بعد قادیانی لیڈر سابق وزیرِ خارجہ سر ظفر اللہ خان نے کہیں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ: کہاں ہے عطاء اللہ شاہ بخاری؟'' تب شورش نے بھائی جان مرحوم (مولانا سید ابو ذر بخاریؒ) کی تصویر ''چٹان'' کے صفحۂ اوّل' پر شائع کی اور سر ظفر اللہ کو جواب دیتے ہوئے اس کے نیچے لکھا ''یہ ہیں سید عطاء اللہ شاہ بخاری''۔ تب ظفر اللہ خان کی زبان گنگ ہوگئی تھی۔

شورش اپنی وفات (۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۵ء) تک عقیدۂ ختم نبوت کے تحفّظ اور قادیانیت کے استیصال کے لیے احراری جرأت اور بہادری کے ساتھ بولتے اور لکھتے رہے۔ موت کے وقت کلمہ طیبہ پڑھا اور دوستوں کو گواہ بنا کر ختم نبوت کا اقرار کیا۔ یہ اُن پر اللہ کی خاص رحمت تھی۔

پر بودھ چندر:

لاہور کانگریس کے ایک سربر آوردہ لیڈر لالہ پنڈی داس تھے۔ان کے داماد پر بودھ چندر ایم اے‘ شورش کاشمیری کے دوست تھے اور انہی کے ذریعہ سے دفتر احرار میں ابا جی کو ملنے آنے لگے۔ پھر ایسے اسیر ہوئے کہ امرتسر گھر بھی آنے لگے۔ایک سہ پہر مجھے یاد ہے آغا شورش، علامہ انور صابری اور پر بودھ چندر صرف ملاقات کے لیے لاہور سے امرتسر آئے۔ابا جی نے کباب کلچوں سے تواضع کی اور بعد میں چائے پلائی۔ تقسیم کے موقع پر جب ابھی تقسیم پنجاب کی بلی تھیلے سے باہر نہیں آئی تھی۔ہم لوگ کچھ دن لاہور میں حاجی دین محمد صاحب کے ہاں‘ پھر دفتر احرار کے چوبارے پر پریشانی میں دن گزار رہے تھے۔رمضان سر پر تھا تو اماں جی کے اصرار پر ابا جی واپس امرتسر گھر چلنے پر تیار ہو گئے۔غالباً شورش کاشمیری کے ذریعے پر بودھ کو علم ہو گیا کہ شاہ جی امرتسر واپس جا رہے ہیں۔اُس نے شورش کو فون کیا:

> ’’کسی قیمت پر شاہ جی کو واپس امرتسر نہ جانے دینا۔وہ اب چلے گئے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے۔‘‘

یہ بات تو شورش نے بعد میں بتائی۔البتہ دفتر کے جملہ کارکنوں کو اکٹھا کر کے باری باری سب سے کہلوایا کہ آپ واپس امرتسر نہ جائیں جبکہ خواجہ جمال الدین بٹ کو لاری لانے کا کہا جا چکا تھا۔ابا جی اوپر آئے اور اماں جی سے فرمایا۔ میں نے تفاول کیا ہے کہ کسی وقت بات مان لینی اچھی ہوتی ہے۔ یہ سب لوگ میرے ہمدرد ہیں اور سب منع کر رہے ہیں۔ جہاں اتنے دن رہے ہیں چند دن اور دیکھ لیتے ہیں۔اماں جی خاموش ہو گئیں اور چند دن بعد ہی ہمارے محلّہ گلوالی دروازہ پر حملہ ہو گیا۔اور ہمسائے لٹ پٹ کر لاہور آنے اور ملنے لگے۔اور پھر پاکستان بن گیا۔

غالباً ۱۹۵۹ءیا ۶۰ء کا موسمِ سرما تھا‘ (ملتان میں) ابا جی صبح کو حسب معمول اپنے وظائف میں مشغول تھے۔ بیٹھک کا دروازہ یوں تو بند ہوتا مگر کُنڈی کھول کر بیٹھے ہوتے۔آنے والے آکر بیٹھ جاتے‘ فارغ ہو کر اُن سے بات کرتے۔اچانک بیٹھک کا دروازہ کھلا تو آغا شورش اور پر بودھ چندر‘ اندر داخل ہوئے۔وہ بغیر کسی اطلاع کے آئے تھے۔ابا جی تسبیح ہاتھ میں لیے اندر

آئے اوراشارے سے کچھ بتایا ۔ بھائیوں نے جا کر دیکھا تو دونوں حضرات تھے ۔ پر بودھ مل کر روتا رہا۔اور بتایا کہ:

''شاہ جی! آپ بہت یاد آئے، صبح اٹھتے ہی لاہور آ گیا۔''

ہم نے پرتکلّف ناشتہ کرایا اور دوپہر کا کھانا بھی۔ پر بودھ گوشت بلا جھجھک کھاتا ۔ کھانے کے بعد دونوں واپس لاہور چلے گئے۔

ڈاکٹر کے ایم اشرف اور فیروزالدین منصور (کمیونسٹ رہنما):

کمیونسٹوں کو ابا جی سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی، جن کے ہاں خدا کے وجود ہی کا انکار ہے۔ لیکن وہ بھی ملتے تھے ۔ابا جی یوپی جاتے تو مشہور کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف اُن سے ضرور ملتے ۔ایک دفعہ انھوں نے ابا جی سے کہا تھا:

''شاہ جی! ہم برسر اقتدار آ گئے تو سب سے پہلے تمھیں گولی کا نشانہ بنائیں گے۔ تمہاری تقریریں ہمارے لیے خطرناک ہیں۔''

فیروز الدین منصور کٹر کمیونسٹ لیڈر تھے۔ غالباً ۱۹۴۶ء میں امرتسر گھر ملنے آئے اور واپس جا کر کمیونسٹوں کا اخبار ہفت روزہ ''قومی جنگ'' بمبئی' ابا جی کے نام جاری کرادیا۔ پاکستان بننے تک ایک سفید پوش آتا اور دستک دے کر خاموشی سے اخبار دے جاتا ۔منشی احمد دین نے ان سے جیل میں قرآن پڑھا۔ترقی پسند ادیبوں میں فیضؔ اور سبط حسن سے لے کر ظہور نظر تک کتنے ہی چھوٹے بڑے ایسے تھے کہ جن کی نیازمندی ان سے ذاتی تعلّق کی سی تھی ۔میجر اسحاق' جو ۱۹۵۳ء میں پنڈی سازش کیس میں ماخوذ ہوئے تھے' خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ ابا جی کی ملاقات کو ملتان بھی آئے تھے ۔اور پھر یہ بھی کہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمتہ کی معروف غزل انھوں نے خوب لہک لہک کر ابا جی کو سنائی تھی ۔ آواز اُن کی اتنی بلند تھی کہ بیٹھک سے باہر بھی صاف سنائی دے رہی تھی:

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

پری پیکر نگاری ، سرو قدی ، لالہ رخساری

سراپا آفتِ دل بود شب جائے کہ من بودم

رقیباں گوش بر آواز اُو در ناز و من ترساں

سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائے کہ من بودم

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو

محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

ترجمہ:

(۱) مجھے معلوم نہیں کہ وہ کونسا مقام تھا جہاں میں گزشتہ رات تھا۔

(بس ایسا تھا کہ) جہاں میں گزشتہ رات تھا، وہاں ہر طرف رقصِ بسمل تھا (لوگ تڑپ رہے تھے)

(۲) ایک پری پیکر محبوب جلوہ افروز تھا، جو قد و قامت میں سرو سے مشابہ تھا اور اس کے رخسار گلِ لالہ کی طرح سرخ تھے۔

وہ سربسر دل کے لیے آفت تھا اور یہ اُس مقام کی بات ہے جہاں میں نے گزشتہ رات گزاری۔

(۳) رقیبوں نے آواز پر کان لگائے ہوئے تھے، وہ محبوب محو ناز تھا اور میں ڈر رہا تھا (کہ نہ جانے کیا ہو جائے)

اُس مقام پہ، جہاں میں کل رات تھا، اس صورت حال میں بات کرنی کتنی مشکل تھی۔

(۴) اے خسرو! خداوند قدوس، بزمِ لامکاں میں خود میرِ محفل تھا

اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس محفل کے چراغ تھے۔ اور یہ بھی اسی مقام و منزل کا معاملہ تھا، جہاں میں گزشتہ رات تھا۔

کثیر الجہتی کا راز:

مجید لاہوری اور عبدالحمید عدم کے بارے میں ان کو سب معلوم تھا، کبھی شرمندہ نہ کیا۔ وہ زندگی میں ملنے آتے رہے اور بعد میں جب تک خود زندہ رہے ابا جی کے گُن گاتے رہے۔ اب یہ

فیصلہ خود کریں کہ ان کی کثیر الجہتی کا راز کیا تھا؟ زاہدِ شب زندہ دار اور رندِ مے خوار سب یکساں وارفتگی سے ان کو ملتے تھے۔ میں تو اسے ابا جی کی کسر نفسی کا الٰہی انعام ہی کہوں گی۔ اللہ تعالیٰ جس سے راضی ہوتے ہیں ملاءِ اعلیٰ میں اعلان فرما دیتے ہیں اور اس شخص کی محبوبیت دلوں میں القاء کر دی جاتی ہے۔

مجید لاہوری کا ''نمکدان'':

مجید غضب کے مزاح نگار تھے۔ ادب اور صحافت میں بڑا نام پایا۔ کراچی سے ہفت روزہ ''نمکدان'' نکالا تو ابا جی کے نام اعزازی پرچہ جاری کیا اور تاثرات بھجوانے کی فرمائش بھی کی جو انھوں نے لکھ بھیجے۔ ❶

روزنامہ ''آزاد'' لاہور:

تقسیم ہند سے قبل جاری ہوا۔ مجلس احرار اسلام کا ترجمان تھا۔ شیخ حسام الدینؒ، ماسٹر تاج الدین انصاریؒ، شورش کاشمیریؒ اور نواب زادہ نصر اللہ خانؒ اس کے ایڈیٹر رہے۔ اخبار کا ڈیکلریشن شیخ حسام الدین صاحب کے نام تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد شورش کاشمیریؒ نے اپنا ہفت روزہ ''چٹان'' جاری کیا۔ پھر مختلف ادوار میں شیخ حسام الدینؒ، ماسٹر تاج الدین انصاریؒ اور مولانا مجاہد الحسینی اس کے مدیر رہے۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں ''آزاد'' مجلس احرار کا واحد ترجمان تھا۔ ۱۹۶۲ء تک کسی نہ کسی رنگ میں شائع ہوتا رہا۔ پھر اخبار بند ہو گیا۔

---

❶ یہ تاثرات ''نمکدان'' کے ۱۵ را کتوبر ۱۹۴۹ء کے شمارے میں ''کانِ نمک'' کے زیرِ عنوان اس طرح شائع ہوئے:

> ''میں بہت خوش ہوں کہ آپ کا نمکدان فواحشات سے پاک ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے ترقی دے۔ ہم اسے گھر میں بھی پڑھ لیتے ہیں۔ رہی آپ کی کراچی میں مکان نہ ملنے کی شکایت تو کراچی والوں نے کوئی ایسا مکان نہیں بنایا جس کے دروازے سے آپ داخل ہو سکیں۔*'' سید عطاء اللہ بخاری
>
> *اُن کے موٹاپے کی طرف اشارہ ہے۔ (کفیل)

روزنامہ ''نوائے پاکستان''

مرتضٰی احمد خاں میکش روزنامہ ''نوائے پاکستان'' لاہور کے ایڈیٹر تھے۔۱۹۵۵ء میں یہ اخبار مجلس احرار نے اُن سے لے کر جماعت کا ترجمان بنادیا۔ کچھ دن میکش صاحب ہی ایڈیٹر رہے پھر مجاہد الحسینی ایڈیٹر بن گئے۔تحریک تحفّظ ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے بعد ۱۹۵۵ء تا ۵۸ء روزنامہ ''نوائے پاکستان'' نے مجلس احرار کی بھرپور ترجمانی کی۔

لدھارام کیس میں گرفتاری:

لدھارام کیس (۱۹۳۹ء) میں گرفتار ہونے سے چند روز قبل وہ مظفّر گڑھ تشریف لے گئے۔ایک روز صبح اماں جی چولہے کے پاس بیٹھی ناشتہ بنارہی تھیں۔ میں اور بھائی جان پاس بیٹھے تھے کہ ڈیوڑھی کے دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی آواز آئی ''پھوپھی جی السّلامُ علیکم''۔ یہ بھائی عزیز الرحمٰن صاحب لدھیانوی مرحوم ومغفور تھے(حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے صاحبزادے)۔وہ سب بہن بھائی اماں جی کو پھوپھی کہا کرتے تھے اور پھر وہیں سے انھوں نے کہا شاہ جی گرفتار ہوگئے! اماں جی خاموش رہیں۔انھوں نے بیٹھک میں بیٹھ کر ماموں جان (سید عبدالحمید بخاری رحمہ اللہ) اور بھائی جان (سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ) کو تفصیلات بتائیں اور چلے گئے۔غالبًا تیسرے دن ابا جی کا مظفّر گڑھ سے لکھا ہوا پوسٹ کارڈ بھی موصول ہوگیا' مجھے بس اتنا یاد ہے' اس میں گرفتاری کی اطلاع تھی۔(۸ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو گرفتار ہوئے)

گجرات جیل میں ملاقات:

جب ابا جی گجرات جیل منتقل ہوگئے تو بھائی جان اور ماموں جان ہر پیشی پر امرتسر سے گجرات جایا کرتے تھے۔ایک روز میں نے ضد کی کہ ابا جی سے ملنے جانا ہے تو اس روز نہ تو ماموں مانے اور نہ بھائی جان۔ان کے جانے کے بعد میں خوب روئی۔اماں جی نے تو کبھی بھی جیل جا کر ملاقات نہیں کی مگر میری منتوں سے ان کا دل پسیج گیا اور اس سے اگلی پیشی پر انھوں نے ماموں جی کو آمادہ کرلیا اور وہ مجھے گجرات لے گئے۔اس وقت تو مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ ماموں

جی نے مجھے ایک کھلی جگہ گھاس پر بٹھا دیا۔ برقعہ میں نے پہنا ہوا تھا۔ اتنا یاد ہے بڑا ہجوم تھا۔ کافی دیر بعد کہنے لگے آؤ چلو۔ یاد آتا ہے ایک کمرہ تھا جس میں سرخ روغن ہو رہا تھا۔ ابا جی کرسی پر بیٹھے تھے۔ میں، ماموں جی، بھائی جان اور عاجز چچا مرحوم (خواجہ عبدالرحیم عاجز امرتسری' معروف احرار رہنما اور پنجابی شاعر) اندر داخل ہوئے۔ میں ابا جی سے لپٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔ انھوں نے مجھے گود میں بٹھا لیا۔ پیار کیا اور کہا: ''رومت!''

کمرے کی کھڑکی میں سے ایک عمارت نظر آ رہی تھی' کہنے لگے:

''وہ دیکھو کیسی اچھی جگہ ہے' میں وہاں رہتا ہوں۔''

بھائی جان نے پہلا محراب جب پڑھا تو ابا جی قید ہی میں تھے۔ عید سے پہلے میں نے ایک دن اماں جی سے کہا مجھے ریشمی کپڑے بنا دیجئے۔ غالباً کسی لڑکی کے کپڑے دیکھ کر' یا ویسے ہی کہا۔ انھوں نے صرف یہ جواب دیا کیا تمہیں معلوم نہیں تمہارے ابا جی قید ہیں۔ پھر بھلا کیا سوجھتا۔ میں نے زندگی کا سب سے پہلا خط ابا جی ہی کے نام جیل میں لکھا۔ اماں جی نے پنسل سے کچا کر دیا اور میں نے اس پر قلم پھیر دیا۔ پھر مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل ہو گیا۔ جس پیشی پر فیصلہ متوقع تھا' اس سے تین دن قبل اماں جی ہر رات مردانے میں اور کچھ خواتین کو بلا کر زنانے میں بھی آیۂ کریمہ کا ختم کرواتی رہیں۔

رہائی:

شہر میں ایک صاحب تھے جو احرار کے جلسوں کی منادی تانگے میں نوبت بجا کر چوک در چوک کیا کرتے تھے۔ تیسرے دن عصر کے وقت عین ہماری بیٹھک کی کھڑکیوں کے سامنے تانگہ آ کر رکا۔ ان صاحب نے دھڑا دھڑ نوبت بجانی شروع کی اور فرطِ مسرت سے تمتماتے چہرے کے ساتھ ابا جی کی رہائی کا اعلان کیا۔ میں نوبت کی آواز سن کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ ابا جی کی رہائی کی خوش خبری سن کر بھاگتی ہوئی اماں جی کے پاس آئی۔ وہ صحن اور دالان میں نہیں ملیں۔ میں کوٹھڑی میں گئی تو وہ مصلّے پر سر بسجود تھیں۔ یہ سجدۂ شکر تھا! منادی والا مبارک دے کر چلا گیا اور ہمسائیاں مبارک باد کہنے آنے لگیں۔ اب انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہو رہی تھیں۔

ہمارے ہمسایوں نے تو چراغاں کیا تھا خوشی میں۔ رات نو دس بجے کا وقت ہوگا، ہم سب چھت پر سوئے تھے، اچانک جو میری آنکھ کھلی تو ساتھ والی چارپائی پر اماں جی نہیں تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ''ممگھ'' میں سے صحن کی روشنی اوپر آ رہی تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھی، نیچے دیکھا تو بیٹھک میں سے روشنی اور آوازیں آ رہی تھیں۔ دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتری اور بیٹھک میں پہنچ گئی۔ ابا جی، بھائی جان، ماموں جان اور ابا جی کے بچپن کے دوست جناب حافظ محمد سعید صاحب مرحوم و مغفور تشریف لا چکے تھے اور سامان رکھ رہے تھے۔ میں ابا جی سے لپٹ گئی اور میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

ابا جی کے خلاف یہ مقدمۂ بغاوت وزیر اعظم سر سکندر حیات نے بنوایا تھا۔ سرکاری گواہ مسٹر لدھا رام منحرف ہوگیا اور اس نے عدالت میں کہا کہ تقریر کے نوٹس جعلی ہیں۔ جو میں نے سکندر حیات کے حکم پر نئے سرے سے لکھے اور اصل تقریر کے نوٹس جلا دیئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد تھی۔ چنانچہ ابا جی اس مقدمہ میں بری ہو گئے۔ یہ مقدمہ ''لدھا رام کیس'' کے نام سے تاریخ کا حصہ بن گیا۔

دادا جی کی دعائیں:

بھائی جان مرحوم، اماں جی رحمتہ اللہ علیہا کی مصدقہ روایت بیان کیا کرتے کہ لاہور ہائی کورٹ میں لدھا رام کیس کی سماعت جاری تھی اور فیصلہ قریب تھا۔ ابا جی لاہور میں قید تھے۔ دادا جی نے ناگڑیاں میں اپنی رہائشی کوٹھڑی میں اعتکاف کرلیا۔ ہر وقت ابا جی کے لیے دعائیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ سے اُن کا تعلّق اور یقین بہت مضبوط تھا۔ اس تعلّق پر مان بھی تھا۔ جب اعتکاف کیا تو بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض پرداز ہوئے:

''اے اللہ! میرا بیٹا قید ہو اور میں باہر رہوں؟

جس دن عطاء اللہ جیل سے باہر آئے گا، میں بھی اس دن اعتکاف ختم کروں گا۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ابا جی مقدمۂ بغاوت سے باعزت بری ہو کر رہا ہوئے تو دادا جی بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اعتکاف ختم کر کے اپنی کوٹھڑی سے باہر آئے۔''

ابا جی پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم تو تھا ہی مگر اللہ تعالیٰ کے صالح بندے بھی اُن کے حق میں دعائیں کرتے۔ والد ماجد کی پُرخلوص اور محبّت بھری دعائیں، خانقاہِ رائے پور، خانقاہ سراجیہ کندیاں، خانقاہ دین پور اور دیگر اہل اللہ کے مراکزِ رشد و ہدایت میں اُن کے لیے دعائیں ہوتیں اور اولیاء اللہ کی توجہات اُن کے شامل حال رہتیں۔

تختۂ دار پر:

سر سکندر حیات (وزیر اعظم پنجاب) نے مقدمۂ بغاوت کچھ اس طرح بنوایا تھا کہ دو میں سے ایک سزا ہو سکتی تھی۔ سزائے موت یا عمر قید۔ ابا جی سنٹرل جیل لاہور کا یہ واقعہ سنایا کرتے کہ:

میں نے سوچا کہ قربانی کے لیے تو جانور کا صحت مند ہونا شرط ہے۔ اگر کمزور جسم کے ساتھ پھانسی چڑھا تو دشمن سمجھے گا کہ موت کے خوف سے لاغر ہو گیا تھا۔ میں نے خوب ورزش کی، اچھی خوراک کھائی اور سونے کا کشتہ بھی کھا لیا۔ اُن دنوں میری صحت مثالی تھی۔

ایک دن سپرنٹنڈنٹ جیل سے آمنا سامنا ہوا تو ماحول کی بے تکلّفی سے فائدہ اٹھا کر میں نے فرمائش کر دی کہ میں تختۂ دار دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگا: عجیب فرمائش ہے، آپ کو خوف نہیں آتا؟ میں نے کہا کہ مجھے صرف اللہ کا خوف ہے اور بس! وہ مجھے ساتھ لے کر پھانسی گھاٹ پہنچ گیا۔

میں نے کہا: تختے پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔

حیران ہو کر کہنے لگا: کیا کہہ رہے ہو؟ کتنے بے خوف ہو۔

اس کی اجازت سے میں تختے پر کھڑا ہو گیا۔

میں نے آنکھیں بند کیں، ہاتھ پیچھے باندھے اور یہ تصور کیا کہ مجھے پھانسی دی جا رہی ہے۔

فرماتے: بیٹا!

الحمد للہ، دل و دماغ کو پُرسکون اور مطمئن پایا۔ اگر یہ منزل بھی آ گئی تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے نہایت آسانی سے گزر جاؤں گا۔ اَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ والی آیت کا فیض حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اُس دن مجھے بھی حاصل ہوا۔

میں تختۂ دار سے نیچے اترا تو سپرنٹنڈنٹ جیل حیرت کی تصویر بنا مجھے دیکھ رہا تھا۔

کہنے لگا: یہاں تو بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے، یہ آپ کیا کر رہے تھے؟

میں نے کہا: اللہ حیی و قیوم کی ذات پر اپنا ایمان تول رہا تھا۔

حضرت رائے پوریؒ کی توجہات:

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کے بھتیجے اور خلیفۂ مجاز حضرت مولانا عبدالجلیل رحمتہ اللہ علیہ نے عزیزم کفیل احمد سلمہ سے ایک ملاقات میں فرمایا کہ:

جن دنوں حضرت امیر شریعت پر سرسکندر حیات کا بنوایا ہوا مقدمۂ بغاوت چل رہا تھا، حضرتِ اقدس رائے پوریؒ کی دعائیں اور توجہات پوری طرح شاہ صاحب کے ساتھ تھیں۔ ایک مجلس میں کسی نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حضرت! اس مقدمہ میں شاہ صاحب کو پھانسی کی سزا ہو سکتی ہے۔

حضرت اقدس رائے پوری نے بڑے پُر جلال انداز میں فرمایا:

''اجی، کون شاہ صاحب کو پھانسی دے سکتا ہے۔ انھیں پھانسی کی سزا نہیں ہو سکتی۔

حضرت مولانا احمد خان رحمتہ اللہ علیہ:

اسی مقدمے کے دوران خانقاہ سراجیہ کندیاں والے حضرت مولانا احمد خان رحمتہ اللہ علیہ کو جب ابا جی نے دعا کے لیے پیغام بھیجا تو انھوں نے وظیفہ پڑھنے کے لیے بتایا اور ساتھ فرمایا:

''جے میں ول ہوندا تے میرا اک رات دا کم سی، شاہ جی نوں آکھو تن راتاں پڑھن تے ہوئے گا تماشا۔'' (میری طبیعت اچھی ہوتی تو یہ میرے لیے بس ایک ہی رات کا کام تھا۔ شاہ جی سے کہو تین راتیں یہ پڑھ لیں۔ پھر تماشا ہوگا)

پھر تماشا ہی ہوا کہ سرکاری رپورٹر لدھا رام نے ہی جعلی تحریر کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

ابا جی فرمایا کرتے تھے:

''میں بیٹھا پڑھ رہا تھا، آنکھیں بند کیں تو تلوار چلتی دیکھی۔''

حضرت مولانا احمد خان رحمہ اللہ نے ایک بڑا عجیب تحفہ بھی عنایت فرمایا تھا، جب رہائی کے بعد انہیں ملنے گئے تھے۔ لکڑی کی ایک صندوقچی، جس پر سنہرے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔

اس کے اندر نمدا لگا کر چائے دانی اور دودھ دان وغیرہ رکھنے کے خانے بنے ہوئے تھے۔ چائے بنا کر اس میں رکھ لی جائے تو کئی گھنٹے گرم رہے۔ ابا جی نے تبرکاً رکھ دی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں جہاں سب کچھ گیا ساتھ وہ بھی گئی۔

عجیب قصہ:

ابا جی، ایک اور بڑا عجیب قصہ بیان فرماتے تھے کہ:

حضرت کے ایک صاحبزادے جواں سال فوت ہوگئے تھے۔ میں جب ملنے گیا تو حضرت مولانا احمد خان علیہ الرحمتہ کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے صرف اتنا خیال آیا کہ جوان بیوہ بے چاری کیسے زندگی گزارے گی۔ جب نماز ختم ہوگئی تو حضرت رحمہ اللہ نے کسی خادم سے فرمایا کتب خانہ میں جاؤ اور فلاں کتاب نکال لاؤ۔ خادم گیا اور مطلوبہ کتاب حاضر کر دی۔ اس خلاف معمول عمل پر سب حیران تھے۔ مجلس میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ (سرگودھا والے) اور ان کے چچا حضرت مولانا احمد الدین صاحب گنجیالویؒ بھی شریک تھے۔ حضرت نے کسی سے فرمایا کہ فلاں صفحہ سے پڑھو۔

''قصہ یہ تھا کہ کسی جہاد میں ایک مجاہد شہید ہوگیا۔ بیوہ جوان تھی، بچے بھی تھے۔ محنت مشقّت کر کے گزارا کرتی تھی۔ پھر اس کے متعلّق یہ مشہور ہوا کہ وہ کھاتی پیتی کچھ نہیں۔ ہوتے ہوتے یہ بات خلیفۂ وقت تک پہنچی تو اسے دربار شاہی میں طلب کیا گیا اور سوال کیا گیا کہ کیا واقعی تم غذا نہیں کھاتیں؟ اس نے کہا خاوند کی شہادت کے بعد اکثر روتی تھی۔ ایک رات خواب دیکھا کہ بہت خوبصورت باغ ہے۔ اس کے اندر سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرے خاوند کی آواز بھی تھی۔ میں سن کر اندر چلی گئی تو میرا خاوند کچھ کھا رہا تھا۔ اس نے اپنے رفیقوں سے کہا اگر تم اجازت دو تو یہ میری بیوی ہے، اس کھانے میں سے میں اسے کچھ دے دوں۔ انھوں نے اجازت دے دی تو میرے خاوند نے ایک ٹکڑا میرے ہاتھ پر رکھ دیا، وہ میں نے کھایا۔ شہد سے زیادہ میٹھا اور دودھ سے زیادہ سفید تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو اس کھانے کا ذائقہ میرے منہ میں تھا۔ اس کے بعد سے نہ مجھے بھوک ہے نہ پیاس۔ پیٹ کمر کے ساتھ لگ چکا ہے اور سہارے کے لیے کمر پر کپڑا باندھے رکھتی ہوں!''

ابا جی فرماتے میں سمجھ گیا کہ یہ میری اصلاح ہو رہی ہے۔ میرے دل میں جو اِن کے گھر کے متعلّق خیال آیا۔ قصہ ختم ہوا تو میں نے کہا حضرت ایک اور مسئلہ بھی حل ہوگیا ''حیاتِ مسیح کا''۔ کئی لوگوں کو بہت فکر ہے کہ وہ آسمانوں پر کھاتے کیا ہیں۔ حاضرین حیران تھے کہ پہلے کونسا مسئلہ تھا کہ اب دوسرا حل ہوگیا۔ مولانا احمد الدین حیاتِ مسیح کی بات سن کر بے اختیار کہہ اٹھے: ''شاہ ایہہ تیرا فیض اے''۔ فرماتے تھے بعد میں، میں نے مفتی محمد شفیع صاحب کو بتایا کہ میرے دل میں بس اتنا خیال گزرا تھا کہ بے چاری بیوہ کیسے گزارا کرے گی۔ مولانا احمد الدین صاحب شگفتہ مزاج بزرگ تھے۔ ابا جی فرماتے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتے، چائے کا انکار ''متفق علیہ کفر ہے'' مطلب تھا ابا جی اور مولانا خود!

ایک بڑھیا کی دعا:

جب سر سکندر حیات والے کیس سے ۱۹۴۰ء میں رہا ہو کر پھر سے دورے شروع کیے تو ضلع جہلم یا گجرات کے کسی گاؤں میں تقریر سے فارغ ہو کر قیام گاہ پر جانے لگے۔ اتنے میں لوگوں نے کہا' ایک مائی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ ایک ضعیف عورت تھی۔ ابا جی کارکنوں کے جلو میں آگے بڑھے تو اس بوڑھی عورت نے کہا:

''کیہڑا اے عطاء اللہ؟'' (کون ہے تم میں عطاء اللہ؟)

ابا جی نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا:

''اماں! میں ہوں عطاء اللہ''

اُس نے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار دیا اور کہا:

''میں نے تمہاری رہائی کے لیے سو نفل پڑھے اور ہر نماز کے بعد دعا کی۔''

ابا جی نے پوچھا:

''اماں! آپ نے مجھے کبھی دیکھا تھا یا میری تقریر سنی تھی؟''

اماں بولی:

''نہ تینوں ویکھیا تے ناں کدی تیری تقریر سنی۔ میں کہیا حق سچ آکھن والا بندہ اے' پھاہے نہ ای لگے تے چنگا اے۔'' (نہ تجھے دیکھا نہ تیری تقریر سنی' میں نے کہا حق گو بندہ' پھانسی نہ لگے)۔

ابا جی فرمایا کرتے:

''اللہ تعالیٰ نے مصیبتوں سے میری نجات اور حفاظت کے لیے ایسی کتنی ہستیوں کو میرے حق میں دعا کی توفیق عطاء کر رکھی ہے۔ اور میں انہی کی دعاؤں کے نتیجے میں مشکلات و مصائب کی گھاٹیوں کو عبور کرتا رہا ہوں۔''

مقروض کا ہدیہ:

اب کہ ان کو دنیا سے رخصت ہوئے (۱۹۶۱ء۔۲۰۰۸ء) سینتالیس برس ہو رہے ہیں۔ بھائی عطاء المحسن نوراللہ مرقدہٗ کے انتقال (۱۲رنومبر ۱۹۹۹ء) پر دو خواتین میلسی سے میرے پاس تعزیت کے لیے آئیں۔ کبھی پہلے نہ آئی تھیں۔ کہنے لگیں ہم چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ''سائیں'' میلسی آئے تھے۔ ہمارے ابا اور چچا بیعت ہوئے اور کچھ کھجوریں ہدیہ کیں۔ انھوں نے پوچھا تم پر قرضہ تو نہیں؟ ایک بھائی پر قرض تھا اس کا ہدیہ قبول نہ کیا اور فرمایا کہ جب تم خود مقروض ہو تو یہ خرچ کیوں کیا؟ جب قرض اتار لو گے تو پھر ہدیہ لے لوں گا۔ اب بھی ملتان، جھنگ، ڈیرہ غازیخان، مظفّر گڑھ، جتوئی، شہر سلطان، خان گڑھ، بہاولپور، رحیم یار خان، بہاولپور گھلواں، شجاع آباد اور جلال پور پیروالہ کے مضافات میں تلاش کیا جائے تو کوئی نہ کوئی بوڑھا ان کو یاد کر کے روتا ہوا مل جائے گا۔

قناعت واستغنا:

میرے ابا جی تو جس دن دنیا سے رخصت ہو کر اللہ کے ہاں حاضر ہوئے۔ ایک پیسہ بھی جیب میں نہیں تھا۔ جو کچھ آتا اسی وقت اماں جی کے سپرد کر دیتے۔ لیکن ہمیں کفایت شعاری سے چلنے کی تلقین بھی فرماتے۔ فضول خرچی پر ناراض بھی ہوتے۔ ہمیں انھوں نے اچھے سے اچھا بھی کھلایا اور دال روٹی بھی۔ اجتماعی زندگی میں آنے سے پہلے انھوں نے محنت مزدوری کی۔ بنارس میں ورق سازی بھی کرتے رہے۔ اُن کا ذریعہ معاش اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل تھا اور اس معاملے میں اللہ نے انھیں کبھی پریشان نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے کبھی روپے پیسے نہیں گنے اور نہ کبھی مال کو بچا کر رکھا۔ اللہ کی جو نعمت آتی اُسے خرچ کر دیتے۔ فرماتے جس اللہ نے آج رزق بھیجا ہے، کل بھی دے گا۔ اللہ پر اُن کا یقین کامل تھا۔ جائیداد انھوں نے نہیں بنائی اور دولت اکٹھّی نہیں کی۔ پھر اللہ

تعالیٰ نے اُن کی ہر ضرورت پوری کی۔ وہ متوکل علی اللہ بھی تھے اور اللہ کے ذاکر شاکر بندے بھی۔

لباس:

انھوں نے جوانی میں کھدر پہننا شروع کیا۔ سردی گرمی کھدّر کا سوٹ پہنتے۔ آرام کے وقت تہبند۔ موسم گرما میں تہبند قمیص پہن کر بھی سفر پر چلے جاتے۔ لیکن جب فالج اور شوگر نے نڈھال کردیا تو پھر اماں جی کے کہنے پر ململ کے کرتے پہن لیتے۔ اماں جی خود بھی سیتی رہیں اور آخری برسوں میں محلّہ ٹبی شیر خاں ملتان ہی میں مقیم لدھیانہ کے مہاجر ٹیلر ماسٹر محمد ابراہیم صاحب مرحوم، جن کا لدھیانہ کے علماء کے خاندان سے بھی گہرا دوستانہ تعلّق تھا' ابا جی کے خصوصی درزی رہے۔ نئے کپڑے سینے اور پرانوں کی مرمت کا کام انہی سے لیتے اور وہ بڑے شوق سے ان کے حسبِ منشا سی دیتے۔

اولاد کی تعلیم:

ان کی زندگی کا محور اوّل و آخر دین تھا۔ سب بھائیوں کو قرآن پاک حفظ کرایا، علوم دینیہ کی ہی تحصیل پر لگایا۔ اور انہیں عالمِ دین بنایا۔ انگریزی بحیثیت زبان سیکھنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ خود انھوں نے جیل میں معروف سیاسی رہنما بیرسٹر آصف علی سے انگریزی پڑھی اور آصف علی نے ان سے ترجمہ قرآن کریم پڑھا۔ تار وغیرہ آتی تو خود ہی پڑھ لیتے۔ کبھی انگریزی اخبار کا مطالعہ بھی کرلیا کرتے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے زمانۂ اسیری میں انھیں صرف انگریزی اخبار ''ڈان'' (DAWN) مطالعے کے لیے ملتا۔ وہ ایک سال جیل میں ''ڈان'' ہی پڑھتے رہے۔ بھائی جان سید ابوذر بخاریؒ اور بھائی سید عطاء المحسن بخاریؒ انگریزی زبان سے کافی شُد بُد رکھتے تھے۔ بعض کتابیں اُن کے مطالعہ میں رہیں۔ انگریزی اخبار بھی پڑھ لیتے تھے۔ بھائی عطاء المحسن کو ویسے بھی مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق تھا۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ بنگالی بھی سیکھتا رہا۔ اس کا انگریزی تلفّظ بہت عمدہ تھا۔ وہ ایسی تعلیم کے آخری درجے کے مخالف تھے جو انسان کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے بیگانہ کردے۔ عقائد و اعمال، اخلاقیات اور دینی اقدار کو تباہ کردے۔ ہاں کلرکی کے لیے میٹرک، ایف اے، بی اے اولاد کو نہیں کرایا۔

اولاد سے محبّت:

میری خوش نصیبی کہ مجھ پر بھائیوں سے زیادہ شفقت فرماتے ۔ مجھے کبھی یہ زعم نہیں ہوا کہ اس میں میری کسی خوبی کا دخل تھا۔ مجھ سے چھوٹا بھائی عطاء المحسن نوراللہ مرقدہٗ بتایا کرتا تھا کہ آخری علالت کے دنوں میں (مارچ ۱۹۶۱ء) جب نشتر ہسپتال ملتان میں داخل تھے اور وہ دن رات پاس ہوتا تھا' ایک دن اس نے پوچھا ہم سب میں سے آپ کو سب سے زیادہ پیار کس سے ہے؟ فرمانے لگے بارہ آنے تمہاری بہن سے اور چار آنے تم چاروں سے ۔مرحوم اکثر مذاق میں مجھے کہا کرتا ۔''ایہہ بارہ آنے نیں۔'' (یہ بارہ آنے ہیں)۔شاید چار بیٹیاں فوت ہوگئی تھیں' اس لیے مجھ سے زیادہ پیار تھا۔

جھوٹے اور چور سے نفرت:

جھوٹ اور بددیانتی ان کی برداشت سے باہر کے معاملات تھے۔فرماتے جھوٹے اور چور کے ساتھ میرا نباہ نہیں ہوسکتا۔ایک ایمان کا دشمن اور دوسرا مال کا۔ بچپن میں ہم میں سے کوئی جھوٹ بولتا تو ان کی ناراضی سے بچ نہیں سکتا تھا، جب تک سچ اگلوا نہ لیتے چھوڑتے نہیں تھے۔ محبّت بھی ٹوٹ کر کرتے اور غصہ بھی شدید ہوتا:

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

کے مصداق تھے۔

خطابت میں ان کا مقام:

خطیبانہ مقام کے متعلّق میری رائے کیا وقعت رکھتی ہے۔سیاسیات پر بولے تو مولانا ابوالکلام آزاد تک نے داد دی اور دینی معاملات پر تو علامہ انور شاہ اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ تک نے دعائیں دیں۔مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے لکھا ہے کہ ڈابھیل میں ہندوؤں، سکھوں سے اللہ اکبر کے نعرے لگوائے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ زاروقطار روتے رہے' جو خود اردو،عربی دونوں کے اعلیٰ ترین خطیب تھے۔ابا جی ختم نبوت پر اپنی تقاریر کو وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔ مجھے اتنا پتا ہے کہ

جس اجتماع میں وہ ہمیں ساتھ لے جاتے' ہم زنانہ کیمپ میں ہی ہوتی تھیں ۔ دیگر مقررین کی تقریر کے دوران مجھے نیند آتی رہتی ۔لیکن جیسے ہی ابا جی لاؤڈ سپیکر کے سامنے آکر ''الحمدللہ'' کہتے، نیند فوراً کافور ہو جاتی ۔ جیسے رات بھر سولیا ہے اور اب صبح ہو رہی ہے۔

مولانا شیخ احمد شہید اور قاری لطف اللہ شہید:

ہمیں ہمیشہ حکم ہوتا ۔ بیٹا ! اپنے سے اونچے کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے ۔ اپنے سے نیچے کی طرف دیکھو۔ کہیں جاتے تو میزبان کی حیثیت کو مدنظر رکھتے ۔ بورے والا میں مولانا شیخ احمد مرحوم ومغفور ہوا کرتے تھے ۔ وہ اور جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے قاری لطف اللہ صاحب اکٹھے بس کے حادثہ میں شہید ہو گئے تھے ۔ دونوں حضرات ابا جی سے گہری محبّت رکھتے تھے ۔ مولانا شیخ احمد صاحب کی اہلیہ مجھے خیرالمدارس ملتان میں قیام کے دوران سالانہ جلسے پر ملتیں اور متعدد بار انھوں نے بڑی مسرت سے یہ بات بتائی کہ شاہ جی کو میرے ہاتھ کی پکی ہوئی مسور کی دال بہت پسند تھی ۔ جب آتے فرمائش کر کے پکواتے کہ بہن کے ہاتھ کی دال بڑی مزیدار ہوتی ہے ۔ میں دل میں محظوظ ہوتے ہوئے ہر بار سن لیتی ۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ مولانا ایک متوکل درویش آدمی تھے ۔ ابا جی اپنی پر تکلّف تواضع کا بوجھ اُن پر نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اُن کا یہ سلوک سب کے ساتھ یکساں تھا۔

اماں جی کی علالت اور صبر:

امّاں جی مصائب وحوادث کو صبر واستقامت سے برداشت کرتی تھیں ۔ ابا جی کی سراپا تحریکی، جہادی اور قید وبند کی زندگی کی وجہ سے انھوں نے بہت تکالیف اٹھائیں ۔ انھوں نے آن پر تو حرف نہ آنے دیا لیکن جان پر بن گئی ۔ ۱۹۲۱ء میں جب ابا جی پہلی بار تحریکِ خلافت میں قید ہوئے وہ تقریباً ۱۶ برس کی تھیں ۔ ۱۹۳۴ء میں انہیں ہلکا بخار رہنے لگا اور ایک آدھ بار تھوک میں خون بھی آیا۔ ڈاکٹروں نے ٹی بی کا شک ڈال دیا:

ع ...... ''رگ وپے میں جب اترا زہرِ غم تب اور کیا ہوتا ؟''

مسوری کی یادیں:

امرتسر میں ہمارے خاندانی معالج جناب حکیم ظہیرالدین صہبائی کشمیری تھے ۔ حاذق طبیب اور کلّے ٹھلے اور بودوباش سے کسی ریاست کے نواب دکھائی دیتے ۔ ابا جی سے لے کر ہم

بہن بھائیوں تک سب انہیں چچا کہتے تھے۔ابا جی تو اس لیے کہتے کہ عمر میں بڑے تھے اور ان کے رشتہ کے چچا سید محمد مقیم شاہ صاحب مرحوم کے کلاس فیلو بھی تھے۔ انھوں نے اماں جی کا علاج شروع کیا اور ساتھ مشورہ دیا کہ موسم گرما میں ہمشیر صاحبہ کو پنجاب میں نہ رکھا جائے، کسی صحت افزاء مقام پر لے جایا جائے۔ وہ ''ڈلہوزی'' دیکھنے گئے لیکن پسند نہ کیا اور ''کوہ مسوری'' کی آب و ہوا کو اماں جی کی بحالیٔ صحت کے لیے مناسب بتایا تو ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۷ء چار سال تک موسم گرما میں' ابا جی ہم سب کو مسوری (صوبہ یوپی) لے جاتے اور ہمیں وہاں چھوڑ کر خود ہندوستان کے تپتے میدانوں میں تقاریر کے لیے تبلیغی جلسوں میں چلے جاتے۔ کچھ وقت ہمارے ساتھ مسوری میں بھی گزار لیتے۔ ہمارے پاس ماموں جی کو چھوڑ آتے۔ ابا جی' ان معنوں میں ''عالم'' نہ تھے کہ عورتوں کو چار دیواری میں ہی قید رکھیں۔ ہاں تماشا گاہِ عالم بن کر نکلنے کی نہ دین اجازت دیتا ہے نہ ان کی غیرت کو گوارا تھا۔ مسوری میں' چچا ظہیر صاحب کی تدبیر و علاج سے اللہ تعالیٰ نے فضل فرما دیا اور اماں جی کو ساری عمر پھر یہ شکایت نہ ہوئی۔ چچا کافی دن ساتھ مقیم رہے۔ میں تو بہت چھوٹی تھی' اماں جی بتایا کرتی تھیں' مسوری میں موسم خنک ہوا تو نسبتاً کم بلندی پر واقع قصبہ راجپورہ میں لے آئے۔ کوئی کشتہ بھی بنا کر کھلایا۔ پتا نہیں اب ایسے معالج کہاں پائے جاتے ہیں؟ اہل مسوری، دہرہ دون اور راج پورہ کی مہمان نوازیوں کے تذکرے اور تعریفیں آخر تک والدین فرماتے رہے اور ہمیں بتاتے رہے۔ روزانہ کسی ایک گھر سے کھانا آجاتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ احباب مسوری نے باہمی مشاورت سے طے کیا کہ روزانہ ایک گھر سے کھانا تیار کر کے شاہ جی کو پہنچایا جائے۔ اُن سب پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

بات سے بات یاد آتی ہے۔ حکیم ظہیر الدین صہبائی کا ذکر آیا تو یاد آیا کہ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کا ایک شعر ابا جی سے ہی سنا تھا' اور آج تک یاد ہے کہ:

یہ رشکِ بد بلا ہے' دمِ رخصتِ حبیب
کیسے کہوں خدا ہے نگہبان جائیے

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمہ اللہ:

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمہ اللہ کو ابا جی ہمیشہ بھائی حبیب الرحمٰن کہتے ۔وہ مجلس احرار اسلام ہند کے بانیوں میں تھے ۔اور کم وبیش دس سال اُس کے صدر رہے ۔لدھیانہ کے ایک مجاہد، بہادر اور غیرت مند علماء کے گھرانے کے فردِ فرید تھے ۔رعب دار آواز، لہجے میں دبدبہ اور طبیعت جلالی تھی۔ جب ابا جی ہمیں مسوری لے جاتے تو مولانا لدھیانوی بحیثیت صدر مجلس احرار ہند ابا جی کو پنجاب کے دوروں پر بھیج دیتے اور اپنے بیٹے، بھائی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کو ہمارے پاس چھوڑ آتے ۔تب ایک بار کافی دن مسوری میں وہ ہمارے پاس مقیم رہے۔تقسیم کے بعد وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے تعلیمی مرکز''احاطہ کالے صاحب'' کے منتظم بن گئے تھے'وہیں انتقال ہوا۔

ایک یادگار تقریب:

یہ بھی انہی دنوں (غالباً ۱۹۳۵ء) کی بات ہے جب اماں جی کی بحالیٔ صحت کی خاطر ہم مسوری جایا کرتے ۔حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے ابا جی سے کہا کہ لدھیانہ کے ''براؤن ہسپتال'' میں خواتین کا بہترین علاج ہوتا ہے' بہن جی کو یہاں لے آئیں ۔انگلینڈ کی کوئی ڈاکٹر مس براؤن تھی جس نے ہسپتال بنایا تھا۔ چنانچہ اماں جی تقریباً ایک ماہ وہاں داخل رہیں ۔مولانا کے خاندان نے ہماری بہت خدمت کی ۔مولانا کے سب بچے اماں جی کو چچی کہتے تو اماں جی نے کہا کہ تمہارے والد صاحب مجھے ہمشیر کہتے ہیں ۔مجھے تم پھوپھی کہا کرو۔ان کے دوسرے نمبر والے صاحبزادے جناب مولوی عزیز الرحمٰن صاحب جو بعد میں جامعہ ملیہ کی نسبت سے جامعی کہلائے تب نوعمر تھے۔انھوں نے کہا کہ ہم ایک تقریب منعقد کر کے آپ کو پھوپھی بنائیں گے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں گھر کی سب خواتین اور اماں جی جمع تھیں ۔بھائی عزیز صاحب نے پہلے تقریر کی اور بعد میں جلیبیاں بانٹ کر پھوپھی بنانے کا اعلان کیا اور تا حیات پھوپھی کہتے رہے ۔محبّت واپنائیت کا یہ ایک نرالا، انوکھا اور منفرد اظہار تھا۔جس کی یاد آج بھی دل پر نقش ہے۔

انوکھا پیار:

قیام پاکستان کے بعد جب ہم لوگ ترکِ سکونت کر کے ملتان آئے ۔ یہاں ایک بار ابا جی فرمانے لگے کہ:

''میں نے ساری زندگی میں تمہیں ایک بار طمانچہ مارا تھا۔مسوری میں تو زمین پر لیٹی ہوئی تھی،اٹھتی نہ تھی۔''

میں کہہ بیٹھی کہ نہیں ابا جی ایک تھپّڑ اور بھی ہے'اور بیر خریدنے کا قصہ سنایا۔(جو''بچپن کا پہلا واقعہ'' کے زیرِعنوان شروع میں آچکا ہے)۔ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔فرمانے لگے۔''مجھے معاف کر دو!تم نے اب تک یاد رکھا ہوا ہے''؟میں نے عرض کیا!نہیں ابا جی ! کبھی پٹتی جو نہ تھی اس لیے یاد رہ گیا ہے عمداً تو یاد نہیں رکھا! اللہ کی رحمتیں بارش کی طرح ان کے مرقد پر برسیں!

مسوری میں ہمارا قیام جس گھر میں تھا'اس کے سامنے بازار تھا۔ایک دن کھیلتے کھیلتے میں گھر کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی ۔ایک انگریز عورت سامنے کھڑی تھی'مجھے دیکھ کر میری طرف بڑھی۔ مجھے پیار کیا اور پھر مجھے اپنے گھر لے گئی ۔ادھر میری تلاش شروع ہوگئی ۔ابا جی اور اماں جی سخت پریشان تھے۔کچھ دیر بعد وہ مجھے لے کر واپس گھر پہنچی تو دیکھتے ہی ابا جی نے مجھے سینے سے لگا لیا اور پیار کیا۔پھر انگریز خاتون سے کہا:

''تم نے یہ کیا کیا؟تمہیں ہماری پریشانی کا اندازہ ہے''؟

اس نے کہا:

''میری بچی جو شکل وصورت میں بالکل ایسی ہی تھی'عرصہ ہوا انتقال کر چکی ہے۔ مجھے آپ کی بچی بہت بھلی لگی ۔آپ کی اطلاع اور اجازت کے بغیر اسے اپنے گھر لے گئی۔ مجھے معاف کر دیں۔''پھر کہا:''کیا اتنی اجازت دیں گے کہ میں کبھی کبھی اسے اپنے گھر لے جایا کروں۔''

ابا جی نے کہا:

''تم ماں ہوں ۔میری بچی کے دیکھنے سے تمہیں سکون ملے' مجھے خوشی ہوگی ۔لیکن یہ دیکھنا کہ اس کی مریض ماں بھی اسی کے سہارے زندہ ہے۔''

اُس انگریز خاتون کے گھر دوبارہ جانا یاد نہیں مگر جب وہ مسوری سے واپس جانے لگی تو بلیوں کا ایک نہایت خوبصورت جوڑا میرے لیے تحفہ بھجوایا۔

مسوری ہی کا ایک اور واقعہ چند دفعہ انھوں نے دہرایا اور ہر بار آبدیدہ ہو جاتے ۔ ہوا

یوں کہ ایک دن سیر کے لیے نکلے تو مجھے گود میں لیا ہوا تھا۔ ڈھلوان سے نیچے اترتے ہوئے پاؤں پھسل گیا۔ ابا جی منہ کے بل گرے مگر مجھے بچانے کی کوشش کی۔ میں گری تو سہی لیکن صرف ان کے ہاتھ کا بوجھ مجھ پر آیا۔ فرماتے تم نے اٹھ کر یہ نہیں کہا کہ مجھے چوٹ لگی بلکہ ماں کو شاگردوں کی پیروی میں کہا! ''بیوی جی! شاہ جی ڈِگ پئے، شاہ جی نوں سَٹ لگی اے'' (بی بی جی! شاہ جی گر گئے، شاہ جی کو چوٹ آئی ہے)۔

کشمیر میں قیام:

کشمیر میں ہجرت کر کے آنے والے ہمارے مورث اعلیٰ سید عبدالغفار بخاری رحمہ اللہ تھے جو سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانے میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔ منشی محمد دین فوق مرحوم نے ''تاریخ اقوام کشمیر'' میں پوری تفصیل دی ہے۔ پہلے انھوں نے غلط فہمی میں ہمارا سلسلۂ نسب جلال پور جٹاں کے سید حبیب اور سید عنایت صاحبان کے ساتھ جوڑ دیا پھر ماموں جان مرحوم سید عبدالحمید شاہ صاحب نے ان کو اصل شجرہ کی نقل مہیا کی تو انھوں نے تصحیح کر دی۔ والدین ماجدین رحمہم اللہ بتایا کرتے تھے کہ ان کے شعور کی عمر تک کئی رشتے ناتے کشمیر ہی میں خاندان کی دوسری شاخ میں ہوتے رہے، بعد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کشمیر کا ذکر بہر حال گھر میں ہوتا اور تحریک کشمیر کے حوالے سے خصوصاً ہوتا۔ ابا جی کے ننھیال بھی کشمیر سے ہی کسی زمانے میں ہجرت کر کے پٹنہ جا بسے تھے۔ بلکہ اس زمانے کے ہمارے بزرگوں نے ناگڑیاں (تحصیل کھاریاں ضلع گجرات) میں ان کی دعوت کی تھی۔ اور تعلّقات کا آغاز یہیں سے ہوا تھا۔

۱۹۴۵ء میں ایک دن ابا جی گھر پر تھے یعنی ہمارے لیے ''عید'' کا دن تھا۔ اماں جی اور ہم بہن بھائی بیٹھک میں ان کے پاس بیٹھے تھے کہ اماں جی کہنے لگیں۔ اب بڑوں کا وطن کشمیر ایک دفعہ تو دکھلا ہی دیں۔ اس وقت کچھ زیادہ بات نہیں ہوئی۔ امرتسر میں کشمیر کے ایک نیک نہاد خاندان کے فرد جناب مولوی محمد سعید صاحب مرحوم رہتے تھے۔ وہ بچپن میں پڑھنے کے لیے امرتسر آئے۔ پڑھتے بھی تھے اور محلے کی مسجد میں امام بھی تھے۔ بالکل نوعمر تھے کہ تحریک کشمیر (۱۹۳۰ء) مجلس احرار کی طرف سے شروع ہوئی تو اس میں شریک ہوئے۔ پوری استقامت سے جیل کاٹی اور اس طرح ابا جی سے ناتا جڑ گیا۔ پھر ایسا جڑا کہ ابا جی کی زندگی میں ہی نہیں، اپنے آخری دم تک ابا جی

کے بعد بھی انھوں نے ہمارا گھر نہیں چھوڑا۔ ہر سال چھے ماہ بعد اماں جی کو سلام کرنے ملتان آتے اور چند دن رہتے۔ان کی آمد ہم سب کو ایک فرد خاندان کی آمد محسوس ہوتی۔ جب سفر کشمیر کا تذکرہ چھڑا تو چند دن بعد وہ ابا جی سے ملنے آئے۔ابا جی نے ان سے ذکر کیا۔انھوں نے زبردست تائید کی۔ بلکہ یوں کہا کہ میرے بڑے بھائی بھی عرصہ سے منتیں کر رہے ہیں کہ ہمیں اپنے بچے لا کر دکھاؤ۔اب اگر آپ چلیں گے تو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ان کے چھوٹے بھائی مولوی محمد یوسف بھی اس زمانے میں ان کی طرح غالباً مدرسہ نصرۃ الحق میں پڑھتے بھی تھے اور کسی چھوٹی مسجد میں امام بھی تھے۔مولوی صاحب نے انہیں کشمیر بھیجا کہ جا کر پہلے کسی مکان کا بندوبست کرو۔''پٹن'' ایک قصبہ ہے' بارہ مولا سے ۱۷ میل آگے اور سری نگر سے ۱۷ میل ادھر بالکل درمیان میں۔تب بھی سڑک پختہ تھی' اس سے متّصل تقریباً آدھ میل کے فاصلے پر مولوی صاحب کا چھوٹا سا گاؤں ''پوشوائیں'' تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ مولوی صاحب کے گھر کے سامنے ایک خوبصورت پلاٹ تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ابا جی نے مغرب کی نماز وہاں پڑھائی۔ایسی پر کیف فضا میں ان کی تلاوت نے ایک سماں پیدا کر دیا تھا۔پٹن میں ان کے بھائی نے اپنی صوابدید کے مطابق ایک پنجابی سکھ آبادکار کے مکان کی اوپر کی منزل کرایہ پر لے کر امرتسر اطلاع بھیجی کہ مکان مل گیا ہے آ جائیں۔ چند دن تیاری میں لگے۔ ماموں جی مرحوم ملازمت کی وجہ سے امرتسر ہمارے ہاں ہی رہائش رکھتے تھے' بلکہ ابا جی نے اصرار سے ان کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا کہ ان کے طویل دوروں کے دوران گھر میں کوئی مرد تو ہو۔مسوری تو وہ ایک دوبار ساتھ گئے لیکن اس دفعہ وہ گھر پر رہے۔ بھائی جان کو ابا جی نے جالندھر خط لکھا تو وہ مقررہ تاریخ سے کچھ روز قبل خصوصی طور پر سالانہ امتحان دے کر (خیر المدارس سے) گھر آ گئے۔اب دن، تاریخ تو یاد نہیں لیکن اسلامی مہینہ شعبان تھا۔انگریزی شاید جولائی ۱۹۴۵ء۔مولوی سعید صاحب اپنے ہاں سے بمع اہل وعیال اسٹیشن پہنچ گئے اور ہم سب اپنے ہاں سے۔ ماموں جان لاہور تک ہمارے ساتھ آئے۔

ابا جی کے پروگرام کا ان کے احباب کو علم تھا۔ دفتر سے کچھ کارکن انہیں ملنے آئے ہوئے تھے۔لاہور سے گاڑی تبدیل کی اور رات کسی وقت پنڈی پہنچے۔ راجہ بازار میں صوفی عنایت محمد صاحب پسروری مرحومؒ (احرار کے وفادار کارکن اور جوہر وسمہ مہندی کے موجد) کی

رہائش گاہ پر رات بسر کی۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں نے بارہا دیکھا کہ جب ابا جی کسی بات کا پختہ ارادہ کر لیتے تو پھر رحمت الٰہی راستے کی ہر مشکل آسان اور ہر کاوٹ دور کر دیتی تھی۔ کشمیر کے سفر کے سلسلہ میں کچھ روز متذبذب رہے' پھر مولوی سعید صاحب مرحوم کے کہنے سننے پر مکمّل آمادہ ہو گئے۔ پنڈی پہنچ کر ابا جی کا ارادہ ہوا کہ بجائے عام لاری پر سفر کرنے کے' پوری لاری کرایہ پر لے لی جائے۔صوفی صاحب مرحوم سے بھی مشورہ ہوا ہوگا۔ بہر حال صبح وہ خود لاریوں کے اڈہ پر تشریف لے گئے تو وہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان سے بھی خاندانی تعلّق نکلا۔ مری میں ''سنی بینک'' ہوا کرتا تھا۔اس کے مالک شیخ عبدالغنی، عبدالعزیز صاحبان وغیرہ مرحومین تھے۔ ان کے والد شیخ حسام الدین ہمارے گاؤں ناگڑیاں میں پٹواری رہے تھے۔ شیخ عبدالغنی اور اُن کے بھائی' اماں جی کی پھوپھی صاحبہ سے قرآن پاک پڑھے ہوئے تھے۔ان کو اللہ تعالیٰ نے بہت دولت دی لیکن وہ استاد گھرانے کو بھولے نہیں۔ ساٹھ برس پہلے کی بات' بغیر کسی نوشتے کے اب من وعن تو یاد نہیں۔ ان بھائیوں میں سے ہی کسی کے لڑکے شیخ منظور صاحب اور غالباً عبدالقدیر صاحب ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک تھے۔ابا جی کو دیکھا' تپاک سے ملے۔ابا جی نے مقصد آمد بتایا تو کہنے لگے لاری حاضر ہے۔ابا جی نے کرایہ طے کرنے کو کہا اور حسب مزاج شدید اصرار فرمایا لیکن انھوں نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ ابا جی لاری لے کر صوفی صاحب کے مکان پر آئے اور ہم سب بمع مولوی سعید صاحب عازم کشمیر ہوئے۔ راستے کے نظارے ہم سب بچوں کے لیے بہت بڑا سامان فرحت تھے۔ میں اور بھائی جان بڑے تھے' باقی سب چھوٹے تھے۔ وقت تو یاد نہیں' عشاء بہر حال ہو چکی تھی کہ ہم پٹن پہنچ گئے۔ مولوی صاحب کے بھائی رہائش گاہ کی تلاش صحیح نہ کر سکے تھے۔ دو پردہ دار کنبے اس گھر میں نہ رہ سکتے تھے۔ ایک بڑا کمرہ تھا' ملحق اور کیا تھا اب یاد نہیں۔ اس میں بھی سکھ مالک نے پیاز رکھے ہوئے تھے۔ ان کی بدبو اور پسوؤں کی یلغار' اونگھتے کھجلاتے رات بسر کی۔ ایسا یاد آتا ہے کہ ناشتہ مولوی صاحب کے بھائی' گھر سے لائے تھے۔ چائے پی کر ابا جی بہتر مکان کی تلاش میں نکلے۔ مولوی یوسف صاحب سے ایک دو دفعہ کہا سہی ''اوئے ایہہ مکان لبھیا ای'' (ارے' مکان یہی ڈھونڈا تم نے)؟ سڑک پر کچھ دور تک چلے تو چند دکانیں تھیں جن میں سے ایک پھلوں کی دکان پر شائستہ ومہذب مالک کو دیکھ کر سلام ومصافحہ ہوا۔

مولوی صاحب نے تعارف کرایا اور ابا جی نے کرایہ کے مکان کی تلاش میں مدد کے لیے کہا۔ مالک مکان خواجہ غلام محمد صاحب جالب نے جو پھلوں کے بڑے تاجر تھے' کہا کہ میرا مکان اس دکان کے اوپر خالی ہے' آپ تشریف لے آئیں۔ ابا جی نے کرایہ پوچھا تو کہنے لگے میں نے مکان کرایہ پر چڑھانے کے لیے نہیں بنایا' آپ کو کرایہ ضرور دینا ہے تو کوئی اور ڈھونڈ لیجئے۔ ابا جی نے مکان دیکھا' ہماری ضرورت کے لیے بالکل کافی تھا۔ واپس آئے اور دوپہر سے پہلے پہلے ہم نے ایک اچھے ٹھکانے پر منتقل ہوکر اطمینان کا سانس لیا۔ سیڑھیاں چڑھیں تو دو کمرے آمنے سامنے، درمیان میں راہداری، سڑک کی طرف چھجہ۔ عقب میں کھیت اور ادھر بھی چھجہ میں بیت الخلاء، کمرے سے ملحق غسل خانہ اور اس سے اوپر کی منزل پر ایک کمرہ۔ اس کمرہ میں مولوی صاحب کے بچے رہنے لگے۔ چند دن بعد وہ ددھیال چلے گئے۔ دھوپ کے وقت چھجہ پر بورے کی انگیٹھی پر کھانا پکتا اور سردی کے وقت کمرے میں۔ رمضان المبارک وہیں پٹن میں گزرا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ اور دیگر رہنماؤں کا جلوس:

ہمارے وہاں قیام کے دوران ''سوپور'' میں کشمیر نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس موقع پر جھیل ڈل میں کشتیوں کا جلوس بھی نکالا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ تو ویسے ہی بعد از رہائی' بحالیٔ صحت کے لیے سری نگر میں مقیم تھے۔ مولانا قلعہ احمد نگر میں تین سالہ نظر بندی کے بعد رہا ہوئے تھے۔ بھائی جان' مولوی سعید صاحب کے ہمراہ جا کر مولانا آزاد سے بھی مل آئے اور ایک نا دیدنی نظارا بھی کر آئے۔ مولانا آزادؒ کے لیے گالیوں اور نا قابل بیان گندی حرکتوں کا مظاہرہ' مسلم کانفرنس کی طرف سے ''منعقد'' کیا گیا۔ سیاسی چپقلش کا برا ہو' ان کی دینی عظمت کا بھی احترام نہ کیا گیا اور بہت برا سلوک کیا گیا۔ سوپور کو راستہ پٹن سے ہی جاتا تھا۔ اور خواجہ غلام محمد (مالک مکان) نیشنل کانفرنس کے رکن تھے۔ انھوں نے دکان کے سامنے استقبالی دروازہ بنایا اور ہر رہنما کا استقبال پھولوں سے کیا۔ جو لوگ گزرے ان میں پنڈت جواہر لال نہرو، عبدالغفار خان، قاضی عطاء اللہ جان (سابق وزیر تعلیم سرحد)، میاں افتخار الدین، شیخ محمد عبداللہ اور مرزا افضل بیگ یاد ہیں۔ مولوی محمد سعید مسعودی مرحوم اور پنڈت جواہر لعل نہرو، میاں افتخار الدین کی کار میں تھے۔ مولوی سعید صاحب نے ہاتھ ملانے کے بعد ابا جی کا نام لیا کہ وہ بھی یہاں

ہیں ۔ پنڈت نہرو نے کہا' اچھا شاہ صاحب یہاں ہیں؟ مولوی صاحب ابا جی کو بلا کر لے گئے ۔ بڑے تپاک سے مصافحہ کے بعد کہنے لگے: چلیے ''سوپور'' ۔ ابا جی نے کہا سوچ رہا ہوں ۔ جلسہ کا آخری دن تھا۔ پنڈت جی کہنے لگے ابھی آپ سوچ رہے ہیں؟ میاں افتخار بولے کار حاضر ہے' تشریف رکھیئے۔ ابا جی نے کہا' آپ کے جانے کے بعد سوچوں گا ۔ بعد میں بھی وہ جلسہ میں نہ گئے ۔ بچوں میں بھائی عطاء المحسن بھی کھڑا تھا۔ پنڈت نہرو سب سے خوش دلی سے مصافحہ کر رہے تھے ۔ ابا جی نے بھائی کی طرف اشارہ کر کے مسکراتے ہوئے کہا ''یہ میری ایک یادگار ہے ۔'' پنڈت جی نے بھائی سے بھی ہاتھ ملایا اور گلے سے ایک ہار اتار کر بھائی کے گلے میں ڈال دیا۔

کشمیر میں رمضان اور عید:

خواجہ غلام محمد کے گھر کے ساتھ کھیتوں کی طرف چھوٹی سی مسجد بھی تھی ۔ رمضان شروع ہوا تو ان کی حسب خواہش بھائی جان نے وہاں تراویح میں قرآن پاک سنانا شروع کیا ۔ مولوی سعید صاحب کا بڑا لڑکا حافظ محمد اسلم مرحوم تب دس گیارہ برس کا تھا' حفظ کر چکا تھا۔ بھائی جان کا استاد بھائی تھا۔ حضرت قاری کریم بخش صاحب رامپوری رحمۃ اللہ علیہ کا وہ بھی شاگرد تھا اور بھائی جان بھی ۔ اسلم ہی بھائی جان کا سامع بنا۔ خواجہ صاحب کہتے تھے جب سے قرآن نازل ہوا' یہ پہلا رمضان ہے جس میں یہاں تراویح میں پورا قرآن پڑھا گیا ۔ سادہ لوح کشمیری بھائی ذوق وشوق سے سنتے رہے۔ ایک عجیب رواج دیکھا۔ مرد تو مسجد چلے جاتے اور عورتیں اکٹھی ہو کر گیت گاتیں۔ اللہ جانے نعتیں پڑھتیں یا کیا۔ کشمیری ہمیں کونسی سمجھ آتی تھی۔ دو تین دن بعد ابا جی نے قصبہ کے عمائدین خواجہ صاحب، غلام قادر صاحب نمبردار وغیرہ کو بلا کر اس رسم کی قباحت سمجھائی اور عورتوں کو منع کرنے کے لیے کہا۔ ابا جی کے سمجھانے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور پھر پورا رمضان کبھی کہیں سے عورتوں کی آواز نہیں سنی ۔ سحر کے وقت گھڑی الارم تو بولتا ہی تھا۔ کوئی بندۂ خدا وہاں تھا جسے خدا نے بڑی بلند آواز عطا کی تھی' وہ سڑک پر کھڑا ہو کر پوری قوت سے کہتا تھا...... ''وقت سحر جاگو!'' اور دور دور تک اس کی آواز سنی جاتی ۔

کشمیریوں کی غربت میں مہمان نوازی:

کشمیری لوگ چاول ہی دونوں وقت کھاتے اور حیرت ہوتی تھی ۔ سڑک کے پار سامنے بے چارے غریب لوگوں کے گھر تھے ۔ دونوں وقت خواتین پتھر کے بڑے بڑے کونڈوں

میں کھڑے ہو کر دھان چھڑتی تھیں اور جھٹ پٹ چاول نکال کر چھان پھٹک کر ابال لیتی تھیں۔ حقیقت ہے کہ غربت کے ہاتھوں مجبور گھرانے' پیاز نمک مرچ کا مسالہ بھون کر' اس میں چاولوں سے نکلی ہوئی پیچ ڈال کر شوربہ بنا لیتے تھے اور اسی سے ابلے چاول کھا لیتے۔ معمر لوگ کہتے' کوئی زمانہ تھا ہم ناشپاتیاں اور سیب کاٹ کر اپنی گائیوں کو کھلاتے اور آج ہمیں خود میسر نہیں۔ ظلم کی انتہا تھی کہ چنار کا درخت خواہ کسی کے ذاتی مکان میں اُگ آئے وہ سرکار کی ملکیت ہے۔ سرکاری حکم کے مطابق مالک مکان اس کی لکڑی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ جو بھی درخت کاٹتا' چوری چھپے کاٹتا۔ لیکن غریب سے غریب کشمیری مہمان نوازی کو فرض سمجھتا تھا۔ دو غریب عورتیں کسی کسی دن آجاتیں' زبان انہیں آتی نہ ہمیں۔ کوئی لفظ سمجھ آجاتا' کچھ اشاروں سے سمجھا دیتیں۔ ان کے بیٹے یا خاوند مٹر اور آلو کے ٹکڑے ڈال کر پکوڑے بنا کر بیچتے تھے۔ وہ ایک دو دفعہ ہدیہ کے طور پر پکوڑے لے آئیں۔ پھر اماں جی نے کہا کہ تم یہ تکلیف نہ کیا کرو۔ ان کی تواضع بھی کی اور کچھ خدمت بھی۔ جب تک ہم پٹن میں رہے وہ آتی رہیں۔ مہر ددی اور بیب ددی ان کے نام تھے۔ میرے خیال میں یہ ہندی کا بگڑا ہوا ''دیدی'' ہے بمعنیٰ بہن۔ رمضان میں قاضی احسان احمد شجاع آبادی، جانباز مرزا اور چچا شیخ حسام الدین صاحب ہمارے پاس کشمیر آئے۔ شیخ صاحب نے تو عید بھی ہمارے پاس کی' باقی حضرات ایک دو دن رہ کر واپس آ گئے۔ اہل قصبہ کے اصرار پر عید' ابا جی نے پڑھائی۔ ان سے پہلے مولوی سعید صاحب نے کشمیری زبان میں تقریر کر کے مسائل سمجھائے۔ وہاں لاؤڈ سپیکر کہاں تھا؟ لیکن قصبہ کے پانچ سات سو آدمیوں نے بغیر کسی دقت کے' ابا جی کی تقریر و خطبہ سنا اور نماز بھی ادا کی۔ آواز اللہ کی بہت بڑی نعمت تھی' جو ابا جی کو عطا کی گئی۔

عورتوں کے لیے بھی کیمپ لگایا گیا تھا۔ ہم ماں بیٹی، خواجہ صاحب اور مولوی سعید صاحب کی اہلیہ نے بھی وہاں نماز ادا کی۔ خواجہ صاحب کے ہاں سے کشمیر کا خاص سالن ''گشتابہ'' بطور ہدیہ بھیجا گیا۔ نمبردار غلام قادر صاحب کے ہاں بھی دعوت کی گئی۔ وہاں ایک دو اور گھروں میں بھی جانا ہوا۔ بڑی سینیوں میں خشکہ ہوتا اور اوپر تھوڑے تھوڑے وقفے سے پانچ سات سالن۔ فرشی نشست' اور مہمان میزبان مل کر کھاتے۔ کیا ہی اچھا رواج تھا۔ خواجہ صاحب کے چار بچے تھے۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی تین برس کی۔ بھائی عطاء المحسن مرحوم کی منظور احمد، منصور احمد اور بلال احمد

بٹ سے خوب دوستی تھی۔ محسن میاں نے تو کشمیری زبان کافی سیکھ لی تھی اور گنتی بھی یاد کر لی تھی۔

مولوی مظہر علی اظہرؒ:

۱۹۴۶ء کے الیکشن کے بعد، مرحوم شورش وغیرہ نے مولوی مظہر علی اظہر صاحب کی یونینسٹ پارٹی سے پخت وپز کا بھانڈا پھوڑا۔ مولوی صاحب مرحوم نے الیکشن کا اعلان ہوتے ہی انتخاب میں حصہ لینے کا بحیثیت جنرل سیکرٹری مجلس احرار اسلام اعلان کر دیا اور ابا جی کے مشورہ وعلم کے بغیر یونینسٹوں سے تعاون کا پیکٹ بھی کر لیا۔ پھر جناح صاحب کی ذاتی زندگی پر جلسہ عام میں حملہ کر دیا۔ اس پر ابا جی بہت رنجیدہ ہوئے اور انھوں نے مولوی مظہر علی اظہر صاحب سے فرمایا ''مظہر علی! یہ ہماری جماعت کی روایت نہ تھی۔ تم نے سیاست میں ذاتیات کو داخل کر کے اچھا نہیں کیا۔ اب یہ تاریخ کا حصہ ہے۔ ہماری آئندہ نسلوں کو بھی اس کا بھگتان کرنا پڑے گا۔''

مولوی ابراہیم علی چشتی جو محکمہ تعلّقات عامہ کے اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے (اخبار کا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا)، دفتر احرار لاہور میں ابا جی سے ملاقات کے لیے آئے، لیکن وہ تو کشمیر میں تھے۔ مولوی ابراہیم دفتر والوں سے یونینسٹ پارٹی کے امیدواروں کے حلقہ ہائے انتخاب میں ابا جی کی تقریروں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ مولوی مظہر علی اظہر صاحب نے یونینسٹوں سے جو خفیہ انتخابی معاہدہ کیا وہ ان کا ذاتی فیصلہ تھا اور پارٹی پالیسی کے بھی خلاف تھا۔ ابا جی سمیت دیگر احرار رہنما بھی سوائے شورش کے، اس قصے سے بے خبر تھے۔ اُدھر ابا جی جماعت کے انتخابی جلسوں میں تقریریں کر رہے تھے۔ مولوی ابراہیم علی چشتی غالباً اسی صورت حال کا جائزہ لینے دفتر احرار آئے تھے۔ الیکشن کے بعد جب ابا جی کو اصل حقائق معلوم ہوئے تو انہیں شدید صدمہ پہنچا اور مولوی مظہر علی اظہر صاحب سے ناراض بھی ہوئے۔

ایک دن ابا جی نے لطیفہ سنایا۔ مولوی مظہر علی اظہر صاحب کے ساتھ لاری میں سفر کر رہے تھے۔ چھوٹی سی ٹوکری میں پان کا سامان ساتھ ہوتا تھا۔ سیٹ پر ٹوکری رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ پان لگانا تھا، اس لیے پان کا ٹکڑا تو خود ہاتھ میں پکڑا اور ڈبا نما پاندان مولوی صاحب کو تھماتے ہوئے کہا بھائی مظہر علی! **تعاونوا علی البر والتقویٰ**

مولوی صاحب نے ڈبا پکڑا اور چونے کتھے کے خانوں کی طرف انگلی کر کے کہنے لگے:

''اینہاں وچوں بِر کیہڑا اے تے تقویٰ کیہڑا اے؟''

(ان میں سے ''بِر'' کون سا ہے اور ''تقویٰ'' کون سا؟)

کشمیر کی سیر:

رمضان کے بعد بھائی جان کی تعطیلات ختم ہو رہی تھیں، اس لیے وہ تو مولوی سعید صاحب کے ساتھ جا کر سری نگر، ٹنگ مرگ، گلمرگ وغیرہ سے ہو آئے۔ جس لاری پر ہم کشمیر آئے تھے، اس کے ڈرائیور اسلم خاں صاحب نامی، بہت شریف انسان تھے۔ وہ ہمارے قیام کے دوران جب راولپنڈی سے کشمیر آتے، ابا جی سے مل کر جاتے۔ ایک دفعہ وہ آئے تو ابا جی نے بتایا کہ چند دن بعد بھائی جان نے جانا ہے، آپ کے ساتھ سفر ہوگا تو مجھے اطمینان رہے گا۔ چنانچہ مقررہ دن اسلم خاں پٹن رکے اور بھائی جان کو پنڈی تک پہنچایا۔ پھر جب ہم لوگوں نے واپس ہونا تھا تب بھی انہی سے کہا اور ابا جی نے مکمّل کرایہ ادا کیا۔ بھائی جان کے خیر المدارس جالندھر جانے کے کچھ دن بعد ابا جی سری نگر گئے اور ہری سنگھ ہائی سٹریٹ میں ایک مکان کی بالائی منزل کرایہ پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ نچلی منزل میں ایک ہندو کنبہ رہتا تھا۔ پھر آ کر ہمیں سری نگر لے گئے۔ مختصر سامان ساتھ لیا باقی پٹن ہی پڑا رہا۔ ہم نے جو مقامات دیکھے وہ یہ تھے۔ شاہی چشمہ، نشاط باغ، شالامار باغ، درگاہ حضرت بل اور جھیل ڈل جو شہر کے وسط میں ہے اور ہاؤس بوٹ اس میں کھڑے رہتے۔ شکارے اور کشتیاں چلتیں۔ درگاہ حضرت بل، حضور علیہ السّلام کے موئے مبارک رکھنے کی جگہ ہے۔ ضعیف الاعتقاد خواتین لال پیلے نیلے پراندوں کے تاگے، منتیں مان کر جالیوں سے باندھ جاتی تھیں اور جب اللہ تعالیٰ مراد پوری فرما دیتے تو حضرت بل آ کر چڑھاوے چڑھاتی تھیں۔ عورتیں بھی کشتیوں میں سبزیاں رکھ کر ہاؤس بوٹ میں مقیم لوگوں کے پاس بیچتی تھیں۔ موئے مبارک تو خاص تاریخ کو دکھایا جاتا ہوگا، بس ایک نظر عمارت کو دیکھا تھا۔

راجہ ہری سنگھ کا درزی محمد شریف کہیں تحریک کشمیر کے دنوں ابا جی سے بیعت ہوا۔ جب آمد کا سنا تو باصرار آ کر دعوت قبول کروا گیا۔ بے چارا بے اولاد تھا۔ کے ایچ خورشید مرحوم کے والد صاحب نے بھی ابا جی کی سری نگر میں آمد سنی تو اصرار کر کے ہمارے سمیت، رات کے کھانے کا کہہ گئے اور ابا جی ہمیں لے گئے۔

کشمیر میں ہمارا خاندان:

سری نگر کے محلّہ گندر پورہ میں عیدگاہ کے بالکل قریب ہمارے ہم جد خاندان کے لوگ اب بھی آباد ہیں۔ تب چار بھائی سید محمد حسن شاہ صاحب، مولوی سید محمد قاسم شاہ صاحب (فاضل مدرسہ امینیہ دہلی)، سید محمد امین شاہ صاحب اور غالباً چوتھے سید محمد یوسف تھے' جو ابا جی سے ملے۔ اور بھی لوگ تھے۔ حسن شاہ صاحب ابا جی کو امرتسر بھی کبھی کبھار خط لکھا کرتے تھے۔ ہمیشہ فارسی میں لکھتے۔ بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پھر ایک روز وہ پٹن تشریف لائے اور ابا جی سے ملے۔ جس روز وہ سری نگر سے پٹن آئے' ابا جی خواجہ غلام محمد صاحب کے پاس دکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تانگہ آ کر رکا' ابا جی کی نظر پڑی تو خواجہ صاحب سے کہا: یہ شخص مجھے اپنے خاندان کا معلوم ہوتا ہے۔ اتنے میں وہ دکان تک پہنچے۔ انھوں نے سلام کیا' ابا جی وعلیکم السّلام کہہ کر بغل گیر ہو گئے اور کہا آپ سید محمد حسن شاہ صاحب ہیں نا! وہ حیران ہو کر بولے آپ نے کیسے پہچانا؟ فرمایا ''آنکھ سے''۔ (''بخاریوں'' کی آنکھیں غلافی ہوتی ہیں)۔ وہ واپس جاتے ہوئے بڑے اصرار سے گھر آنے کی دعوت دے گئے۔ چنانچہ جب ہم لوگ سری نگر گئے تو ابا جی نے ان کو آمد کی اطلاع دی۔ ان میں سے کوئی بھائی آ کر گھر لے گئے' رات ہمیں رکھا اور مہمان نوازی کی حد کر دی۔ خواتین میں سے صرف ایک اردو جانتی تھیں باقی صرف کشمیری بولتی تھیں۔ اردو جاننے والی بے چاری ہی ہماری ترجمان بنی رہیں۔ مولوی سعید صاحب کے بچے چند دن کے لیے آئے اور قابل دید مقامات دیکھ کر پٹن واپس چلے گئے۔ کوئی مہینہ بھر ہم سری نگر رہے' پھر پٹن واپسی ہوئی۔ مولوی سعید صاحب مرحوم کے درویش صفت بڑے بھائی نے دو دفعہ ہماری دعوت کی۔ بڑی ہی تکریم سے ابا جی کو ملے' بار بار کہتے' آپ کی وجہ سے ہمارا بچھڑا بھائی ہم سے مل گیا۔ ان کے مکان کے ساتھ اخروٹوں کا باغ تھا۔ اور دور تک مخملیں گھاس کا قطعہ۔ مغرب کی اذان ابا جی نے اس باغ میں خود دی اور نماز پڑھائی۔ وہ منظر اور وقت اب بھی یاد آتا ہے تو روح شاد کام ہو جاتی ہے۔

کشمیر سے واپسی:

اکتوبر ۱۹۴۵ء کے شروع میں ہم واپس ہوئے تھے۔ دور سے دکھائی دینے والی اونچی چوٹیوں پر برف گرنی شروع ہو گئی تھی۔ جس روز پٹن سے رخت سفر باندھا بلا مبالغہ کئی سو آدمی لاری

کے گرد اکٹھے تھے۔ ابا جی نے ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور دیر تک دعا کی ۔ کئی نیک دل تو رو رہے تھے۔ اسلم خاں کچھ دیر سے لاری لائے۔ سامان وغیرہ رکھتے بھی وقت لگا' جب ہم '' چناری '' پہنچے تو رات کافی ہوگئی۔ ابا جی نے فرمایا رات یہیں رکتے ہیں۔ صبح بقیہ سفر کریں گے۔ یاد ہے اب تک سڑک کنارے چھوٹا سا اکبر مسلم ہوٹل تھا۔ اس کے دو کمرے لے لیے' ایک میں ہم عورتیں اور دوسرے میں ابا جی اور مولوی سعید صاحب وغیرہ ۔ دوسرے روز دوپہر کو واپس راولپنڈی پہنچے اور رات صوفی عنایت محمد صاحب ہی کے ہاں گزاری۔ دوسرے دن گاڑی سے لاہور پہنچے ۔ امرتسر کے خواجہ جمال الدین بٹ' ابا جی کے مرید تھے اور امرتسر سے لاہور تک ان کی لاری چلتی تھی۔ یا تو ابا جی نے پنڈی سے اطلاع کی ہوگی یا لاہور پہنچ کر کہا ہوگا' کیونکہ دفتر احرار سے کافی کارکن اسٹیشن پر ملنے آئے ہوئے تھے۔ بہرحال لاری سٹیشن پر موجود تھی' اس میں بیٹھے۔ امرتسر پہنچ کر مولوی صاحب کے کنبہ کو کٹڑہ کرم سنگھ میں ان کی گلی کے سامنے اتار کر ہمیں لاری نے گلوالی دروازہ مکان تک پہنچایا۔

کشمیری تحفے:

کشمیر کا خصوصی تحفہ کچھ '' کانگڑیاں'' اماں جی فرمائش سے لائیں اور رشتہ دار خواتین کو تحفہ دیا۔ علاوہ ازیں پتھر کے نگینوں والے آویزے، انگوٹھیاں، ہار میں نے چند ہم سنوں کے لیے منگوائے تھے۔ اخروٹ اور مسالے کی بڑیاں کافی تقسیم کی گئیں۔ کشمیر کی بہترین سرخ مرچ اور کئی دوسرے مسالے ڈال کر بڑیاں بنتی تھیں اور تھوڑی سی توڑ کر ہانڈی میں ڈالنے سے سالن کا رنگ اور ذائقہ ہی اور ہو جاتا تھا۔

ایک بچی کی فرمائش:

امرتسر میں ہماری جمعدارنی مسلمان تھی ...... '' خیراں'' نام تھا۔ اماں جی نے اس کو نماز یاد کرائی ۔ آدھا سپارہ اس نے پڑھا پھر اپنے کام کی مجبوری میں چھوڑ دیا۔ اس کی بھی ایک بیٹی تھی۔ کبھی کبھی وہ گھر آتی اور ہمارے ساتھ کھیلتی ۔ جب ہم لوگ کشمیر جانے لگے تو وہ کہنے لگی '' شاہ جی! حمیدہ کہتی ہے میرے لیے کشمیر سے اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک صندوقچی ضرور لائیں جس پر پھول' لکڑی کو کھود کر بنائے جاتے ہیں''۔ ابا جی نے نہ صرف اس فرمائش کو یاد رکھا بلکہ خود جا کر سری نگر کی انارکلی ...... '' امیرا کدل'' سے ایک خوبصورت صندوقچی خریدی اور امرتسر آ کر جمعدارنی کو دی۔

حافظ علی بہادر خاں:

کشمیر سے لوٹے تو ۱۹۴۶ء کے الیکشن کی انتخابی مہم درپیش تھی۔ بمبئ کی صوبائی اسمبلی کے امیدوار احرار کی جانب سے حافظ علی بہادر خاںؒ تھے۔ حافظ صاحب مرحوم و مغفور، روزنامہ ''ہلالِ نو'' بمبئ کے مدیر تھے۔ الیکشن مہم کے دوران مسلم لیگی ورکروں نے ان کو مار پیٹ کر شدید زخمی کیا تھا۔ چنانچہ تب ''ہلالِ نو'' کا ایک شمارہ تو قطعی یاد ہے، اور شاید دوسرے دن کا پرچہ بھی ان کی ہمشیر نے گھر میں سائکلو سٹائل مشین پر چھاپ کر شائع کیا تھا۔ پورے ہندوستان میں ''ہلال نو'' واحد روزنامہ تھا جو احرار کی حمایت کرتا تھا۔ حافظ صاحب نے نجی طور پر ڈیکلریشن حاصل کیا تھا۔ وہ کل ہند احرار کے نائب صدر اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ انھوں نے احرار کی انتخابی مہم چلائی تھی۔ آخری دور میں ہفتہ وار ''دورِ جدید'' دہلی سے نکالتے رہے۔ انھوں نے ''حکومتِ الٰہیہ'' کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی، جو سورۃ بلد کی انقلابی تفسیر تھی۔ پاکستان بننے کے بعد بھائی جان نے اپنے رسالہ ''مستقبل'' میں اسے قسط وار شائع کیا۔

ایک ہفت روزہ ''افضل'' سہارنپور سے راؤ محمد کامل خاں اکمل کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ پنجاب میں تو کوشش کے باوجود ڈیکلریشن ہی نہیں دیا گیا تھا۔ یہ سب لوگ اب وہاں جا چکے ہیں جہاں سے پلٹ کر کبھی کوئی نہ آیا۔

حافظ محمد سعید (ابا جی کے بچپن کے دوست):

امرتسر سے بمبئ کے لیے ابا جی جس دن روانہ ہونے لگے۔ اسی دن پنجاب کے انتخابی حلقوں کے دورے سے تھکے ماندے گھر آئے تھے، میں نے عرض کیا: ''ابا جی! کپڑے بدل لیجئے۔'' اس روز انھوں نے جامنی اور بینگنی کے بَین بَین رنگ کا کرتا اور تہبند پہن رکھا تھا۔ جو کورا لٹھا رنگ کر بنایا گیا تھا۔ نوعمری تھی، بمبئ کو ''عروس البلاد'' سنا ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ہمارے ابا جی وہاں بہت اچھے کپڑے پہن کر جائیں! انھوں نے میری بات سن کر کپڑوں پر ایک نگاہ ڈالی اور فرمایا میرے لیے تو سب سے اچھے یہی کپڑے ہیں، سعید لایا ہے۔ میری بیٹی ہو کر تم بھی یہ بات کہتی ہو۔ یہ بزرگ جناب حافظ محمد سعید صاحب پٹنہ کے کوچہ خانہ باغ، گلی لنگر کے رہائشی، ابا جی

کے بچپن کے ساتھی، رفیق حفظ اور مخلص و خیر خواہ تھے۔ ابا جی کا ننھیالی مکان جو دادی جی مرحومہ کو جہیز میں ملا تھا، تنہا اولاد ہونے کے سبب ابا جی ہی کی ملکیت تھا۔ وہ تو ۱۹۳۰ء کے بعد کبھی پٹنہ گئے نہیں۔ چچا سعید ہی جب تک ان کا بس چلا' کرایہ داروں سے لڑ جھگڑ کر کرایہ وصول کرتے، کبھی ملتا کبھی چھے چھے ماہ تک کچھ نہ ملتا! ان کی معاشی بدحالی کے دور میں ابا جی نے ان کو اچھرہ (لاہور) میں جناب میاں قمر الدین صاحب مرحوم خازن کل ہند مجلس احرار کے خاندانی مدرسہ ''جامعہ فتحیہ'' میں مدرس قرآن لگوادیا تھا۔ جس دن ابا جی سکندر حیات کے قائم کردہ کیس سے بری ہو کر گھر آئے تو چچا سعید ساتھ تھے۔ تقسیم سے قبل گھریلو مجبوریوں کی بناء پر ملازمت چھوڑ کے چلے گئے۔ خان گڑھ اور ملتان تک ان کے خطوط برابر آیا کیے۔ ''میرے شاہ جی''......اور...... ''پیارے شاہ جی حفظکم اللہ''......اور پتا نہیں کیا کیا دعائیں القاب لکھ کر خط شروع کرتے، بڑا اچھا خط تھا، سیدھی سطریں' پھر حاشیہ دائیں ہاتھ چھوڑا ہوتا' چند سطور ادھر' پھر پشت پر۔ تقریباً بیس پچیس سطور کا خط ہوتا۔ سن یاد نہیں' لیکن ابا جی کی زندگی ہی میں داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ابا جی کے بچپن کے ایک اور ساتھی اور محلے دار محمد اسماعیل بنگالی میاں نے اطلاع دی کہ آپ کے حافظ محمد سعید انتقال کر گئے ہیں۔ ابا جی نے آہ سرد بھری اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن . پڑھ کر یاد ماضی میں کتنی دیر گم رہے۔ (رحمہ اللہ)

ابا جی بچپن کی باتیں کرنے لگے کہ شہر میں جتنے حافظ تھے ہم دونوں سب کی نقل اتارتے۔ مگر ایک حافظ اتنا بد آواز تھا کہ میں اس کی نقل نہ اتار سکا، سعید نے اتاری۔ ابا جی ہی کی طرح سر پر پٹے رکھے ہوئے تھے۔ کھدر پہنتے تھے۔ اور کسی وقت اچانک ان کی آواز پر، ابا جی کی آواز کا شبہ ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر:

۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ کرنے دہلی آیا تو دیگر جماعتوں کی طرح، احرار کے رہنما بھی ابا جی سمیت مہینہ کے قریب دہلی رہے۔ ظاہر ہے میں یادتو آتی ہوں گی۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم جب دہلی میں رہتے تھے۔ شیخ چچا جان (شیخ حسام الدین)

اور ابا جی کی انھوں نے دعوت کی۔ڈاکٹر صاحب اپنی انگریز بیگم کو سامنے لے آئے۔ [1] انھوں نے باتوں باتوں میں کہیں بچوں کا پوچھا۔ابا جی نے تفصیل بتانے کے بعد'ڈاکٹر صاحب کو میرے بچپن کا قصہ سنایا کہ کیسے ایک سفر سے واپسی پر میں نے ان سے کہا: میرا دل آپ کے لیے بہت اداس تھا۔میں نے آپ ہی کی طرح آپ کے برتن سے' ویسے ہی منہ لگا کر پانی پیا' جیسے آپ پیتے ہیں۔اور پھر کہا''ابا جی' ایہہ وی تے اک طرح دی یاد ای ہے نا''؟ فرمانے لگے' ڈاکٹر متحیّر سا ہو گیا۔دو تین دفعہ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا ارے ارے! ڈاکٹر کی بیوی پوچھنے لگی کہ بچے کتنے ہیں؟ میں نے کہا چار بیٹے اور ایک بیٹی۔وہ کہنے لگی آپ لوگ بیٹی کو حقیر سمجھتے ہیں۔آپ نے یہ نہیں کہا کہ پانچ بچے ہیں بلکہ یوں کہا کہ چار بیٹے اور ایک بیٹی۔میں نے کہا نہیں بابا' یہ بات نہیں' مجھے تو بیٹی بیٹوں سے زیادہ پیاری ہے۔اور حقیقت بھی یوں ہی تھی مگر وہ تو جھاڑ کا کانٹا بن کر چمٹ گئی۔میں نے ڈاکٹر سے کہا میرا پیچھا چھڑاؤ! وہ مسکرا کر کہنے لگے باپ جانے اور بیٹی! میں تو دخل دیتا نہیں۔پھر فرمایا کہ ڈاکٹر تاثیر کہتا تھا انگریز عورتوں کو جب کوئی بیٹی کہے تو بہت خوش اور متاثر ہوتی ہیں۔مجھ سے رہا نہ گیا' میں نے کہا ابا جی! ہندوستان سے ایسا کون گیا ہے جس نے وہاں بیٹی بنائی ہو؟ جو بھی گیا بیوی بنا کر لایا۔ظاہر ہے بیٹی کہنے والے سے متأثر تو ہوں گی۔ابا جی تو گھر کی جمعدارنیوں تک کو امرتسر اور ملتان میں بیٹی ہی کہہ کر بلاتے تھے۔بچپن سے دیکھتے آئے کہ گھر میں آنے والی خواتین بیعت کے لیے آئیں یا ویسے کسی کام سے' عمر کے مطابق اماں ، بہن ، اور بیٹی کہہ کر مخاطب فرماتے۔

۱۹۴۶ء کی اس ملاقات کی یادگار' وہ چار اشعار بھی تھے جو تاثیر مرحوم نے ابا جی کی نذر کیے تھے۔اشعار یہ تھے......

---

[1] بیگم تاثیر کا سابقہ نام''کرسٹابل جارج''اور نیا نام''بلقیس تاثیر'' تھا۔اُن کی دوسری بہن''ایلس جارج'' فیض احمد فیض کی اہلیہ تھیں۔ان کا نام''کلثوم'' رکھا گیا۔مگر وہ تمام عمر ایلس فیض کے نام سے ہی پکاری جاتی رہیں۔(کفیل)

دل است بندۂ احرار و جاں اسیر فرنگ | نہ بہرۂ ہمہ صلح و نہ چارۂ ہمہ جنگ
میانِ کعبہ و بت خانہ عرصۂ یک گام | میانِ شیخ و برہمن ' ہزار ہا فرسنگ
نمود سر بسر اظہار و کوہکن یک تن | ہزار پیکرِ شیریں فسرد در رگِ سنگ
بیا کہ خاوریاں نقشِ تازہ تر بستند | بیا کہ باز ستانیم افسر و اورنگ [1]

ترجمہ

(۱) میرا دل تو ''احرار'' کا غلام ہے، لیکن روح فرنگی کی اسیر ہے (غالباً اشارہ سرکاری ملازمت کی طرف ہے)۔ چنانچہ نہ تو میں یکسر صلح کرسکتا ہوں، نہ کلی طور پر جنگ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔

(۲) (دیکھا جائے) تو کعبے اور بت خانے کے درمیان ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ (کعبہ اس سے پہلے ایک طرح کا بت خانہ ہی تو تھا)۔ مراد یہ ہے کہ کعبہ و بت خانہ میں تو کوئی

---

[1] یہ اشعار ڈاکٹر تاثیر صاحب کی وفات تک، غیر مطبوعہ ہی رہے۔ ان کی وفات (۳۰رنومبر ۱۹۵۰ء) کے بعد سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے علمی و ادبی جریدے سہ ماہی ''مستقبل''، ملتان، میں تعارفی شذرے کے ساتھ پہلی بار شائع کیے۔ شذرے کا عنوان انھوں نے قائم فرمایا: ''یہ نظم!''۔ جبکہ اشعار پر سرخی جمائی: ''بیم و رجاء''۔ شذرہ یہ تھا...... (کفیل)

یہ نظم!

حضرت امیر شریعت مدظلہ العالی سے ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے نیاز مندانہ اور گہرے مراسم تھے۔ گزشتہ انتخابات کے دوران میں جب حضرت شاہ صاحب دہلی پہنچے تو ڈاکٹر صاحب سے جوان دنوں سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں وہیں پہ مقیم تھے، ملاقات ہوئی۔ روانگی کے وقت ڈاکٹر مرحوم نے بطور ہدیہ یہ اشعار تانگہ پر سوار ہوتے وقت قبلہ شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کیے اور اپنے مخصوص و معروف انداز میں پڑھ کر بھی سنائے۔ یہ نظم بقیہ کاغذات میں اتفاقاً ساتھ آ گئی۔ مرحوم کے انتقال کی جس روز خبر آئی ہے، حضرت شاہ صاحب ڈاکٹر صاحب کی یاد میں آبدیدہ ہوگئے اور نہایت وارفتگی کے عالم میں یہ اشعار پڑھتے رہے۔ یہ خاص تحفہ اب ہدیۂ قارئین کرام ہے جس سے مرحوم کے افکار و نظریات اور جذبات و احساسات پر ہلکی سی روشنی پڑتی ہے کہ وہ کس ڈھنگ کے آدمی تھے اور یہ کہ ماحول نے انہیں کس ڈگر پر ڈالے رکھا:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(''مستقبل''، مارچ/اپریل ۱۹۵۱ء)

زیادہ فاصلہ نہیں، لیکن شیخ و برہمن کے درمیان ہزار ہا فرسنگ (ہزاروں میل) کا فاصلہ ہے۔

(۳) اگر چہ کوہکن (فرہاد) صرف ایک ہی شخص تھا، لیکن اس نے اپنے اظہار کا سر بسر حق ادا کیا۔ پتھروں کے دل میں ہزاروں شیریں جیسے پیکر موجود تھے۔ لیکن ٹھٹھر کر رہ گئے (سامنے نہ آسکے)

(۴) آؤ کہ اہلِ مشرق نے تازہ تر نقش بنایا ہے، آؤ کہ ہم اپنا تاج و تخت واپس چھین لیں (مراد ہے انگریز سے آزادی حاصل کریں، اس لیے کہ تاج و تخت تو مسلمانوں ہی سے چھینا گیا تھا)

فیض احمد فیض:

فیض احمد فیضؔ، ایم اے او کالج امرتسر میں پڑھاتے رہے۔ پھر ہیلی کالج لاہور آگئے۔ کبھی وہ بھی ملنے آجاتے۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''نقشِ فریادی'' ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تو انہی دنوں کسی ملاقات میں انھوں نے پیش کیا، جو ابا جی کے ذاتی کتب خانہ (امرتسر) میں موجود تھا۔ سرورق پر لکھا تھا:

محترم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمت میں

عقیدت سے

فیضؔ

ساغر صدیقی اور سیف الدین سیف امرتسر کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر تھے۔ یہ اُن کا ابتدائی زمانہ تھا۔ انھیں بھی ابا جی سے عقیدت تھی۔ آکر ملا کرتے اور اُن کی شفقت و محبّت کا دم بھرتے۔ دونوں نے ابا جی پر نظمیں کہیں۔

دفتر احرار لاہور میں قیام:

ابا جی مصائب میں گھبراتے نہیں تھے۔ متوجہ الی اللہ ہو جاتے تھے۔ اپنی تکلیف کی پروا نہیں کرتے تھے مگر ہماری تکلیف ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں بے خانماں ہو کر ہم لوگ چھے ماہ لاہور پڑے رہے۔ کوئی ڈھنگ کا مکان ڈھونڈنا جوئے شیر لانا تھا۔ گوجرانوالہ کے ایک احرار کارکن (صوفی محمد سلیم) ایک دن آئے اور کہنے لگے: ہمارے محلّہ میں ایک مکان ہے۔ (اس کا سکھ مالک چابی ان صاحب کو غالباً دے گیا تھا) آپ آکر دیکھ لیں! ابا جی با دل نخواستہ گئے اور دوپہر گوجرانوالہ کاٹ کر واپس لاہور آ گئے۔ ہم لوگ ان دنوں مجلس احرار اسلام کے ترجمان روزنامہ ''آزاد'' کے دفتر کی بالائی منزل پر' ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن میں گزارا کر رہے تھے۔ ایک کمرے میں چودھری افضل حق رحمہ اللہ کے کنبے کا سامان تھا اور چھٹیاں گزارنے جاتے

ہوئے وہ لوگ یہ کمرہ ہمیں دے گئے ۔ ابا جی! گوجرانوالہ سے واپسی پر اوپر تشریف لائے اور اماں جی سے کہنے لگے ۔ استغفر اللہ! دوپہر کانٹوں پر گزری ہے میں چارپائی پر لیٹا' نیچے نظر پڑی تو اُس سکھ کے پیاز بھی پڑے ہوئے تھے ۔ میں نے سوچا میرا ان چیزوں پر کیا حق ہے؟ ہم لوگ اگست ۱۹۴۷ء کے اواخر تک دفتر ہی کے کمرے میں پڑے رہے ۔ کمرے میں دو چار پائیاں بچھتیں ۔ دوپہر کو بھائیوں اور اماں جی نے لیٹنا ہوتا تھا ۔ میں دو کرسیاں آمنے سامنے بچھا کر ان پر لیٹ جاتی

دفتر احرار لاہور میں رہائش کے دنوں میں آغا شورش کاشمیری مرحوم و مغفور اور غازی محمد حسین صاحب مرحوم سالار اعظم جیوش احرار اسلام نے بار بار کہا کہ ہم ٹرک لے کر امرتسر جاتے ہیں ۔ رضا کاروں کو ساتھ لے کر آپ کا سامان نکال لاتے ہیں ۔ مگر ابا جی نے فرمایا! نہیں بھائی میں یہ نہیں سننا چاہتا کہ عطاء اللہ شاہ نے اپنے سامان کے لیے لوگوں کے بچے مروا دیئے ۔ کیونکہ ہندو سکھ جب کسی مسلمان کو اپنے محلے سے گزرتا دیکھتے تو اپنے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں سے بم گراتے تھے ۔ ہمارے محلّہ کے دولڑکے ابا جی اور بھائی جان سے ملنے لاہور آنے لگے' تانگہ ہال بازار میں پہنچا تو کسی طرف سے دستی بم گھوڑے پر گرا وہ پچھلی سیٹ سے چھلانگیں لگا کر کودے اور پیدل بھاگتے ہوئے اسٹیشن پر پہنچے ۔

نوابزادہ نصر اللہ خان کے ہاں خان گڑھ میں قیام

آخر نواب زادہ نصر اللہ خاں صاحب نے ابا جی کو اپنے ہاں خان گڑھ (ضلع مظفّر گڑھ) چلنے کی دعوت دی ۔ فی الحقیقت ہمارے لیے اس وقت یہ پیش کش انتہائی قابلِ قدر تھی ۔ نوابزادہ صاحب نے اپنی واحد حقیقی ہمشیر سے اپنا مکان فارغ کروا کر ہمیں دیا' اور اپنے مردانہ بنگلہ کا آدھا حصہ ان کی رہائش کے قابل بنا دیا ۔ اور ان کے پورے خاندان نے ضروریات زندگی کے جمع کرنے میں ہماری ہر طرح سے مدد کی ۔ امرتسر کے تیس پینتیس برس کے بستے گھر سے جو سامان لے کر آئے' وہ ایک لحاف، ایک گدا، تین چار کھیس، ایک بوری برتن، مستعمل کپڑوں کے تین چار بکس اور سلائی مشین پر مشتمل تھا ۔ یہ بھی اماں جی کی ہمت سے ۔ جس دن امرتسر سے نکلے ہیں' انھوں نے ابا جی سے کہا جہاں بھی جا کر رہیں گے' کیا کیا چیز کسی سے مانگیں گے ۔

خان گڑھ کا قیام ہمارے لیے بڑا عجیب تھا ۔ رشتہ دار، وطن، ہمسائے سب چھوٹ گئے تھے ۔ کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آتا' سوائے ابا جی کے' اور کسی کو زبان بھی سمجھ نہ آتی ۔ کوئی لفظ اماں جی سمجھ لیتیں کہ ملتان اور بہاول پور سے کبھی کوئی عقیدت مند عورت ملنے امرتسر چلی جاتی تھی ۔ آب وہوا بھی

ناموافق رہی۔ایک سال کے قیام کے دوران اکثر اوقات سب بہن بھائی اور ابا جی بخار میں مبتلا رہے ۔ابا جی کو کچھ افاقہ ہوا تو بھائی عطاء المحسن شدید بخار میں مبتلا ہوگیا۔ایک دن اسے سرسام ہوگیا۔ایسی کیفیت کبھی کسی کی نہ ہوئی تھی ۔اماں جی کے مثالی صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ۔انھوں نے روتے ہوئے مجھے کہا اپنے ابا جی کو بلاؤ۔ میں نے دوڑ کر مردانے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ابا جی نقاہت کی وجہ سے بمشکل چل کر آئے۔خان گڑھ میں ان دنوں معالج نام کی کوئی چیز دستیاب نہ تھی۔اچھرہ (لاہور) سے ابا جی کے رفیقانِ جماعت میاں قمرالدین، میاں محمد رفیق صاحبان مرحومین کے ایک عزیز حکیم خالق داد صاحب مرحوم آئے ہوئے تھے۔ان کو بلایا وہ بے چارے فوراً ہی آ گئے اور ان کی تدبیروں سے گھنٹہ بھر بعد بھائی کو ہوش آیا اور آج بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ جب محسن بھائی نے آنکھیں کھولیں تو ابا جی اینٹوں کے فرش پر سجدہ میں گر گئے ۔اور روتے ہوئے کہنے لگے:

''یا اللہ! میں اس آزمائش کا متحمل نہیں ہوں!''

جس دن ہم لاہور سے خان گڑھ روانہ ہورہے تھے' تانگہ میں بھائی جان نے کوئی بات کی ،وہ تو میں نے نہیں سنی مگر ابا جی کا جواب آج بھی یاد ہے کہ:

''بیٹا! کوئی سہارا نہیں سوائے اللہ کے' اور لعنت ہے اس سہارے پر جو ماسوا اللہ کے ہو۔''

ہم لاہور سے بذریعہ ریل ملتان پہنچے تو رات ہوچکی تھی ۔ چھاؤنی اسٹیشن کے مسافر خانہ میں ہم نے رات گزاری ۔ابا جی اور بھائی جان مردانہ کمرہ میں تھے' جہاں شہر سے آئے ہوئے احباب بھی موجود تھے۔صبح نماز کے بعد بذریعہ لاری خان گڑھ روانہ ہوئے ۔خان گڑھ میں ہم ایک برس سے کچھ دن کم ہی رہے۔

جب حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ جالندھر سے ملتان تشریف لے آئے اور مدرسہ خیرالمدارس کا دوبارہ اجراء ہوگیا تو انھوں نے بھائی جان کو بلالیا اور پاکستان بننے کے بعد خیرالمدارس سے جو پہلا گروپ فارغ التحصیل ہوا بھائی جان اسی میں شامل تھے۔مگر چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہورہا تھا۔ابا جی اس باب میں متفکّر تھے اور ملتان میں اپنے احباب کو مکان کی تلاش کا کہہ رکھا تھا۔

سب سے چھوٹی بہن سیّدہ سالمہ کا انتقال:

۵ رفروری ۱۹۴۸ء کو ہماری سب سے چھوٹی اور سب کی چہیتی بہن سیدہ سالمہ دو روزہ علالت کے بعد ہمیں داغِ مفارقت دے گئی۔ابا جی اور ہم سب کے لیے غربت میں یہ بڑا شدید

صدمہ تھا، وہ گھر بھر کی رونق تھی۔وہ بے چاری علی الصباح فوت ہوئی۔اس افراتفری کے زمانہ میں ملتان سے خان گڑھ تک ایک ہی لاری سارے دن میں چلتی تھی۔ابا جی نے اپنے ایک غریب لوہار مرید سے کہا کہ لاری پر جا کر ملتان سے حافظ (بھائی جان) کو لے آؤ۔وہ اڈے پر آیا تو لاری نکل چکی تھی۔اللہ تعالیٰ اس شخص کو بہت بہت اجر مرحمت فرمائیں وہ بے چارا اپنے سائیکل پر ہی ملتان روانہ ہوگیا۔اور سوءِ اتفاق کہ جب وہ بھائی جان کو لے کر روانہ ہوا تو ملتان سے بھی کوئی لاری نہ ملی اور وہ اللہ کا بندہ پھر سائیکل پر ہی بھائی جان کو لے کر خان گڑھ پہنچا تو رات کے ۹ بج چکے تھے۔ابا جی نے عصر تک انتظار کیا۔خان گڑھ والوں نے اپنی محبّت کا اظہار یوں کیا کہ پورے بازار کی دکانیں بند رہیں۔عصر کے بعد ابا جی فرمانے لگے کہ صبح سے لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔کب تک یوں ہی انہیں بٹھائے رکھوں۔حافظ کی قسمت میں منہ دیکھنا نہیں ہے۔تدفین کر دیتے ہیں۔اماں جی! بے چاری خاموش رہیں، کہتیں بھی کیا اور ابا جی اپنی لاڈلی بیٹی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر اس کی آخری آرام گاہ تک لے گئے۔وہ بے چاری کُل پونے دو برس زندہ رہی۔بھائی جان معصوم بہن کو آخری بار نہ دیکھ سکنے پر پھوٹ پھوٹ کر روئے مگر کیا ہوسکتا تھا۔

مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ

دل اُچاٹ ہوگیا:

اس کی وفات کے بعد دل اور اچاٹ ہوگیا۔کسی کا بھی خان گڑھ میں رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔تینوں بھائی چھوٹے تھے۔تعلیم کا وہاں کچھ بندوبست نہ تھا۔پانی پت کے جناب قاری عبدالرحمٰن صاحبؒ مہاجر ہو کر وہاں آ گئے تو عارضی طور پر ان سے حفظ کرنے لگے۔اسی اثناء میں رمضان المبارک آ گیا۔بھائی جان، مدرسہ خیرالمدارس ملتان سے تعطیلات میں گھر آئے ہوئے تھے۔وہ قرآن کریم سنانے لگے۔آخری عشرہ میں ایک دن ملتان سے جناب ملک عبدالغفور صاحب انوریؒ اور ملک عطاء اللہ صاحب یہ خوشخبری لے کر پہنچے کہ مکان ڈھونڈ لیا گیا ہے۔آ کر دیکھ لیں۔ انہیں ابا جی نے فرمایا کہ عید کے بعد آ کر دیکھیں گے۔چند ہی دن رمضان کے باقی تھے وہ نماز فجر پڑھ کر ملتان واپس آ گئے۔

خان گڑھ میں سیلاب:

دوپہر کو سب آرام کر رہے تھے۔ظہر کا وقت ہوا تو ہمسائے نے پردہ کرنے کی تین آوازیں دیں جو ملتان کے علاقہ کا بڑا ہی شریفانہ اور اسلامی طریقہ ہے۔دیکھا گیا تو وہ اپنے صحن میں آم کے

درخت پر چارپائی باندھ رہا ہے چھوٹا موٹا سامان رکھنے کے لیے۔ پوچھنے پر اس نے کہا سائیں! دریائے چناب کا بند ٹوٹ گیا۔ پانی شہر کی طرف آ رہا ہے۔ پریشانی میں ظہر پڑھی گئی۔ ہنڈیا چولہے پر رکھی تو لمحہ بہ لمحہ خبریں آنے لگیں۔ پانی شہر میں داخل ہو گیا ...... ''کُلاں کی بستی'' ڈوب گئی...... پانی ہسپتال تک آ پہنچا۔ اتنے میں نواب صاحب کا پیغام آیا کہ بنگلے میں تشریف لے آئیں اور چند لمحے بعد سنا کہ بنگلے کی سیڑھیاں پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ پھر ایک معتقد خواجہ عبدالرشید صاحب نے آ کر کہا میرا چوبارہ ہے آپ کے لیے فارغ کر دیا ہے، وہاں آ جائیں اس کے منہ سے نکل گیا کہ وہ اونچا ہے۔ ابا جی نے فوراً ٹوکا ''یوں مت کہو، حضرت نوح علیہ السّلام کے بیٹے نے ایسے ہی کہا تھا۔ ویسے چلے چلتے ہیں''۔ پکتی ہانڈی چولہے سے اتاری۔ افطار کا وقت ہونے والا تھا' کھانے کے برتن باسن لے کر خواجہ صاحب کے چوبارے پر دوبارہ پناہ گزیں ہو گئے۔ ابا جی اور چند معتقد گھر رہے۔ ضروری چیزیں اٹھوائیں اور جس وقت بھائی جان تراویح پڑھا کر گھر آئے تو پانی بیرونی دیواریں گرا کر صحن میں آ چکا تھا۔ کسی نے کہا ''سائیں! ہُن تاں اٹھو، کیا سوچیندے پئے ہو''؟ (جناب! اب تو اُٹھیں کیا سوچ رہے ہیں؟) تو ابا جی بھی خواجہ صاحب کے ہاں آ گئے۔ چھ روز ہم وہیں محصور رہے۔ قیامت کا سماں تھا۔ نچلی منزل میں صاحب خانہ کے اہل وعیال اور کنبے کے آفت زدہ افراد بھرے پڑے تھے اور اوپر ہم لوگ۔ ایک رات تو ایسی آئی کہ پانی اس بند سے بھی ٹکرانے لگا جو شہر کے بچے کھچے حصے پر باندھ کر لوگ پناہ لیے بیٹھے تھے۔ آدھی رات کے بعد لوگ گلیوں میں آوازیں دے کر آدمیوں کو اکٹھا کر رہے تھے تا کہ بند کو مضبوط بنایا جا سکے۔ ابا جی جاگ رہے تھے۔ ہم ماں بیٹی سے فرمایا اٹھو! وضو کر کے مصلّے پر آ جاؤ (خود تو بیٹھے ہی تھے)' مرنا ہی ہے تو اللہ کا نام لیتے ہوئے مریں۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا۔ لوگوں کی محنت بار آور ہوئی اور بند ٹوٹنے سے بچ گیا۔

میاں قمر الدین صاحبؒ، میاں محمد رفیق صاحبؒ:

میاں قمر الدین صاحب مرحوم (رئیسِ اچھرہ لاہور) مجلس احرار اسلام ہند کے خازن، شعبہ تبلیغ تحفّظ ختم نبوت ہند اور ختم نبوت وقف قادیان کے صدر رہے۔ جب مجلس احرار اسلام نے قادیان میں مسجد ختم نبوت اور مدرسہ قائم کیا تو میاں صاحب مرحوم نے اس کارِ خیر میں بہت سرمایہ خرچ کیا۔ ابا جی انہیں ''احرار کا بینک'' کہا کرتے اور وہ حلقۂ احرار میں اسی خطاب سے یاد کیے جاتے۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں قادیان کے ایک مشہور بزرگ پیر سید شاہ چراغ نے چودہ کنال زمین مجلس احرار کے شعبہ تبلیغ تحفّظ ختم نبوت کے نام وقف کر دی۔ زمین کی رجسٹری کے سلسلہ میں لاہور سے میاں

قمرالدین صاحب، میاں محمد اسلم جان اور سید امیر حسین گیلانی قادیان گئے۔ میاں قمرالدین صاحب پانچ بھائیوں میں سب سے بڑے اور میاں محمد رفیق صاحب سب سے چھوٹے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں میاں محمد رفیق صاحب احرار کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اُن کے مقابلے میں ایک امیدوار وزیر محمد نام کا بھی تھا۔ جس کے بارے میں اُن دنوں ایک شعر زبان زدِ عام تھا:

خدا کی دین کا ''جیرے'' سے پوچھئے احوال
کہ روٹی لینے کو جائیں تو ممبری مل جائے

خان گڑھ میں ان کی دلچسپی کے لیے ابا جی کی ذات کے سوا کچھ نہ تھا۔ دونوں بھائی ان کی محبّت کے اسیر اور احرار پر فدا تھے۔ میاں محمد رفیق صاحب نے ابا جی کے خان گڑھ میں قیام کی وجہ سے یہاں کچھ زرعی زمین بھی ٹھیکے پر لی اور اسی بہانے وہ یہاں آیا کرتے۔ ۱۹۴۸ء میں ابا جی خان گڑھ سے ملتان منتقل ہو گئے تو میاں صاحب نے بھی زمین کا قصہ تمام کر دیا۔ ایک دن وہ ملتان تشریف لائے اور بتایا کہ زمین کے معاملات ختم کر کے خان گڑھ سے آیا ہوں۔ رقم ان کے پاس تھی جو ملتان سے لاہور جاتے ہوئے کسی جیب تراش نے نکال لی اور وہ خالی ہاتھ گھر پہنچے۔

۱۹۴۶ء میں مجلس احرار اسلام ہند کی ورکنگ کمیٹی کا آخری اجلاس میاں قمرالدین صاحب مرحوم کی رہائش گاہ اچھرہ لاہور میں ہوا تھا۔ اختتامِ اجلاس پر وداع ہوتے وقت شرکاء ایک دوسرے سے گلے مل کر روئے تھے کہ اب شاید ہی دوبارہ ملاقات ہو۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے۔

ملتان میں قیام:

ملتان اطلاع پہنچ چکی تھی اور ابا جی کے احباب مکان کا قبضہ لے کر راستے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ چھے روز بعد پانی کچھ کم ہوا تو ہم لوگ تانگوں میں مظفّر گڑھ روانہ ہوئے۔ حد نگاہ پانی ہی پانی تھا۔ راستے میں دیکھا درخت جڑ سے نکل کر سڑک کے کنارے گرے پڑے تھے۔ دونوں تانگوں کے بم پکڑ کر چار آدمی ساتھ چل رہے تھے۔ مبادا سڑک ٹوٹی ہو اور پتہ نہ چلے! ہمارے کپڑے اور برقعے گھٹنوں تک پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔ دو گھنٹوں میں دو میل کا سیلاب زدہ رقبہ طے ہوا اور ظہر کے قریب ہم مظفّر گڑھ پہنچے۔ اللہ تعالیٰ مخلصین کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ انھوں نے ایک زنانہ سکول کھلوا کر قیام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ رات وہاں گزاری اور دوسرے روز ریل گاڑی میں ملتان روانہ ہوئے۔ لائن کئی جگہ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گاڑی اس رفتار سے چل

رہی تھی کہ چند بار دیکھا' کچھ لوگ اترے اور چند منٹ بعد بھاگ کر پھر سوار ہو گئے۔ عصر کے بعد ملتان پہنچے اور تانگہ مدرسہ قاسم العلوم (کچہری روڈ) کے پاس پہنچا تو افطار کا وقت ہو گیا۔ سڑک پر پانی سے روزے افطار کیے۔ اور پھر اس گھر میں داخل ہوئے جہاں سے ابا جی کا جنازہ ہی اٹھا! مگر اس ساری مصیبت میں ایک لفظ بھی ان کی زبان سے شکوہ کا نہیں سنا۔ استغفار ہی پڑھتے رہے۔

غریب بیٹیوں کی رخصتی:

کسی کی بیٹی روٹھ کر میکے بیٹھ جاتی تو انہیں بہت دکھ ہوتا تھا۔ ملتان آئے' کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ محلّہ میں چند گھروں کے متعلّق معلوم ہوا کہ ان کی بیٹیاں روٹھی ہوئی ہیں' فریقین کو بلایا اور جب تک وہ لڑکیاں سسرال نہیں چلی گئیں' انہیں چین نہیں آیا۔ ایک دو صاحبِ حیثیت مرید اپنی زکوٰۃ اُن کی تحویل میں استعمال کے مکمّل اختیار کے ساتھ دے دیتے تھے۔ ابا جی نے محلّہ ٹبی شیر خاں میں کئی غریب لڑکیوں کا جہیز اس رقم سے تیار کرایا اور والدین کو بیٹیوں کی رخصتی میں مدد دی۔ ایک گھر میں نلکا لگوایا۔ اس کے علاوہ بھی وہ اس رقم سے غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

عبداللہ خان اور اس کا دلچسپ خط:

عبداللہ خان، بلوچستان کا رہنے والا تھا۔ کسی مقدمے میں پولیس کو مطلوب تھا۔ وہاں سے بھاگا اور سیدھا ابا جی کے پاس ملتان آ گیا۔ اپنا سارا قصہ سچ سچ بتا کر کہنے لگا: شاہ جی! اب آپ کے پاس رہوں گا۔ یہ ۱۹۵۵ء۔ ۱۹۵۶ء کا دور ہے۔ وہ محلے کی مسجد بی بی عائشہ میں رہتا اور ابا جی تبلیغی سفر میں کبھی اُسے ساتھ بھی لے جاتے۔ ایک سال کے قریب وہ ابا جی کے ساتھ رہا، پھر حالات ٹھیک ہونے کی اطلاع پر واپس گھر چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد اُس کا خط آیا تو لفافے پر لکھا ہوا پتا نہایت دلچسپ تھا جسے پڑھ کر ہم سب لطف اندوز ہوئے:

''ملک پاکستان والا

لین پنجاب والی

شہر ملتان والا

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

ملے بھی اُسی کو''

یہ ابا جی کا ظرف تھا کہ وہ پریشان حال لوگوں سے اللہ کی رضا کے لیے محبّت کرتے، انھیں

سینے سے لگاتے اور حتی المقدور خدمت بھی کرتے۔ ایسی بہت سی مثالیں اُن کے واقعات میں ملتی ہیں۔

سلیمان اُزبک:

سلیمان ازبک سعودی عرب میں معلّم الحجاج اور اُزبک نژاد تھے۔ اُس زمانے میں (غالباً ۱۹۵۷ء) سعودی عرب کی معاشی حالت آج سے مختلف تھی۔ معلّم، مختلف ملکوں میں خود جا کر حجاج وصول کرتے۔ اسی سلسلے میں وہ پاکستان آئے اور چند ماہ ملتان میں ابا جی کے ہاں قیام کیا۔ اُن کی معرفت کئی حجاج وصول کیے۔ پاکستان کے علاوہ ترکی کے حجاج اُن کے پاس زیادہ ہوتے۔ ایک دن انھوں نے احباب کی دعوت کی اور ''بخاری پلاؤ'' خود پکا کر کھلایا۔ بھائی جان (مولانا سید ابوذر بخاریؒ) کے ساتھ بہت بے تکلّفی تھی۔ عربی زبان و ادب سے دلچسپی اُن دونوں میں قدرِ مشترک تھی۔ غالباً ۱۹۷۰ء کی دہائی میں مکہ مکرمہ میں اُن کا انتقال ہوا۔ حجاج آکر بتاتے کہ ابا جی کے انتقال پر بہت غم زدہ تھے۔ اُن کے حسنِ سلوک کو یاد کر کر کے روتے اور ملتان میں قیام کے دوران اُن کی خدمت و اکرام کا بہت تذکرہ کرتے۔ وہ جب واپس حجاز گئے تو ابا جی نے اُن کی نقد خدمت بھی کی اور ہدایہ بھی دیے۔ ایک رومال بھی دیا جو سلیمان ازبک نے سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔

مسجد بی بی عائشہ کی تعمیر اور حاجی دین محمد صاحب مرحوم:

محلّہ ٹبی شیر خان ملتان کی مسجد بی بی عائشہ ٹوٹ رہی تھی، اپنے احباب کو توجہ دلائی۔ خصوصاً حاجی دین محمد صاحب مرحوم کو، جو مرید تو حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کے تھے مگر ابا جی سے بھی بہت محبّت تھی۔ اُن سے امرتسر میں ہی دوستی ہوئی اور ابا جی کے وہ بھائی بنے ہوئے تھے۔ وہ لاہور سے تشریف لائے۔ اپنا پکاتے کھاتے اور پلے سے لگا کر مسجد مرمت کی مگر ''بیماریٔ دل'' میں مبتلا لوگوں نے ایک طرف تو کسی ملتانی پیر سے بکرے کی سری ٹونا کرا کر حاجی صاحب کی رہائش گاہ میں پھینکی اور اُدھر متولی حضرات کے کانوں میں ڈالنا شروع کیا کہ شاہ جی کا ارادہ مسجد پر قبضہ کرنے کا ہے۔ حاجی صاحب اس قصہ سے بددل ہوگئے۔ حسبِ دل خواہ تو نہیں مگر بہر حال مسجد تعمیر کر کے واپس چلے گئے۔ ابا جی کے کہنے پر بھائیوں نے چند بار رمضان میں وہاں قرآن پاک سنایا۔ ابا جی نے مسجد کے ہمسایہ زمیندار سے تھوڑی سی زمین خرید کر مسجد میں شامل کی۔ قریبی کھیتوں میں کچھ حضرات رفع حاجت کے لیے مسجد سے گزر کر جاتے تھے، وہاں دیوار بنوادی۔ بعض مخالفین نے بڑی دل شکن باتیں کیں۔ بھائیوں کو طیش آیا تو فرمانے لگے:

"میں نے جو کچھ کیا اللہ کے لیے کیا۔ ایک سیدزادی کی بنوائی ہوئی مسجد تھی، میں نے دیکھا ٹوٹ رہی ہے بنوادی۔ تم نماز کہیں اور پڑھ لیا کرو، جانا ہی چھوڑ دو۔"

بعض وقت سوچتی ہوں ابا جی کیا تھے اور مخالفین نے کیا کہا؟

مخالفوں کی پست ذہنیت:

امرتسر کا مکان برلب راہ تھا۔ بیٹھک کی کھڑکیوں پر چقیں پڑی رہتیں۔ ایک دن دیکھا دو شخص گزر رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا یہ کس کا مکان ہے؟ دوسرا اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر ابا جی کی جسامت کی نشان دہی کرتے ہوئے بولا، عطاء اللہ شاہ کا۔ "شہید گنج" کا پیسہ لے کر بنایا ہے! حالانکہ یہ مکان مولانا بہاء الحق قاسمی مرحوم سے ۳۴۰۰ روپے میں اماں جی کا زیور بیچ کر اور قرض لے کر خریدا گیا تھا۔

ہماری سب سے بڑی بہن پیدا ہوئی تو وہ میانوالی جیل میں تھے، اسے دیکھا بھی نہیں، وہ فوت ہوگئی۔ مجھ سے بڑی بہن چار ماہ کی تھی تو وہ اپنے مشہور دورہ پر نکلے، وہ سوا سال کی ہو کر رخصت ہو گئی۔ اور اسے فوت ہوئے چند ماہ گزر چکے تھے، جب ابا جی دیناج پور جیل (بنگال) سے رہا ہو کر تشریف لائے۔ کیا یہ سب کسی دنیاوی مفاد کے لیے تھا؟ انھوں نے جدوجہد آزادی میں جان کی بازی لگا کر حصہ لیا۔ تارا سنگھ نے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہانے کی بڑھک ماری تو جواب انھوں نے ہی دیا۔ کشمیر اور کپورتھلہ کی غیر مسلم ریاستوں کے حکمرانوں کے مظالم کے خلاف تحریک ان کی جماعت مجلس احرار نے چلائی۔ راج پال کا فتنہ انھوں نے کچلا۔ غازی علم الدین شہیدؒ نے ان کی تقریر سے متاثر ہو کر راجپال کا کام تمام کیا۔ کوئٹہ کے زلزلہ اور قحطِ بنگال میں ان کی جماعتِ احرار نے ہی شاندار امدادی خدمات انجام دیں۔ ہر قومی، سماجی اور سیاسی تحریک میں اُن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

سردار منگل سنگھ:

۱۹۲۱ء میں جب میانوالی جیل میں تھے، کانگریس کا ایک سربر آوردہ کارکن سردار منگل سنگھ ایم ایل اے بھی ساتھ تھا۔ اس سے دوستانہ تعلّقات تھے۔ نواکھالی یا بہار کے فسادات (۱۹۴۶ء) میں اس نے مسلمانوں کے قاتلوں کی پشت پناہی کی۔ ابا جی کو اطلاع مل گئی۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہم لوگ دفتر احرار لاہور میں مقیم تھے تو ایک عقیدت مند فضل کریم سیٹھی صاحب چند دن کے نجی دورہ پر سرحد لے گئے۔ واپسی پر روداد سفر سناتے ہوئے فرمایا، جب پشاور اسٹیشن پر اترا تو دیکھا منگل سنگھ دوڑتا ہوا آرہا ہے۔ پاس آ کر معانقہ کے لیے ہاتھ بڑھائے مگر میں نے ہاتھ نیچے

کر کے کہا اب نہیں! میری قوم کو مروا کر مجھ سے معانقہ کرنے آئے ہو؟

ابا جی کی زندگی:

اچھے شعر سناتے بلکہ یاد کراتے۔ یہ شعر میں نے کہیں پڑھا:

فغاں کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے

سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

ایک روز شام کے وقت کمرے میں برتن نکال رہی تھی، صحن میں لے جانے کے لیے ......تو پھر شعر یاد آیا، پڑھنے کو جی چاہا اور میں نے اپنی یہ خواہش پوری کر لی۔ برتن لے کر مڑی تو دروازے پر ابا جی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ میں بہت نادم ہوئی ذرا اونچی آواز سے پڑھا تھا۔ فرمانے لگے کیا پڑھ رہی تھیں؟ پھر سنانا پڑا۔فرمانے لگے بس ابا کی زندگی یہی ہے۔ بچپن میں (مولانا حسرت موہانی کا) ایک شعر سنایا تھا، اب تک یاد ہے:

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں

مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

جی سنے اور جی کہے:

بٹیا تو مجھے ساری عمر کہا مگر جب میری پہلی بچی باتیں کرنا سیکھنے لگی تو ''بٹیا جی'' کہنا شروع کر دیا۔ان کے منہ سے اپنا اتنا ادب مجھے بہت محجوب کرتا۔ آخر ایک دن کہا کہ ابا جی اب آپ مجھے ''جی'' کہتے ہیں، شرم آتی ہے۔فرمانے لگے ننھّی کے لیے کہتا ہوں تا کہ جی سنے اور جی کہے!

غیرت وحمیت:

جنرل محمد ایوب خان کے زمانے کی بات ہے۔سکھ یاتری پہلی مرتبہ پاکستان آئے اور زندہ دلان لاہور نے یوں استقبال کیا جیسے عزیز واقارب سفر حج سے واپس آئے ہوں۔ابا جی نے اخبار پڑھا، اس روز عصر تک بیٹھک ہی میں بیٹھے رہے، اندر نہیں آئے۔ عصر کے وقت آئے اور خاموش خاموش صحن میں ٹہلنے لگے۔اماں جی نے چائے کا پوچھا تو فرمانے لگے:

> ''صبح سے میرا خون کھول رہا ہے۔قوم دیوث ہوگئی ہے، اب کن کا استقبال کر رہے ہیں؟ ایک لاکھ جوان کٹوائے۔ساٹھ ہزار بیٹیاں ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں دیں۔فاطمہ اور عائشہ نام کی لڑکیوں کے بطن سے ہرنام سنگھ اور

چھمن سنگھ پیدا ہوئے اور اب بھرا نہی کو بلا کر گلے مل رہے ہیں۔ اے کاش! آج میری صحت ہوتی تو لاہور میں تقریر کرتا اور پوچھتا کہ کن دامادوں کو بلایا ہے۔''

ایک بزرگ کا خواب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت:

ایک بزرگ حج سے واپس آئے اور کہا مجھے مدینہ طیبہ میں زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل ہوا' اُن کے بقول '' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عطاء اللہ شاہ کو میرا پیغام دینا کہ میری نبوت پر دشمن حملہ آور ہیں' تم آرام سے مت بیٹھو'' (ان بزرگ کی روایت کے الفاظ ہیں۔ واللہ اعلم)۔ اس دن وہ بہت روئے اور بار بار فرمایا مجھے پیغام آیا ہے۔ پھر جب تک ان میں ذرا بھی سکت باقی رہی' انھوں نے اپنی پوری توانائیاں عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ختم نبوت کے بیان میں صرف کیں۔

ملک عبدالغفور انوری مرحوم:

ایک روز عصر کے وقت صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ برادر محترم ملک عبدالغفور انوری مرحوم ومغفور ملنے آئے۔ بیٹھک کھلی تھی' کوئی صاحب بیٹھے تھے۔ انوری صاحب نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا السّلام علیکم۔ ابا جی نے جواب دیا۔ ممکن ہے پیالی کی کھنک انھوں نے سنی ہو یا ویسے ہی کہا:

'' چاہ پئے پیندے او' (اجی' چائے پی رہے ہیں)

ابا جی نے مسکرا کر کہا:

'' اوئے ہر کھڑاک نوں پیالی دا نہ سمجھ لئیں ماریا جاویں گا۔''

(ارے، ہر آہٹ کو پیالی کی آہٹ نہ سمجھ لینا' ورنہ مارے جاؤ گے)

جب انھوں نے چائے پینی ہوتی بے تکلّف طلب کر کے پی لیا کرتے۔ مرحوم انوری صاحب کا نو دس سال کی عمر سے وفات تک' احرار اور ہمارے خاندان سے گہرا تعلّق رہا۔ وہ مجلس احرار اسلام پاکستان کے ناظم اعلیٰ اور صدر کے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ ان کے والد ماجد مولوی برخوردار صاحب مرحوم سے لے کر نواسوں تک تین نسلوں کا تعلّق ابھی تک الحمدللہ نبھ رہا ہے۔ مولوی برخوردار رحمتہ اللہ علیہ ملتان میں ابا جی کے ابتدائی رفقاء میں سے تھے اور دل وجان سے فدا تھے۔ اُن کے متعلّق ابا جی فرمایا کرتے کہ:

'' جب ملتان میں ہر رات میرے قتل کی رات ہوتی (مخالف منصوبے بناتے تھے)

' تو مولوی برخوردار میرا پہرے دار ہوتا تھا۔''

سکھر جیل میں ملاقات:

۱۹۵۳ء کی تحریک تحفّظِ ختم نبوت میں جب ابا جی قید تھے تو کئی مہینوں کی کوشش کے بعد ملاقات کی اجازت ملی ۔تینوں چھوٹے بھائی عطاء المحسن ، عطاء المؤمن، عطاء المہیمن اور میں' ابوالکفیل (حافظ سید محمد وکیل شاہ صاحب) کے ساتھ ملتان سے سکھر' ابا جی سے ملنے گئے ۔ان کوتو جیل کے اندر جانے کی اجازت نہ دی گئی کہ جیل قوانین کے مطابق ''داماد اہل خانہ میں شامل نہیں''۔ وہ باہر کھڑے رہے ۔ہم چاروں بہن بھائی جیل کے پھاٹک پر کھڑے تھے کہ سامنے سے ہشاش بشاش ابا جی آتے دکھائی دیئیے ۔ابوالکفیل تو باہر کھڑے صرف مصافحہ ہی کر سکے ۔سنتری نے تالا کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے ۔ڈیوڑھی میں سیڑھیاں تھیں ۔ابا جی ہمارے ساتھ ہی اوپر آ گئے ۔کمرے میں ایک لمبا میز اور کرسیاں رکھی تھیں ۔ایک پر جیلر بیٹھ گیا ، ایک پر ابا جی اور باقی پر ہم ۔گھر کا حال پوچھا' بھائیوں سے تعلیم کا پوچھا ، نصیحتیں کیں ۔ابا جی نے جیلر سے پوچھا کہ داماد کو ملاقات کی اجازت کیوں نہیں؟ وہ کہنے لگا ''داماد'' کیا ہوتا ہے؟ بھائی عطاء المحسن نے کہا ''سَن اِن لاء'' (Son In Law)' تو پھر اس نے قانونی مجبوری بیان کی ۔پون گھنٹہ کے قریب ہم بیٹھے ۔حبس ،تپش ،خراب آب و ہوا، ناقص غذا اور اسی قسم کی دیگر ابتلاؤں کے سبب صحت بہت دگر گوں تھی ۔بالخصوص چہرہ اور سینہ پھوڑوں پھنسیوں سے بھرا ہوا تھا ۔مگر ابا جی نے اپنی کسی تکلیف کا ذکر تک نہیں فرمایا ۔پھر وہ ہمارے ساتھ ہی سیڑھیاں اترے اور اتنی بات کہی کہ رات رکنا مت 'شاید آج ہی چاند ہو جائے ۔شعبان کی اس دن انتیس تھی ۔اور پھر ہم تو سلاخوں سے لگے انہیں جیل کے اندر جاتا دیکھتے رہے' جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے ۔انھوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا ۔رہِ عشقِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مسافر پیچھے مڑ کر دیکھا بھی کب کرتے ہیں ۔

سردار عبدالرب نشتر:

جب سردار عبدالرب نشتر گورنر پنجاب تھے ، ملتان دورہ پر آئے اور چلے گئے ۔ابا جی کا قیام ملتان ان کے علم میں تھا ۔ بیماری کا یہاں پتا چلا ہو گا ۔ بہر حال عیادت کا خط انھوں نے حیدر آباد (سندھ) سے لکھا ۔ مجھے یاد ہے ۴۲ء یا ۴۳ء میں ابا جی نے سرحد کا دورہ کیا تو آکر بتایا تھا کہ نشتر صاحب نے بھی دعوت کی تھی ۔کیا دور تھا ؟ علی گل خان صاحب سرحد کے کانگریسی لیڈر ، سردار اورنگزیب خان لیگی لیڈر ، سب نے دعوتیں کیں ۔ ملتان میں نشتر صاحب کے ملاقات نہ

کرنے اور خط لکھنے پر ابا جی نے ارتجالاً یہ شعر کہا اور یہی خط کے جواب میں لکھ بھیجا:

نوشتی نامۂ از حیدر آباد

بملتاں جانِ زارم راندیدی

پھر نہ تو جواب آیا' نہ کبھی اور خط!

ایک بات اور یاد آئی۔ ابا جی بتلاتے تھے کہ عبدالرب نشتر کے ہاں ایک صاحب باورچی تھے۔ جو بالکل ان پڑھ تھے۔ لیکن شعر کہہ لیتے تھے۔ ایک شعر اُن کا ابا جی نے سنایا بھی تھا کہ

اِنہی آنکھوں سے میں نے جاتے دیکھا ہے جوانی کو

جوانی ' وہ جوانی جس کو پھر آنا نہیں آتا

قاضی عبیداللہ:

قبل از تقسیم ایک دفعہ ضلع ملتان ہی کے ایک گاؤں محبّت پور' تحصیل میلسی (اب ضلع وہاڑی) تشریف لے گئے۔ قاضی عبیداللہ صاحب مرحوم داعی تھے۔ (جن کو کسی شقی القلب نے کچھ عرصہ ہوا شہید کر دیا)۔ انھوں نے اپنے مکان کے صحن میں ہی بستر بچھا دیا۔ فرمانے لگے میں نے اسے کہا کہ میرا بستر گھر سے باہر کھلی جگہ بچھا دو۔ بہنوں بچیوں کو تنگی نہ ہو۔ فرماتے میں باہر سو گیا' آدھی رات کا عمل ہوگا کہ ایک بڑے زوردار دھماکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ چاروں طرف دیکھا' کوئی آدم نہ کوئی آدم زاد لیکن بارود کی سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر سوچا پھر صاحب خانہ کو جگایا اور چارپائی وہاں سے اٹھا کر گھر میں ایک طرف بچھانے کو کہا۔ وہ حیران تو ہوا کہ پہلے منتوں کے باوجود شاہ جی اندر نہیں سوئے' اب کیا بات ہوئی۔ میں نے پوچھا:

''ابا جی پھر یہ کیا تھا؟''

فرمانے لگے:

''اللہ تعالیٰ کو مجھے وہاں سے اٹھانا مقصود تھا''۔ پھر فرمایا ......وہ (بارود کی سی) بو فالج کے پہلے حملہ تک میرے دماغ میں تھی' اب نہیں ہے!

چچا سید محمد شفیع شاہ صاحب رحمہ اللہ:

میرے سسر سید محمد شفیع شاہ صاحب رحمہ اللہ' ابا جی کے واقعات سنایا کرتے۔ اُن کی وفات کے بعد بتایا کہ جس دن بخاری صاحب فوت ہوئے' میں' عبدالحکیم سے ملتان چھاؤنی

ریلوے اسٹیشن پر آیا، دیکھا کہ ایک آدمی بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس روز کا اخبار تھا۔ وہ اخبار کھولتا خبر پڑھتا اور دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیتا۔ کئی بار اس نے ایسا ہی کیا۔ میں اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس شخص کا خاندانی تعلّق تو کوئی نہیں محض لوجہ اللہ محبّت سے اس کا یہ حال ہے۔

ابا جی کی زندگی میں انھوں نے مجھے ایک دفعہ سنایا کہ ہم (کوئی اور صاحب بھی ساتھ تھے) ملتان آئے، تانگہ میں بیٹھے تو ایک پولیس کا سپاہی بھی سوار ہو گیا اور پھر بغیر کرایہ دیے اپنی منزل مقصود پر اتر گیا۔ جب ہم تانگے سے اتر کر شاہ جی کے گھر سے قریبی میدان کی طرف چلے تو دو آدمی شاہ جی سے مل کر واپس جا رہے تھے اور آپس میں بات کر رہے تھے کہ خدا کا شکر ہے ہم نے جو ہدیہ پیش کیا شاہ جی نے قبول فرما لیا۔ تو میں نے سوچا' یہ ہیں تصویر کے دو رخ۔ ایک نے از خود حق جتلایا اور تانگے والے نے پس پشت گالیاں دیں۔ ایک یہ ہیں کہ دے کر شکر گزار ہیں کہ ہدیہ قبول ہوا۔

گھر والوں کو سلام؟

ایک اور واقعہ سنایا کہ ''کوٹ ملانہ'' عبدالحکیم (تحصیل کبیر والہ) کے نواح میں گاؤں ہے۔ ابا جی نے پاکستان سے قبل وہاں تقریر کی اور دیہاتیوں کو گھر میں داخل ہوتے وقت سلام کر کے داخل ہونے کی تلقین کی۔ فرماتے' تقریر ختم ہو چکی تو ایک اجڈ دیہاتی دوسرے سے کہنے لگا: بڑی تعریف سنی تھی...... ''پیر عطاء اللہ شاہ بڑے وعظ کریندا اے، ایہو وعظ کریندا اے؟ جو گھر ونجو تے دھی مائی بیٹھی ہووے تاں آکھو ''السّلام علیکم''...... بُڈ ای نہ مریوے''

یعنی پیر عطاء اللہ شاہ کی بڑی تعریف سنی تھی۔ یہی وعظ کرتا ہے؟ کہ گھر جاؤ اور بیٹی بھی بیٹھی ہو تو کہو ''السّلام علیکم'' ڈوب کر نہ مر جائیں؟...... جہالت کا اندازہ لگائیں کہ سلام کرنا ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ وہ سچ ہی تو کہتے تھے میں نے بنجر زمینوں میں ہل چلائے ہیں۔ بے شمار دیہات میں کئی کئی گھنٹے صرف السّلام علیکم کے موضوع پر تقریریں کیں۔

تقریر میں تفہیم:

ابا جی نے ایک واقعہ سنایا کہ ضلع مظفر گڑھ میں کسی جگہ جلسہ تھا دو اڑھائی گھنٹے وعظ کے بعد پوچھا کہ اب آپ کو مسائل کی سمجھ آ گئی ہو گی؟ تو جلسہ میں سے متفقہ آواز آئی ''سائیں کوء''...... یعنی کچھ نہیں جناب! فرماتے تھے پھر دوبارہ گھنٹہ دو گھنٹہ لگا کر ان کو مسائل ضرور یہ ذہن نشین کرائے' پھر پوچھا کہ اب سمجھ آ گئی ہے؟ تو حاضرین نے اپنی علاقائی زبان میں جواب دیا: ''جی آ'' اب سمجھ آ گئی ہے۔ تب تقریر ختم کی۔

پیر سید خورشید احمد شاہ ہمدانی رحمہ اللہ:

چچا جان سید محمد شفیع شاہ رحمہ اللہ ایک اور قصہ بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتے ۔
عبدالحکیم کے معروف بزرگ پیر سید خورشید احمد شاہ صاحب رحمہ اللہ سے بھی ابا جی کا بہت تعلّق تھا۔ وہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اموی رحمہ اللہ سے بیعت اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز تھے ۔ اپنے چک میں جلسہ کراتے اور ابا جی کو تقریر کے لیے بلاتے ۔ ایک دفعہ پیر صاحب کا ایک بچہ حادثاتی طور پر فوت ہو گیا۔ کہیں سے ماچس ہاتھ آ گئی' تیلیاں جلا جلا کر پھینکتا رہا' آخر قمیص کو آگ لگ گئی اور وہ بے چارا جھلس گیا اور انتقال کر گیا ۔ ابا جی جلسہ پر عبدالحکیم (ضلع خانیوال) آئے' اس حادثہ کا پتا چلا تو انہوں نے تعزیت کے لیے چک میں جانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ پیر سید مبارک شاہ صاحب بغدادی مرحوم، چچا جان اور غالبًا حافظ محمد حسین صاحب مرحوم بھی جو پیر صاحب کے بڑے چہیتے شاگرد اور مرید تھے ساتھ گئے ۔ وہاں پہنچ کر تعزیت کی ۔ چچا جان فرمایا کرتے کہ تب تک میں صرف بخاری صاحب کی تقریروں کا سامع تھا، سلام و مصافحہ ہوتا اور بس! نماز ظہر کے بعد مسجد میں سب بزرگ جمع تھے کہ بخاری صاحب نے کہا: ''مبارک شاہ! اس وقت ہم تین سید یہاں اکٹھے ہیں آؤ دعاء کریں ۔ آج اللہ تعالیٰ سے پیر خورشید شاہ کو تین بیٹے لے کر دینے ہیں''۔ اس اثنا میں پیر صاحب کے ہاں سے کھانا آیا تو فرمانے لگے: کھانا بعد میں کھائیں گے پہلے دعاء کریں گے ۔ چچا جان کہتے تھے کہ مسجد کے دالان میں ایک طرف بیٹھا ہوا میں دل میں سوچ رہا تھا کہ ان کو اللہ تعالیٰ پر اتنا اعتماد ہے؟ کہ بڑے زور سے کہہ رہے ہیں تین بیٹے لے کر دینے ہیں۔ فرماتے تینوں بڑی دیر تک دعاء میں مصروف رہے اور دعاء بخاری صاحب نے ہی کرائی ۔ چچا جان مرحوم روایتی کرامات کے کچھ زیادہ معترف بزرگ نہ تھے مگر یہ قصہ جب ان کو یاد آ جاتا بڑے انبساط سے سناتے اور کہتے کہ اس روز کی دعاء کی قبولیت دیکھی ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تین ہی بیٹے پیر صاحب کو عطاء کیے۔

حافظ کے اشعار:

جیٹھ بھٹہ (تحصیل خان پور) کے ایک مولوی صاحب (غالبًا اللہ بخش نام) بھائی جان سے رحیم یار خان جیل میں ملے تو یہ واقعہ سنایا کہ: ابا جی سے ملنے ملتان آئے تو انھوں نے حافظ کے یہ اشعار سنائے

باغباں گر پنجروزہ صحبتِ گل بایدش
بر جفائے خار ہجراں صبرِ بلبل بایدش

اے دل اندر بندِ زلفش از پریشانی منال
مرغ زیرک چوں بدام اُفتد تحمّل بایدش

ابا جی فرماتے:

''ہر شاعر کا ہر شعر اچھا نہیں ہوتا۔ حافظؔ کا کمال یہ ہے کہ اس کا ہر شعر اچھا ہے۔ حضرت مولانا تھانویؒ نے کہیں فرمایا ہے کہ: ''مشہور ہے تفسیر کشاف کا حاشیہ حافظ شیرازی نے لکھا ہے: اللہ تعالیٰ ایسے کام بُرے آدمی سے نہیں لیتا''۔

حضرت مولانا غلام محمد گھوٹوی رحمہ اللہ:

جامعہ عباسیہ بہاول پور کے ایک متعلم مولوی صاحب مدینہ طیبہ میں برادرِ عزیز پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری سلمہ سے ملے اور سنایا کہ ان کے دور طالب علمی میں ابا جی جامعہ عباسیہ آئے اور ہم طلباء کے درمیان بیٹھے تھے کہ شیخ الجامعہ حضرت مولانا غلام محمد گھوٹوی تشریف لائے اور دیکھ کر فرمایا۔

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

تو ابا جی نے کہا مولانا یہ تو بہت پرانا ہے۔ اسے چھوڑ یئے اور یہ سنیئے:

دلم با زلفِ جاناں می نشیند
پریشاں با پریشاں می نشیند

مولانا شعر سن کر پھڑک اٹھے اور دیر تک داد دیتے رہے۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ:

ابا جی ایک دفعہ دِلّی میں ٹھہرے ہوئے تھے' اور بیمار تھے۔ غالبًا بخار تھا۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو پتا چلا تو عیادت کے لیے تشریف لائے۔ فرمانے لگے: ''شاہ جی! تم اپنے وجود کو اپنا مت سمجھو۔ تم سب کے ہو۔ تم تو اسلام کی مشین ہو۔'' اور حقیقت بھی یہی تھی کہ انھوں نے کبھی اپنے وجود کو اپنا نہ سمجھا تھا۔ ہر دینی تحریک کے لیے جان کھپائی، ہر قومی مفاد کے تحفّظ کے لیے سینہ سپر ہوئے۔ یہ اُسی اخلاص اور للہیت کا اعجاز تھا کہ ہر طبقے میں اُن کے لیے احترام تھا، پزیرائی تھی۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو جب علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا انتقال ہوا تو ابا جی ریاست بہاول پور ہی کے نواحی علاقوں فاضل پور، حاصل پور وغیرہ کے دورہ پر تھے۔ اُسی دن بہاول پور پہنچے۔ مولانا محمد علی

جالندھریؒ اور جانباز مرزا صاحبؒ ساتھ تھے۔ پہلے جانباز صاحب پلیٹ فارم پر اترے۔ علامہ کے انتقال کی خبر سنی تو اسٹیشن سے ہی مخدوم زادہ حسن محمود کی کوٹھی پر پہنچے جہاں حضرت علامہ ٹھہرے ہوئے تھے اور انتقال بھی وہیں ہوا۔ ابا جی فرماتے تھے کہ میں پہنچا تو مولانا بدرِ عالمؒ میت کے پاس موجود تھے۔ میں نے چہرہ دیکھنے کی اجازت چاہی تو مولانا نے فرمایا کہ آپ کا حق سب سے زیادہ ہے۔ وہ آپ ہی کے تو تھے۔ ابا جی فرماتے تھے میں نے چہرہ دیکھا پھر ماتھے کا بوسہ لیا۔ اُس وقت کافور کی تیز بو میرے ناک میں داخل ہوئی۔ حضرت علامہؒ کے سینے پر نیلاہٹ نمایاں تھی، جیسے داغ پڑ جاتے ہیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ علامہ عثمانی کو زہر دے کر مارا گیا ہے۔ علامہ عثمانی، تحریکِ پاکستان کے فیصلہ کن دنوں میں کیے گئے وعدوں کی تکمیل کا شدت سے تقاضا فرما رہے تھے جب کہ مسلم لیگی حکومت اس پر بہت جز بز تھی۔ قراردادِ مقاصد کی منظوری، تنہا علامہ عثمانی کے وجود کی مرہونِ منت تھی۔ ابا جی علامہ عثمانی کا جنازہ پڑھ کر گھر واپس آئے تو بہت ہی افسردہ اور نڈھال تھے۔ کافور کی جس بو کا وہ ذکر فرماتے تھے، اُس کا اثر اتنا شدید تھا کہ دو اڑھائی ماہ بیمار رہے، نمونیا ہو گیا، حضرت عثمانی کی وفات کے صدمہ سے بھی انتہائی مغموم تھے، طبیعت اعتدال پر نہ آسکے، کمزوری سے بالکل بے بس ہو گئے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ:

ایک بار حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ذکر ہو رہا تھا۔ ابا جی نے ایک واقعہ سنایا کہ جمعیت العلماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس تھا مراد آباد میں (سنہ غالباً ۱۹۳۷ء بتلایا)۔ فرمانے لگے: مجھے بھی باقاعدہ دعوت دے کر بلایا گیا تھا۔ میں اجلاس میں پہنچا۔ حضرت مدنیؒ سے سامنا ہوا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ حضرت نے میرے ہاتھ جھٹک دیئے اور سخت خفگی کے عالم میں فرمایا: ''جی ہاں، باہر مخالفت کرتے ہیں، گالیاں بھی دیتے ہیں اور اندر مصافحے بھی کرتے ہیں۔'' ابا جی فرمانے لگے کہ مجھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرے کلیجے میں گولی مار دی ہو۔ اصل میں اس تلخی اور شکر رنجی کا ایک پس منظر تھا۔ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں حضرت مدنیؒ کی قیادت میں، جمعیت علماء ہند نے اچانک مسلم لیگ سے تعاون کا فیصلہ کیا۔ ان حضرات کو لیگی قیادت نے یقین دلایا کہ لیگ کی حکومت بن جانے کی صورت میں سُنّی اوقاف الگ بنایا جائے گا۔ سنی قبرستان جدا کر دیئے جائیں گے۔ فقہ حنفی کے مطابق قاضی مقرر کیے جائیں گے۔ شاردا ایکٹ (کم سنی کی شادی کی ممانعت) منسوخ کرایا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیگ سے

یہ عہد و پیمان باندھتے وقت اکابر احرار کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ جس کا انہیں بجا طور پر رنج تھا۔ یوں بھی لیگ کی اور ان ''انتخابی وعدوں'' کی حقیقت ان حضرات کو خوب معلوم تھی ۔ بعد کے حالات وواقعات نے تو حقیقت اور بھی واضح کردی، جب جمعیت کو اپنی پرانی پوزیشن پر واپس آنا پڑا۔ لیکن تب تک ''حریفوں'' کا داؤ چل چکا تھا اور جمعیت کے بزرگوں نے ہمیشہ کے حلیفوں اور ارادت مندوں کے حلقۂ اخلاص سے بالا بالا لابعض انوکھے فیصلے فرما لیے تھے۔ نتیجہ اس کا جو نکلنا تھا وہی نکلا۔ انتخابات میں احرار اور اس کے حمایت یافتہ امیدواروں کا مقابلہ کتنی ہی جگہ جمعیت کے حمایت یافتہ امیدواروں سے رہا۔ پھر خواہ جتنی بھی ''احتیاطیں'' فرمائی جاتی رہیں، تقریریں دونوں طرف کے حضرات کو ایک دوسرے کے مقابلے ہی میں کرنا پڑیں ۔ البتہ باہمی احترام اور تعلّق کو بہر حال ملحوظ رکھا گیا ۔ اپنوں کو باہم جدا کرنے کے اس ''کارِخیر'' میں جو حضرات شریک تھے۔

انھوں نے ایک اور کام یہ کیا کہ حضرت مدنیؒ سے کہا گیا کہ احرار والے آپ کو اور جمعیت العلماء کو گالیاں دیتے ہیں ۔ نامزد ملزم بطورِ خاص ، ابا جی ٹھہرائے گئے۔ یہ اُسی پراپیگنڈے کا اثر تھا کہ حضرت مدنیؒ نے اس انداز میں اظہارِ ناراضی فرمایا۔ ابا جی فرمانے لگے کہ حضرت مدنیؒ کی اس برہمی کا مجھ پر اتنا شدید اثر ہوا کہ میں وہیں سے پلٹ گیا۔ اجلاس میں نہیں بیٹھا۔ واپس جائے قیام پر پہنچا اور ساتھیوں سے کہا: ''میرا بستر اٹھاؤ اور سامان باندھو۔'' کئی حضرات آڑے آئے لیکن میں نے ایک ہی بات کہی کہ جہاں بزرگ چھوٹوں پر اعتماد نہ کریں اور اختلافِ رائے بھی برداشت نہ کرسکیں، وہاں مل بیٹھنے کا فائدہ؟ اب مجھے روکتا کون؟ اتنے میں کسی نے مفتی کفایت اللہؒ صاحب کو خبر کردی ۔ انھوں نے فوراً مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کو میری طرف دوڑایا۔ مولانا بھاگم بھاگ پہنچے ۔ کہنے لگے مجھے مفتی صاحب نے بھیجا ہے اور فرمارہے ہیں آپ کو کہیں نہیں جانا۔ فوراً واپس آجائیے ۔ ابا جی فرماتے تھے کہ میں سب کو انکار کرسکتا تھا لیکن مفتی صاحب کو نہیں۔ ان کا میرا تعلّق ہی ایسا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے انھوں نے فرمایا بھی یہی کہ بخاری سے جا کر کہو تمہیں مفتی صاحب بلاتے ہیں، اور کسی کے بلانے سے وہ نہیں آنے کا۔ چنانچہ میں حاضر ہوگیا۔ اجلاس جاری تھا۔ مفتی صاحب کی شہ پا کر میں بھی کھڑا ہوگیا ۔ میں نے کہا: ''حضرات! مصافحہ کرنا نہ کرنا تو پھر دیکھا جائے گا۔ میرا ایک ہی سوال ہے کہ حضرت مدنی ہمارے بزرگ تھے ۔ انھوں نے ہمیں گھروں سے نکالا، ہماری بیویوں کو بیوگی کی زندگی گزارنے پر

مجبور کیا۔انھوں نے ہمارے بچوں کو ہماری زندگی میں یتیمی کے سائے سے ہم کنار کیا۔ان کو بیٹھے بٹھائے کیا ہوا کہ یہ ہم جیسے چھوٹوں اور خادموں سے پوچھے بغیر مسلم لیگ کے ساتھ چلے گئے ۔انھوں نے زیادتی بھی ہمیں پر کی اور الٹا ناراض بھی ہمیں پر ہوں؟ یہ پہلے اپنی صفائی دیں' پھر میں بتاؤں گا کہ گالی کس نے دی ہے اور کس نے نہیں دی؟'' حضرت مدنیؒ خاموش بیٹھے رہے۔مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ان کے کان میں کہا کہ بھائی مولانا حسین احمد صاحب! آپ کی بھی ایک رائے تھی اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی بھی ایک رائے تھی۔اس میں یہ گالی گلوچ کا قصہ کہاں سے آن ٹپکا؟ اور پھر ناراض ہونے کی بات کونسی ہے؟ نہ آپ اپنی رائے سے ہٹے اور نہ عطاء اللہ شاہ اپنی رائے سے۔بات تو دونوں ہی کی برابر رہی۔اب غصہ کس بات پر؟ حضرت مدنیؒ چپکے سنتے رہے ۔جواباً کچھ بھی ارشاد نہیں فرمایا۔میٹنگ برخاست ہوئی تو میں اپنے کمرے میں آ گیا۔مجلس احرار اسلام یوپی کے ساتھی وہیں بیٹھے تھے ۔اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ (حضرت مدنی)......رحمہ اللہ' اپنے جھول جبے کے ساتھ جھومتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔دل میں ڈرا کہ ضرور شامت آئے گی اور درگت بنے گی۔میٹنگ میں تو بچ گیا تھا' اب میرا کچومر نکلے گا۔یہ کہہ کر اباجی رو پڑے۔بھائی جان سے فرمایا: حافظ جی! تم بھی ہوتے تو اس وقت بھاگ جاتے ۔کوئی میرا کتنا ہی وفادار دوست کیوں نہ ہوتا' اگر میں نے یوں اس سے کچھ کہا سنا ہوتا تو وہ قیامت تک کے لیے مجھ سے ٹوٹ کر چلا جاتا......لیکن مولانا مدنی آتے ہی فرمانے لگے:

> ''بھائی شاہ جی! کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ میری بات مان لیتے ہیں۔یہ ڈائری میرے ہاتھ میں ہے اور یہ دھام پور، یہ چاندپور، یہ بجنور کے دوستوں نے مجھ سے اصرار کیا ہے کہ آپ سے وقت لے دوں۔''

میں نے کہا حضرت! میں تو آپ کا خادم ہوں۔میری ڈائری بھی آپ ہی کی ہے۔اپنے قلم سے جا ہے جتنی تاریخیں مقرر فرما دیجیے۔بخاری ویسے کا ویسا حاضر ہے۔

جمعیت علماء ہند کا اجلاس امروہہ:

جمعیت علماء ہند یا ہندوستان کے علماء پر جب بھی کوئی مشکل وقت آیا تو انھوں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو ہی آواز دی اور وہ اُن کی مدد کو دیوانہ وار آگے بڑھے۔انھوں نے اپنی جماعت مجلس احرار اسلام کو علماء کی خدمت وحفاظت کے لیے وقف کیا ہوا تھا۔وہ ایک طویل عرصہ جمعیت علماء

ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی رہے۔ ۱۹۳۰ء میں جمعیت علماء ہند اور مولانا محمد علی جوہر میں شدید اختلاف ہوگیا۔ مولانا جوہر نے مقابلے میں ''جمعیت علماء'' بنالی۔ جمعیت علماء ہند نے امروہہ میں اجلاس رکھا تو مولانا جوہر نے بھی اسی تاریخ کو اپنی ''جمعیت علماء'' کا اجلاس مقابلے میں رکھ دیا۔ حالات انتہائی کشیدہ ہوگئے۔ آخر ابا جی کو تقریر کے لیے بلایا گیا اور انھوں نے اس صورت حال پر قابو پالیا۔ مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ نے ابا جی کے انتقال پر اپنے مضمون میں لکھا کہ:

''جمعیت علماء ہند کے مخالفین سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خطاب کے سحر میں گرفتار ہوگئے اور اجلاس کامیاب ہوگیا۔''

جمعیت علماء ہند کا اجلاس لاہور:

۱۹۴۲ء میں جمعیت علماء ہند کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ لیگی شرپسندوں نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی تقریر میں ہنگامہ کردیا اور جلسہ اکھڑ گیا۔ ابا جی تڑپ کر اٹھے اور گرج دار آواز میں احرار کارکنوں کو حکم دیا کہ جلسہ گاہ سے شرپسندوں کو فوراً نکال دو۔ بس پھر کیا تھا۔ سرخ پوش احرار مجاہدوں کی کلہاڑیاں فضا میں لہرائیں اور چند منٹ میں سکون ہوگیا۔ حضرت مدنی سے فرمایا: اب تشریف لائیے اور خطاب فرمائیے۔ چنانچہ جہاں پر خطاب کا سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ حضرت مدنی نے وہیں سے شروع کرکے مکمّل کیا۔ دوسرے دن کے اجلاس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے خطاب کیا۔ احرار رضا کاروں نے جمعیت علماء کے اجلاس کا سارا انتظام سنبھال کر کامیاب کرایا۔ بھائی جان (مولانا سید ابوذر بخاریؒ) خاص طور پر حضرت مدنی اور مولانا آزاد کی زیارت اور خطاب سننے کے لیے اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔ مولانا آزاد سے مصافحہ کرتے ہوئے کسی نے تعارف کرادیا کہ ''شاہ جی کے بیٹے ہیں'' مولانا نے بڑی محبّت سے فرمایا: ''ہاں میرے بھائی وہ تو ان کے چہرے سے ظاہر ہے۔''

احرار کانفرنس قادیان:

۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۴ء احرار تبلیغ کانفرنس قادیان میں منعقد ہوئی تو ہندوستان بھر کے علماء اس میں شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس قادیانیت کے خلاف مجلس احرارِ اسلام کی جدوجہد میں سنگِ میل ثابت ہوئی۔ یہ ایک فیصلہ کن معرکہ تھا۔ آخری اجلاس کی صدارت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمائی اور خطاب ابا جی نے کیا۔ حضرت مدنیؒ قادیان پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر احرار کارکنوں نے پرجوش استقبال کیا۔ ابا جی انہیں موٹر کار میں لے کر ایک بہت بڑے جلوس کے ساتھ جلسہ گاہ پہنچے۔

احرار کانفرنس دہلی:

اپریل ۱۹۴۶ء میں اردو پارک دہلی میں احرار کانفرنس کی صدارت بھی حضرت مدنیؒ نے فرمائی۔ ابا جی نے ''پاکستان'' کے عنوان پر تاریخی خطاب فرمایا۔ جس کا ایک ایک لفظ سچ ہو کر رہا۔ اُس وقت انھوں نے جو کچھ کہا' آج پاکستان کے حالات ہو بہو اس کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔

حضرت مدنی کی بے نفسی:

ابا جی فرماتے کہ ایک جلسہ میں رات گئے تک تقریر کر کے آیا اور سو گیا۔ نمازِ فجر کے وقت کوئی شخص میرے پاؤں دبا رہا تھا۔ ان کے دبانے سے نیند کیا آنی تھی وہ تو کافور ہو گئی۔ میں نے دیکھا تو وہ حضرت مدنی تھے۔ ہڑبڑا کر اٹھا اور عرض کیا:

''حضرت! ہم نے دوزخ میں جانے کے لیے پہلے کیا تھوڑا انتظام کر رکھا ہے جو آپ ہمیں اس طرح دھکیل رہے ہیں۔''

فرمانے لگے:

''بھائی شاہ جی! نمازِ فجر کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا آپ تھکے ہوئے ہیں آپ کو اٹھا دوں تا کہ نماز مل جائے۔''

کیا لوگ تھے وہ اور اُن کی بے نفسی کا کیا عالم تھا۔ اخلاص وللّٰہیت اور محبّت وشفقت کے پیکر تھے۔ آج اُن کی مثال ملنا محال ہے۔

حضرت مفتی کفایت اللّٰہ دہلویؒ:

حضرت مفتی کفایت اللّٰہ رحمتہ اللّٰہ علیہ سے ابا جی کو بہت اُنس تھا۔ وہ اپنے علم، تقویٰ، تفقہ فی الدین اور اخلاص وللّٰہیت میں ایک عظیم انسان تھے۔ مفتی صاحب اپنے عہد کے بہت بڑے فقیہہ تھے۔ اسی لیے انہیں ''ابوحنیفۂ ہند'' کہا جاتا۔ کسی فتوے پر ان کے دستخط ہی سند ہوتے۔ علماء اور عام مسلمانوں کو اُن پر کامل اعتماد تھا۔ چھوٹوں پر شفقت اور اُن کی حوصلہ افزائی اُن کا وصفِ خاص تھا۔ وہ جمعیت علماء ہند کے صدر ہونے کے باوجود سب کے محبوب تھے۔ مجلس احرار اسلام کی ہمیشہ سرپرستی فرمائی۔ تحریک کشمیر (۱۹۳۲ء) ہو یا تحریک تحفّظ ختم نبوت (۱۹۳۴ء) ہر موقع پر مجلس احرار اسلام کی تائید فرمائی۔ تحریک کشمیر میں احرار کا بھرپور ساتھ دیا اور ملتان جیل میں ابا جی کے ساتھ قید ہوئے۔ اسی طرح اکتوبر ۱۹۳۴ء میں قادیان میں احرار تبلیغ کانفرنس میں بھی

شریک ہوئے اور مکمّل سر پرستی فرمائی۔ اسی شفقت وسر پرستی کی وجہ سے کئی حاسدین ابا جی کے خلاف حضرت مفتی صاحب کے کان بھرتے اور مفتی صاحب سنی ان سنی کر کے انہیں مایوس کرتے۔ جس طرح حضرت مدنیؒ سے بعض لوگوں نے کہا کہ عطاء اللہ شاہ بخاری نے آپ کو گالیاں دی ہیں ‘اسی طرح حضرت مفتی صاحب کو بھی ایک صاحب نے یہی جملہ کہا۔ ابا جی فرماتے:

’’میرا جب بھی دہلی میں قیام ہوتا تو صبح کا ناشتہ ہمیشہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے ہاں ہوتا۔ اور میں اپنے اس معمول کو فرض کی طرح پورا کرتا۔ کسی صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے کہا کہ عطاء اللہ شاہ بخاری نے آپ کو گالیاں دی ہیں۔ مفتی صاحب نے کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اُن صاحب نے کہا کہ حضرت! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ عطاء اللہ شاہ نے آپ کو گالیاں دی ہیں۔ ابا جی فرماتے کہ اس شخص کے قسم کھانے پر مفتی صاحب نے اس کا ایمان بچانے کی کوشش کی اور فرمایا کہ بھائی! پھر مجھ میں ہی کوئی نقص ہوگا ورنہ عطاء اللہ شاہ ایسے تو مجھے گالیاں نہیں دیتے۔ ابا جی فرماتے کہ یہ تمام قصہ میرے علم میں آ چکا تھا اور اِنھی دنوں حسبِ معمول میں صبح کے ناشتے پر حاضر ہوا۔ مفتی صاحب میرے لیے چائے بنا رہے تھے اور زیر لب مسکرا بھی رہے تھے۔ فرمانے لگے:

’’شاہ جی! سنا ہے آپ ہمیں گالیاں دینے لگے ہو۔‘‘

میں نے جواباً عرض کیا:

’’حضرت! میں مفتی کفایت اللہ کو گالیاں نہیں دوں گا تو اور کس کو دوں گا؟ سارے ہندوستان میں ایک آپ ہی تو ہیں جو میری گالیوں کے جواب میں مجھے دعائیں دیں گے۔‘‘

میرے اس جواب پر حضرت مفتی صاحب مسکرائے اور بات یہیں ختم ہوگئی۔‘‘

ایک دفعہ فرمایا کہ حضرت مفتی کفایت اللہؒ کو تحریر وانشاء پر بھی بہت قدرت حاصل تھی۔ غضب کے خوش خط تھے۔ ان کی تحریر کسی خوش نویس کی کتابت معلوم ہوتی۔ کانگریس کے اجلاسوں میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی موجودگی میں بھی قراردادیں وہی مرتب کرتے اور لکھتے۔ ایسی جامع اور مربوط عبارت ہوتی کہ کہیں سے ایک لفظ بھی کم کردیں یا بڑھادیں تو ساری قرارداد بے ربط ہوجاتی۔ اجلاس میں طے شدہ پالیسیوں کو منتخب اور خوبصورت الفاظ کے موتیوں میں پرونا اُن کے فنِ انشاء کا کمال تھا۔

دِلّی سے حضرت مفتی کفایت اللہؒ کے انتقال کی خبر (۳۱ ردسمبر ۱۹۵۲ء) آئی تو ابا جی فرمانے لگے:

''دو روز قبل میں نے خواب میں دیکھا کہ میری عینک گر کر ٹوٹ گئی۔ میں تب سے متفکّر تھا۔ مفتی صاحبؒ میری عینک ہی تو تھے۔''

مفتی صاحبؒ سے ابا جی کا تعلّق نہایت گہرا تھا۔ میرا نام ''صادقہ'' مفتی صاحب نے ہی تجویز کیا تھا۔ اُن دنوں ۱۹۳۲ء کی تحریک کشمیر کے سلسلے میں وہ اور ابا جی ملتان جیل میں اکٹھّے تھے۔ ابا جی فرماتے کہ جیل میں مفتی صاحب شدید بیمار ہو گئے اور مجھے اُن کی خدمت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس خدمت پر مجھے بے انتہا دعائیں دیں جو میری زندگی کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اُنہی دنوں کی ایک یادگار نظم ہے جو مفتی صاحب نے ابا جی کی رہائی پر لکھی تھی۔

ہدیۂ خلوص

بخدمت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

۱۴؍جنوری ۱۹۳۳ء کو صبح کو معلوم ہوا کہ شاہ جی کی آج رہائی ہے اور ابھی جا رہے ہیں۔ فوراً قلم برداشتہ یہ چند شعر لکھے۔ (محمد کفایت اللہ)

چل دیئے ہو کس کو کس پر تم قفس میں چھوڑ کر — رشتۂ اخلاص کو کس بے رخی سے توڑ کر
بیڈمنٹن ساتھ کس کے کھیلیں پنّا[۱] اور پریم[۲] — گوری شنکر[۳] کس کو اب کھینچیں گے بانہیں موڑ کر
کس سے دل بہلائیں گے ہنس کھیل کر احمد سعید[۴] — مظہر[۵] و لدھیانوی[۶] بیٹھیں سر جوڑ کر
بادہ نوشو، لو لپیٹو عیش و عشرت کی بساط — کیونکہ ساقی چل دیا جام و صراحی پھوڑ کر
خیر کچھ پروا نہیں جاؤ خدا حافظ مگر — بھول مت جانا ہمیں غیروں سے رشتہ جوڑ کر
ہوں مبارک تم کو آزادی کے اب لیل و نہار — فتح و نصرت پاؤ تم دشمن کی گردن موڑ کر
شیرِ حریت کی آزادی سے میں تو خوش ہوا — بزدلانِ قوم اب بھاگیں گے میداں چھوڑ کر

مولانا ابوالکلام آزادؒ:

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ابا جی کو بے پناہ عقیدت تھی۔ جدو جہد آزادی میں تقریباً تیس برس مولانا آزاد کی رفاقت حاصل رہی۔ مجلس احرارِ اسلام کے قیام (۱۹۲۹ء) سے پہلے کانگریس کے اسٹیج سے کئی تحریکوں میں وہ مولانا کے ہم سفر رہے۔ تحریک خلافت (۲۱۔۱۹۱۹ء) میں بہت

(۱،۲،۳) تحریکِ آزادی کے کارکن جو ساتھ قید تھے (۴) مولانا احمد سعید دہلوی (۵) مولانا مظہر علی اظہر
(۶) مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

زیادہ قربت رہی۔ وہ مولانا کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اُن کے ہم قدم ہوئے، حصولِ آزادی کے لیے مولانا کے شانہ بشانہ ہم آواز ہوکر انگریز کے غاصبانہ اقتدار کو للکارتے رہے۔ اور دہلی جیل میں مولانا کے ساتھ قید رہے۔ فرماتے:

''مولانا آزاد کے ''الہلال'' نے میری شریانوں میں لہو دوڑایا، میرے ذہن کو جلا بخشی اور سیاسی جدوجہد میں رہنمائی کی۔''احرار''، ''الہلال'' کی بازگشت ہی تو ہیں۔''

الہلال میں ''احرارِ اسلام'' کے مستقل عنوان کے تحت ''ترکانِ احرار'' کی سرگرمیاں شائع ہوتیں۔ بعض مسائل میں مولانا کے تفردات پر کسی نے ابا جی سے سوال کیا کہ آپ مولانا کی رائے سے متفق ہیں؟ فرمایا:

''میں سیاست میں ابوالکلامؒ کا مقلّد ہوں، فقہ میں نہیں۔ فقہی مسائل میں حضرت امام ابوحنفیہ رحمہ اللہ کا مقلّد ہوں۔ ہاں! معارف میں کسی کا مقلّد نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے کئی لوگوں سے بہتر بات سجھا سکتے ہیں۔''

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک موت آسا سکوت طاری تھا اور مایوسیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ انگریزوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا اور خلیفہ کو گرفتار کر کے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کردیا۔ تنہا مولانا آزاد تھے جو ''الہلال'' و''البلاغ'' میں اپنی تحریروں سے مسلمانوں کو جھنجوڑ کر خوابِ غفلت سے بیدار کر رہے تھے۔

بیعتِ امام الہند:

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ سیاسی جمود و تعطّل کو توڑنے کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک امام کی اقتداء میں منظّم کیا جائے۔ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ اپنا دینی فرض سمجھیں۔ پھر امام، انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کرے۔ اِنھی دنوں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تحریک ریشمی رومال کی پاداش میں مالٹا کی قید سے رہا ہوکر آئے تو مولانا آزاد کی خدمات پر انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''ابوالکلام نے جہاد کا بھولا ہوا سبق یاد کرادیا ہے۔''

آزادی کے متوالوں نے مولانا آزاد کو ہی امام الہند قرار دے کر اُن کے ہاتھ پر بیعتِ امامت شروع کردی۔

ابا جی فرماتے:

اِنھی دنوں شاہی مسجد لاہور میں بہت بڑا جلسہ ہوا۔مشہور کانگریسی اور خلافتی رہنما مولانا عبدالقادر قصوریؒ نے مولانا آزاد سے پہلے ایک تقریر کی اور آخر میں غیر مؤثر انداز میں کہا کہ......''لوگو! مولانا آزاد' امام الہند ہیں،آپ سب ان کی بیعت کریں۔'' ابا جی فرماتے ...... میں پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ چند منٹ انتظار کے بعد بھی بیعت کے لیے کوئی آدمی نہ اٹھا۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ ایک ہی جست میں اسٹیج پر پہنچا اور منتظمین سے درخواست کی کہ پانچ منٹ کے لیے مجھے تقریر کی اجازت دیں ۔چنانچہ اس مختصر تقریر میں لوگوں کو سمجھایا کہ یہ ''بیعتِ ارشاد'' نہیں ''بیعتِ امامت'' ہے۔تم میں سے کوئی اگر کسی پیر سے بیعت ہے تو اس بیعت سے وہ بیعت متاثر نہیں ہوگی۔ پھر مولانا کی بیعت کا اعلان کیا تو ہزاروں افراد نے مولانا کے ہاتھ پر بیعتِ امامت و جہاد کی۔

مولانا آزاد کا خراجِ تحسین:

قومی جدو جہد اور تحریک آزادی میں ابا جی کے مجاہدانہ کردار اور خطابتی خدمات خصوصاً تحریک خلافت میں بےلوث خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

> ''شاہ جی! خطابت آپ کو عطیۂ الٰہی ہے۔آپ خطابت کے سمندروں سے موتی نکال لاتے ہیں۔قومی جدو جہد میں آپ کی خدمات پر ملک وملت کا ہر گوشہ آپ کا شکر گزار ہے۔اللہ کے ہاں آپ کا بڑا اجر ہے۔''

مولانا آزاد سے چند یادگار ملاقاتیں:

وزارتی مشن کے دنوں میں ابا جی ایک روز مولانا سے ملاقات کے لیے گئے تو شیخ حسام الدینؒ اور شورش کاشمیریؒ ساتھ تھے۔ میر احمد حسنؒ صاحب کی موٹر میں گئے۔ مولانا' وائسریگل لاج جانے کے لیے کوٹھی کے باہر پریشان کھڑے تھے۔ان کی موٹر سٹارٹ نہ ہو رہی تھی۔ابا جی پہنچے تو سلام و مصافحہ کے بعد مولانا نے فرمایا کہ میں آپ کی موٹر لیے جاتا ہوں۔ابا جی نے کہا حضرت دوش حاضر ہیں۔فرمایا:''میرے بھائی! وہ بوجھ تو آپ اٹھائے ہوئے ہیں''۔ کچھ دیر بعد واپس تشریف لے آئے اور گھنٹہ بھر ملاقات رہی۔چائے بھی پلوائی۔ ''غبارِ خاطر'' چھپ چکی تھی' اس کا ایک نسخہ اپنے دستخط کے ساتھ ہدیہ کیا۔لکھا تھا:''برائے صدیقِ عزیز سید عطاء اللہ شاہ

صاحب بخاری‘‘ ۔اسی ملاقات میں ابا جی نے فرمایا مولانا، اللہ آپ کو عمرِ خضر عطاء فرمائے تو فرمانے لگے: ’’نہیں میرے بھائی تھوڑی ہومگر قرینے کی ہو۔‘‘اس سے پہلے ’’تذکرہ‘‘اور ’’ترجمان القرآن‘‘ بھی ابا جی کو ہدیۃً ہی دی تھیں۔ان پر لکھا تھا برائے ’’محبِّ عزیز سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب‘‘’’غبارِ خاطر‘‘پر ’’صدیق عزیز‘‘ دیکھ کر میں نے کہا ابا جی اب آپ کے مرتبہ میں اضافہ ہوگیا ہے۔ابا جی مسکرانے لگے۔یہ تمام کتابیں تقسیم کے وقت امرتسر میں ہی رہ گئیں۔

دِلّی جیل میں مولانا آزاد کی چائے:

دِلّی جیل کا واقعہ ابا جی نے سنایا تھا۔مولانا آزاد بھی اسی جیل میں تھے اور مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم ومغفور بھی۔ایک روز موقع پا کر ابا جی اور مولانا احمد سعید صاحب ملاقات کے لیے مولانا کے کمرے میں پہنچے ہی تھے کہ جیلر یا سپرنٹنڈنٹ راؤنڈ کرتا ہوا ادھر آتا دکھائی دیا۔مولانا نے فرمایا، میرے بھائی! آپ بیٹھیے میں انہیں ’’مصروف‘‘ کرتا ہوں۔باہر تشریف لے جا کر اس سے گفتگو شروع فرمادی۔پھر اس نے کیا ادھر آنا تھا‘ وہیں سے واپس ہوگیا۔مولانا احمد سعید سنا ہوا ہے بڑے بے دھڑک بزرگ تھے۔مولانا آزاد سے کہنے لگے۔لاحول ولاقوۃ آپ کے پاس آنا تو ایسے ہے جیسے کوئی شریف آدمی دن دہاڑے ’’اُس بازار‘‘میں پکڑا جائے۔بے چارے مولانا یہ ریمارکس پی گئے۔پھر چائے بنائی اور پوچھا کیسی ہے؟ابا جی نے تعریف کے ساتھ کہا۔حضرت ایک کمی رہ گئی۔ابا جی کہتے اب مولانا سے کوئی یہ کہے کہ آپ کی چائے میں کمی رہ گئی؟بڑی بڑی غزالی آنکھیں اٹھا کر تعجّب اور حیرت سے پوچھا وہ کیا میرے بھائی؟ میں نے کہا دو پتی زعفران بھی ہوتی۔فرمایا آپ اضافات کی بات کرتے ہیں۔پھر کسی روز آئیے آپ کو ’’مزعفر‘‘ پلاؤں گا۔چنانچہ ایک روز زعفرانی چائے بھی پلائی۔

مولانا آزاد کی تقریر:

۱۹۵۰ء میں ملتان میں ایک شب میں نے ریڈیو لگایا تو اچانک دِلّی لگ گیا۔حضرت نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ کے عرس کی کارروائی نشر ہورہی تھی۔اعلان ہوا کہ مولانا آزاد تقریر فرمائیں گے۔ان کی آواز کبھی نہ سنی تھی۔میں بھاگم بھاگ گئی اور بیٹھک کے دروازے پر زور سے

دستک دی۔ بھائی جان (مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاریؒ) آئے تو بتایا کہ مولانا آزاد کی تقریر ہونے لگی ہے۔ میرے آتے جاتے تقریر شروع ہوگئی۔ اتنا یاد ہے آیت مبارکہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَہُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ وَ اللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ [1] پڑھی تھی۔ ابا جی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک آہ بھری اور کہا چلو آواز ہی سن لی۔ حضرت مولانا کی تقریر میں خطابیہ جملے کچھ اس انداز کے تھے کہ ''آپ دیکھو گے''، ''آپ سنو گے'' ابا جی فرمانے لگے کہ یہ ہے قلعۂ معلّٰی کی زبان اور اب ابوالکلام کے بعد یہ کون بولے گا؟

ابا جی کے نام مولانا آزاد کے خطوط:

ابا جی کے نام مولانا آزاد کے کئی خطوط آئے اور وہ سب امرتسر میں رہ گئے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں ابا جی کا تمام کتب خانہ ضائع ہوگیا جس کا انھیں شدید قلق تھا۔ اتفاق سے مولانا کے تین خطوط محفوظ رہ گئے ۔۱۰رستمبر ۱۹۴۶ء(سیوائے ہوٹل مسوری)، ۱۰رفروری ۱۹۴۷ء اور ۱۳رفروری ۱۹۴۷ء۔ (دہلی) یہ دونوں خطوط وزارتِ تعلیم ہند کے لیٹر پیڈ پر لکھے گئے۔

۱۰رستمبر ۱۹۴۶ء کا لکھا ہوا خط الیکشن سے پہلے کا ہے۔ اور یقیناً ''ضروری باتیں'' اسی سے متعلّق تھیں۔ ابا جی مسوری گئے تھے نہ دِلّی۔ اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے ماسوائے ابا جی کے باقی حضرات کی رضامندی وعلم سے ''ضروری معاملہ'' طے کرلیا تھا۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور شورش کاشمیری مرحومین بھی کہتے تھے، ہم لاعلم تھے۔ (یہ مولانا آزاد کے توسط سے ''احرار کانگریس انتخابی مفاہمت'' کا معاملہ تھا) واللہ اعلم بالصواب۔

۱۰رفروری ۱۹۴۷ء کے خط کا سبب ورود یہ واقعہ بنا کہ ایم۔ اے۔ ایس اینڈ کمپنی حبیب گنج لاہور کے مالک حاجی دین محمد صاحب مرحوم ومغفور، حضرت مولانا احمد علی رحمہ اللہ کے مرید خاص تھے اور ابا جی کا بھی ازحد اکرام واحترام کرتے تھے۔ بقول شورش مرحوم انہیں لوہے کا کوٹہ درکار تھا۔ مجھے یوں یاد ہے انہیں کوئی پرمٹ درکار تھا۔ ان کے شریک کار کوئی اور صاحب بھی تھے جن سے ابا جی قطعاً واقف نہ تھے۔ ان صاحب کو لے کر حاجی صاحب دہلی گئے اور حضرت مولانا

---

[1] ترجمہ: اور کچھ آدمی ایسے بھی ہیں جو اللہ کی خوشنودی کی طلب میں اپنی جانیں تک بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ بھی اپنے بندوں کے لیے سرتا سر شفقت ومہربانی رکھنے والا ہے۔

(''البقرہ'': ۲۰۷، ''ترجمان القرآن'' مولانا ابوالکلام آزادؒ)

آزاد سے ملاقات کی کوشش کی ۔اتنے ہنگامی دور میں مولانا کے پاس وقت بھی نہ ہوگا۔اجمل خاں صاحب (مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری) سے ان حضرات نے ملاقات کا وقت مانگا،انھوں نے عذر کر دیا۔ یہ بیٹھ گئے کہ وقت لے کر جائیں گے ۔اجمل خاں بھی اڑ گئے اور صاف انکار کر دیا۔ مایوس ہوکر یہ حضرات ابا جی کے پاس آئے اور مذکورہ واقعے کا قطعاً کوئی ذکر نہ کیا بلکہ اپنا معاملہ یوں پیش کیا کہ مولانا آپ کی سفارش مان لیں گے ،آپ ہمارے ساتھ تشریف لے چلیے ۔اب حاجی صاحب سے صرف سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے تو تعلّق نہ تھا۔ وہ سرمایہ دار ایسے تھے کہ ان کے کارخانے میں نمازوں کے اوقات میں کام بالکل بند ہو جاتا اور حاجی صاحب معمولی ملازمین کے ساتھ جس صف میں جگہ مل جاتی کھڑے ہو جاتے اور جس روز حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ تشریف فرما ہوتے، نماز کے فوراً بعد وہ ان کے جوتوں کے پاس آ کر کھڑے ہو جاتے اور حضرت مولانا جب فارغ ہوتے تو وہ جوتے اٹھا کر ان کے آگے رکھ دیتے ۔ان وجوہ سے ابا جی ان کی قدر کرتے تھے ۔ان کے اصرار پر ابا جی مان تو گئے مگر کہا کہ شورش کو ساتھ لے لیتے ہیں۔حاجی صاحب کو اتنی عجلت تھی کہ اس زمانے میں انھوں نے دو سیٹیں ہوائی جہاز کی ریزرو کرائیں ۔ایک اپنے لیے اور ایک ابا جی کے لیے ۔لیکن ابا جی نے شورش صاحب اور حاجی صاحب سے فرمایا کہ آپ لوگ ہوائی جہاز پر جائیں، میں گاڑی میں آؤں گا۔ وہ اپنے کارکنوں سے یہی سلوک کرتے تھے۔شورش صاحب کی اللہ بال بال مغفرت فرمائے ۔جاتے ہوئے روزنامہ '' آزاد'' میں آٹھ کالمی سرخی لگا گئے کہ:

''حضرت امیر شریعت' مولانا آزاد سے اہم مذاکرات کے لیے دہلی روانہ''

ابا جی' شورش صاحب کے بعد ریل گاڑی میں دہلی پہنچے ۔وہاں سب کا قیام میر احمد حسن صاحب شملوی کے ہاں ہوتا یا دفتر احرار میں۔صبح جب مولانا کے ہاں پہنچے جیسا کہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے'انہیں کسی کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے جانا تھا اور بروقت تیار نہ ہو پائے تھے۔ جب یہ حضرات پہنچے تو اجمل خاں صاحب نے جا کر بتلایا کہ وہی لوگ اب شاہ صاحب کو لے کر آئے ہیں ۔ابا جی فرماتے کہ جب مولانا باہر آئے تو منہ پونچھتے ہوئے آ رہے تھے ۔معلوم ہوتا تھا ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی آ رہے ہیں ۔میں نے تو ماتھا دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ غصہ چڑھا ہوا ہے ۔آج

خیر نہیں ۔سلام و مصافحہ کے بعد غرضِ آمد دریافت فرمائی جوابا جی نے حاجی صاحب کی روایت سے بیان کردی ۔مولانا کا پارہ چڑھ گیا ۔انھوں نے کہا میرے بھائی ، یہ لوگ پہلے بھی آئے اور دھرنا دے کر بیٹھ گئے کہ ملے بغیر نہیں جائیں گے ۔اس کے بعد اس سلسلے میں کچھ بھی کرنے سے انکار فرما دیا اور موٹر میں بیٹھ کر دفتر چلے گئے ۔ابا جی کو بہت افسوس تھا کہ حاجی صاحب نے اخفاء کر کے بات بگاڑ دی۔ دوسرے مولانا نے حد سے زیادہ ہی بے نیازی کا مظاہرہ فرمایا اور یہی ملاقات زندگی کی آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ پھر ابا جی نہ کبھی دہلی گئے نہ ملے ۔حاجی صاحب سے ابا جی نے گلہ کیا کہ اگر تم نے مجھے لاہور بتا دیا ہوتا کہ تم لوگ پہلے کوشش کر چکے ہو تو میں کبھی ساتھ نہ آتا ۔ بعد میں مولانا کو احساس ہوا تو ۱۰؍اور ۱۳؍فروری کو یہ مکتوب لکھے۔

ایک خط میں نے امرتسر میں ابا جی کے نام دیکھا تھا ۔عید کی امامت کا مسئلہ تھا ۔کلکتہ کے کچھ لوگ ان سے درخواست کرتے تھے ۔انھوں نے انکار فرمایا۔ غالباً دو آدمی امرتسر آئے اور ابا جی سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ چلیے اور سفارش کیجیے ۔ابا جی نے پوچھا مولانا کے علم میں ہے کہ آپ لوگ مجھے لینے آئے ہیں؟ انھوں نے انکار کیا، ابا جی نہ گئے ۔لیکن مولانا کو معلوم ہو گیا کہ کوئی صاحب ابا جی کو لینے گئے تھے۔ مجھے خط کا اتنا فقرہ یاد ہے:

’’یوں آپ کلکتہ آئیں تو مجھ سے زیادہ خوشی کس کو ہوگی؟ لیکن اس مسئلہ کے لیے نہ آئیں۔‘‘

اور ابا جی تو پہلے ہی انکار کر چکے تھے۔

☆☆☆

مولانا آزادؒ کے خطوط:

(۱)

سیوائے ہوٹل مسوری

۱۰ر ستمبر ۱۹۴۶ء

حبی فی اللہ!

میں چاہتا ہوں کہ آپ دو تین دن کی مہلت نکال کر آئیں اور مجھ سے ملیں ۔ میں یہاں ۲۰ تک ہوں پھر دہلی جاؤں گا اور دہلی سے آپ کو اطلاع دوں گا کہ میرا قیام کہاں ہوگا۔ امید ہے کہ آپ زحمت گوارا کریں گے اور آکر مل لیں گے۔ بہت ہی ضروری باتیں کرنی ہیں۔

عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری — والسّلام علیکم

امرتسر — ابوالکلام

(۲)

منسٹری فار ایجوکیشن دہلی

۱۰ر فروری ۱۹۴۷ء

عزیزی!

آپ اُس دن آئے لیکن کاموں کی مشغولیت سے بالکل بے بس ہو رہا تھا۔ اسٹیٹس نگوسیشن کمیٹی کا وقت ساڑھے نو تھا اور میں دس تک بھی طیار نہ ہوسکا۔ اس لیے عذرخواہی کے سوا چارۂ کار نہ دیکھا۔ خیال تھا کہ آپ ٹھہریں گے اور دوسرے دن مل سکیں گے لیکن آپ ٹھہر نہ سکے۔

اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو آئندہ سنیچر کے دن آئیے، تا کہ کچھ وقت ملاقات کے لیے نکال سکوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اُس دن وقت نہ نکال سکا۔

سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری — والسّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

امرتسر — ابوالکلام

(۳)

منسٹری فار ایجوکیشن دہلی

۱۳رفروری ۱۹۴۷ء

حبی فی اللہ!

اس عذر خواہی کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ مجھے خود افسوس ہوا تھا کہ آپ آئے اور ایک معاملہ کی نسبت کہا اور میں مجبور تھا کچھ نہ کر سکا۔

میں ایک خط ڈاک کے ذریعہ بھیج چکا ہوں، کسی سنیچر یا اتوار کو دہلی آئیے تا کہ بہ اطمینان مل سکوں۔

والسّلام

ابوالکلام

مولانا محمد علی جوہرؒ:

ایک بار رئیس احمد جعفری کی کسی تحریر میں، میں نے مولانا محمد علی جوہر کے متعلّق ایک دلچسپ واقعہ پڑھا۔ رئیس صاحب نے لکھا تھا: ''ایک بار دہلی میں جامعہ مِلّیہ میں جلسہ تھا، جس سے مولانا محمد علی جوہر کو خطاب کرنا تھا۔ اُس وقت تک میں مولانا سے متعارف نہیں تھا۔ اُسی روز اتفاقاً میں ہمایوں کے مقبرے کی طرف جانکلا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ویران سے کونے میں ایک شخص کھڑا تقریر کررہا ہے۔ اردگرد سے بےخبر، با قاعدہ اشاروں اور اداؤں کے ساتھ تقریر کی مشق کرتے اس شخص کو میں خاصی دیر تک دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ پھر وہاں سے چلا آیا۔ رات کو جامعہ میں پہنچا۔ میں مولانا محمد علی کو سننے کا اشتیاق رکھتا تھا۔ وہ تقریر کرنے اٹھے تو میں ششدر رہ گیا۔ یہ تو وہی صاحب تھے جنھیں میں دن میں ہمایوں کے مقبرے میں اکیلے تقریر فرماتے دیکھ چکا تھا۔'' میں نے ابا جی کو یہ واقعہ سنایا تو حیرت اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ پھر فرمایا: الحمدللہ، تمہارے باپ کو اللہ نے کبھی ایسی ''تیاری'' کا محتاج نہیں رکھا۔ پھر الہ آباد کا مشہور واقعہ سنایا۔ جب سائمن کمیشن کی آمد کے دنوں میں موتی لال نہرو کی صدارت میں ابا جی نے تقریر کی تھی۔ موتی لال کے بعد بولنا خاصا مشکل تھا۔ لیکن ابا جی نے تقریر کا آغاز ہی غالبؔ کے ایک برمحل شعر سے کیا اور مجمع پھڑک اٹھا۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کے ذکر پر فرمانے لگے کہ تحریکِ خلافت میں ان سے تعارف ہوا۔ میں نو وارد تھا۔ مولانا نے میری تقریریں سنیں تو بہت داد دی اور حوصلہ بڑھایا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک مولانا ہی کے قلم سے کچھ جملے ''حوصلہ شکنی'' کے انداز کے نکلے۔ ایک جگہ مولانا سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے عرض کیا: '' آپ وہ جرنیل ہیں جو اپنے ہی سپاہی کو اچھالڑتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔'' یہ سننا تھا کہ گلے سے لگا لیا، اس وارفتگی سے منہ اور ماتھا چومتے رہے کہ میرا سارا چہرہ مولانا کے لعابِ دہن سے تر ہوگیا۔

رئیس احمد جعفری کی کتاب ''دید و شنید'' چھپی تو میں نے اخبار میں اشتہار پڑھ کر ڈاک سے منگوالی۔ اس میں مختلف شخصیات کا تذکرہ تھا۔ ایک روز ابا جی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگے۔ چند منٹ بمشکل گزرے ہوں گے کہ انھوں نے کتاب ناگواری سے ایک طرف رکھ دی۔ وجہ یہ ہوئی کہ اُن کی نظر خواجہ کمال الدین کے خاکے پر جاپڑی۔ یہ صاحب معروف قادیانی تھے اور برطانیہ میں قادیانی مشن کے بانی مبانی۔ رئیس صاحب نے اِن کی ''اسلامی خدمات'' کی تعریف وستائش کی تھی۔ ابا جی فرمانے لگے: ......اب اور کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

علامہ انور صابریؒ:

علامہ انور صابری (دیوبند) معروف قومی وسیاسی شاعر تھے اور مجلس احرار میں شامل تھے۔ ابا جی سے بے پناہ عقیدت تھی اور دل وجان سے اُن پر فدا تھے۔ تقسیم ہند سے قبل ''کلیاتِ شاد عظیم آبادی'' اس شعر کے ساتھ ابا جی کی نذر کی تھی:

بہ بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا
کلامِ شاد کو نذرِ عطاء اللہ کرتا ہوں

انھوں نے ایک بار مجلس احرار کے ترجمان روزنامہ ''آزاد'' لاہور کے ''آزادی نمبر'' میں مجلس کے جملہ زعماء کے بارے میں ایک ایک قطعہ لکھا تھا۔ ابا جی کے بارے میں لکھا:

یوں تو جادوگر مقرر بھی مکمّل عزم بھی
عشق کی تفسیرِ کامل کے سوا کچھ بھی نہیں
میری نظروں میں اگر مجھ سے کبھی پوچھے کوئی
درد سے لبریز اک دل کے سوا کچھ بھی نہیں

تقسیم ہند کے بعد علامہ انور صابری مرحوم دیوبند سے ابا جی کو ملنے ملتان آئے تو گلے لگ کر بہت روئے۔ تقسیم کے فسادات کی ہولناکی اور خوں ریزی، مسلمانوں کی بے بسی، لیڈروں کی منافقت اور چھینا جھپٹی کی سیاست ......غرض دل دکھانے والے سبھی قصے چھڑے۔ ابا جی کی گرتی ہوئی صحت اور گھلتے ہوئے وجود کو دیکھ کر بار بار کہتے...... شاہ جی یہ کیا ہوگیا۔ اُن سے فرمایا......بس کسی دن سن لوگے ''بخاری نہیں رہا۔''

وَجلَ السُّیولُ عَنِ الطُّلُولِ کَأنَّها
زُبُــرٌ تَــجِــدُ مُتُــونَهَــا أقَلامُهَــا

(سیلاب نے کھنڈرات کو ایسے نمایاں کردیا جیسے پرانی تحریروں کو ان کے قلم نے۔

باگڑ سرگانہ میں بیعت کا یادگار واقعہ:

موضع باگڑ سرگانہ (ضلع خانیوال) میں قبل از تقسیم بھی جماعتِ احرار بہت مضبوط تھی۔ مجھے مہر شوق محمد سرگانہ مرحوم کا نام بچپن سے یاد ہے کہ ان کی ابا جی سے خط کتابت رہتی تھی۔ مہر شوق محمد سرگانہ مرحوم مجلس احرار اسلام کے نہایت فعال کارکن تھے۔ انھوں نے علاقہ بھر میں احرار کی

شاخیں قائم کیں۔ جب تک زندہ رہے ’’احرار‘‘ سے وابستہ رہے۔اُن کے پُرخلوص تعلّق میں کبھی فرق نہ آیا۔۱۹۳۷ء میں انھوں نے باگڑ سرگانہ میں تین روزہ ’’احرار کانفرنس‘‘ منعقد کی۔ ابا جی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، شیخ حسام الدینؒ سبھی حضرات موجود تھے۔ابا جی فرمانے لگے:

ایک روز بیٹھے تھے کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا مجھے بیعت کر لیجئے۔

میں نے کہا:

’’بھائی! جا کسی نیک آدمی کی بیعت کر لے۔‘‘

وہ چلا گیا۔دوسری بار پھر آیا‘ میں نے کہا کسی اور بزرگ کی بیعت کرلو۔تیسری بار وہ پھر آیا۔ہم سب ساتھی فجر کی نماز سے فارغ ہوکر چارپائیوں پر بیٹھے تھے اور میں پاؤں لٹکا کر بیٹھا ہوا تھا۔اس نے آکر پھر بیعت کرنے کو کہا۔

میں نے زچ ہوکر کہا:

’’آچڑھ! میرے کندھوں پر، تجھے بیعت کروں۔‘‘

وہ اتنا سادہ آدمی تھا کہ فوراً میرے کندھوں پر سوار ہوگیا۔مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ ہنس ہنس کر دوہرے ہورہے تھے۔اٹھ کر کھڑے ہوگئے تالیاں بجاتے اور کہتے اب بھی نہ کرو بیعت!

میں نے کہا:

’’بھائی میں نے بیعت کیا، میرے پیر نے تجھے بیعت کیا،تو نیچے اتر!‘‘

اس بیچارے نے سمجھا‘ کہ شاید شاہ جی کا طریقۂ بیعت یہی ہے! خیر بعد میں اسے بیعت کرلیا۔

یہ قصہ یوں سنایا کہ تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ہورہا تھا۔کہنے لگے:

’’مولانا آزاد، علامہ حسین میر کاشمیری کو جب دیکھتے تو مسکرانے لگتے۔خصوصاً ان کی گردن کے دائمی انحنا پر۔‘‘

میں نے کہا:

’’ابا جی کوئی ایسا بھی ہے جسے دیکھتے ہی آپ کو ہنسی آئے؟‘‘

تو باگڑ سرگانہ میں بیعت والا یہ قصہ سنایا۔

ملتان میں‘ ایک روز مسکراتے ہوئے بیٹھک سے اندر آئے اور کہا وہی باگڑ والا مرید آیا ہے۔پھر تواضع کے لیے خورونوش کی اشیاء خود اٹھا کر لے گئے۔

علالت کا آغاز:

مرض الموت حقیقتاً سکھر جیل میں ۱۹۵۳ء سے شروع ہو چکا تھا۔ جہاں بارہ آنے سیر کے چھیچھڑے، گوشت کے نام پر پکائے جاتے۔ مسور کی دال اور گلے سڑے بینگن کھلائے جاتے۔

فالج کا پہلا حملہ ہونے سے چند روز قبل دانت نکلوائے۔ یوں تو شوگر کا علم ہونے پر چاول چھوڑ دیئے تھے مگر مجبوری کی بناء پر ان دنوں میں، دو تین دن کھچڑی کھائی۔ زندگی کے آخری برسوں میں مغرب سے عشاء تک اوراد و وظائف میں مشغول رہتے اور عشاء پڑھ کر کھانا کھاتے۔ اس روز وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ مولانا محمد علی جالندھری مرحوم آ کر بیٹھ گئے۔ عشاء کے بعد تک وہ صرف اس مسئلہ پر بحث کرتے رہے کہ شیخ حسام الدین صاحب اور ماسٹر تاج الدین انصاری صاحب کراچی جا رہے ہیں اور دفتر احرار میں قیام کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ وہ آج کل حسین شہید سہروردی کی عوامی لیگ میں شامل ہیں اس لیے دفتر احرار میں ان کا ٹھہرنا کسی صورت درست نہیں۔ آپ انہیں روکیں۔ حالانکہ ۱۹۴۹ء میں خود مولانا محمد علی جالندھریؒ بھی کچھ دنوں کے لیے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ ابا جی کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور طبیعت پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ ان کا اخلاقی رویہ سب کے ساتھ یکساں تھا۔ شیخ صاحب اور ماسٹر صاحب تو کچھ ہی عرصہ بعد عوامی لیگ چھوڑ کر واپس اپنی جماعت احرار میں آ گئے، لیکن مولانا محمد علی جالندھری مرحوم ۱۹۵۴ء میں مجلس احرار کے شعبۂ تبلیغ تحفّظ ختم نبوت کو ''مجلس تحفّظ ختم نبوت'' کا نام دے کر مستقل طور پر مجلس احرار سے الگ ہو گئے۔ ابا جی کی فراست اور اخلاص یہ تھا کہ انھوں نے شیخ صاحب کو چھوڑا نہ مولانا محمد علی کو۔ وہ دونوں کو ہمیشہ بھائی سمجھتے اور کہتے اور مجلس احرار میں رہتے ہوئے تا دم آخر مجلس تحفّظ ختم نبوت کے صدر بھی رہے تا کہ یہ سب لوگ پہلے کی طرح ہی اکٹھّے رہیں، جگ ہنسائی نہ ہو اور دشمن پر بھی احرار کا رعب قائم رہے۔ وہ اپنی اس حکمتِ عملی میں کامیاب رہے۔ شیخ صاحب، ماسٹر صاحب اور مولانا محمد علی کے اخلاص میں تو شک نہیں، مگر تدبیر کی غلطی بہرحال ان سے ہوئی جس سے مجلس احرار کا شیرازہ بکھر گیا۔

اماں جی چولہے کے پاس بیٹھی تھک گئی تھیں۔ نماز پڑھ کر لیٹ گئیں۔ میں بیٹھی رہی۔ کھچڑی ایسا کھانا ہے کہ پکنے کے بعد تیز آنچ پر نہیں رکھا جا سکتا۔ انگاروں پر دیگچی پڑی رہی۔ مولانا اٹھ کر گئے تو ابا جی اندر آئے۔ برآمدے میں پلنگ پر بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ وہیں چولہے بنے ہوئے تھے۔ میں نے کھچڑی نکال کر دی تو نیم گرم تھی، کھاتے کھاتے ٹھنڈی ہو گئی۔ کھاتے ہوئے

دو دفعہ فرمایا آج میرے جسم میں ایک خاص کیفیت ہے۔ پھر گلّی کی اور بیٹھک میں چلے گئے۔ میری طبیعت میں تشویش سی پیدا ہوئی۔ میں پھر جا کر بیٹھک میں دری پر بیٹھ گئی۔ فرمانے لگے پان کھالو۔ جی نہیں چاہ رہا تھا محض ان کے کہنے پر میں نے ایک ٹکڑا لگا کر منہ میں رکھ لیا۔ فرمانے لگے، جاؤ آرام کرو۔ اُگال دان صاف کر کے رکھا اور سلام کر کے اندر آ گئی، ان کے الفاظ صحیح سمجھ نہیں آتے تھے مگر میں نے سمجھا کہ دانت نکلنے سے منہ متورم ہے۔ اس لیے اس طرح بول رہے ہیں۔ علی الصباح وہ اُٹھے تو انہیں محسوس ہو گیا کہ دایاں بازو صحیح کام نہیں کر رہا۔ مگر وضو کر کے مسجد سے با جماعت نماز پڑھ کر آئے اور مصلّے پر اپنا کالا کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ معمول یہ تھا کہ مسجد جانے سے قبل برآمدے میں آ کر **السلام علیکم یا اهل البیت**، **صَبَّحَکُمُ الله بالخیر** فرماتے اور بھائیوں کو نام لے لے کر آوازیں دیتے اور اٹھا جاتے' اس روز اندر نہیں آئے۔ میں نماز پڑھ کر اپنے دونوں بچوں کفیل اور ربانے جی سلمہما کو لے کر بیٹھک میں گئی۔ یہ بھی روز کا معمول تھا۔ بچے اٹھتے ہی مچلتے کہ نانا ابا جی کے پاس لے چلیں۔ کپڑے پہنا کر لے جاتی۔ مصلّے پر بیٹھے بیٹھے دونوں کو چومتے اور بچے سلام کر کے تھوڑی سی دیر بیٹھ کر آ جاتے۔ پھر ناشتہ کے لیے اندر آتے تو ساتھ بٹھا لیتے۔

اس روز میں نے جا کر سلام کیا تو پڑھتے ہوئے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور میری طرف دیکھ کر بایاں ہاتھ دائیں پر پھیرا اور نفی میں ہلایا۔ ایک سیکنڈ میں مَیں سمجھ گئی وہ کیا کہہ رہے ہیں مگر میرا دل کہتا تھا اے کاش یہ نہ ہو۔ میں فوراً ہی واپس اندر گئی اور اماں جی سے رک رک کر کہا ابا جی کی طبیعت خراب ہے۔ شاید ان کے بازو کو کچھ ہو گیا ہے۔ دو منٹ کے اندر اندر ہم ماں بیٹی پھر بیٹھک میں آ گئیں انھوں نے تسبیح مکمّل کر کے بتایا کہ:

''اٹھا ہوں اور نلکا چلانے لگا تو ہاتھ کام نہیں کر رہا تھا میں نے جیسے تیسے وضو کیا اور کلمہ پڑھا:

لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه

ختم نبوت پر ایمان کا اقرار کرتے ہوئے ساتھ یہ الفاظ بھی پڑھے:

لَا نَبِیَّ بَعْدَهٗ، وَلَا رَسُوْلَ بَعْدَهٗ

پھر جب دیکھا کہ ابھی تک تو زندہ ہی ہوں تو مسجد چلا گیا۔''

اماں جی نے عرض کیا جب آپ نے محسوس کیا کہ طبیعت ٹھیک نہیں تو ہمیں کیوں آواز نہیں دی؟ اور پھر ٹھنڈے پانی سے وضو کر لیا تو فرمایا کہ:

''یہی سوچا کہ جو ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے، پریشان کیا کروں۔''

اماں جی نے فوراً ہی چائے بنائی۔ دواء المسک وغیرہ کھا کے چائے پی۔ دھوپ نکلی تو صحن میں بستر بچھا کر ہم لوگ ان کو بیٹھک میں سے لے آئے۔ جناب حکیم عطاء اللہ خان مرحوم (جو ہمارے ہاں بڑے حکیم صاحب کہلاتے تھے) کو بلایا۔ انھوں نے آ کر غذا وغیرہ قطعاً بند کر کے ماء العسل اور دیگر ادویہ دیں۔ یہ خبر شہر بھر میں پھیل گئی کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور جوق در جوق لوگ عیادت کے لیے آنے لگے۔ مجبوراً بر آمدے کی چقیں گرا کر ہم اندر چلی گئیں اور ملاقاتی صحن میں ہی آ کر ملنے لگے۔

جماعت اسلامی کے باقر خان صاحب اور بابو سید نصیر احمد صاحب بھی آئے۔ انھوں نے اپنا تعارف کرایا کہ ضلع جالندھر کے فلاں گاؤں میں آپ گئے تھے اور میں نے وہاں آپ کو دیکھا تھا۔ اتنی تکلیف کے باوجود بھی، جبکہ لقوہ کا اثر بھی اس وقت تک چہرے پر ظاہر ہو رہا تھا، مسکرا کر فرمانے لگے ''اوہ کیہڑی گلی جتھے بھا بھونیئس کھلی'' اور پھر بڑے مزے سے ان کو بتایا کہ دانت نکلوانے کی وجہ سے چند دن سے کھچڑی کھا رہا تھا۔ اور رات کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی، اپنی طرف سے یہی کسر باقی رکھی کہ گھڑے کا پانی نہیں پیا۔

بیماری کے ایام میں ایک دن صبح فرمانے لگے کہ آج ضعف بہت ہے، چلا نہیں جاتا۔ پھر ناشتہ کیا۔ ناشتہ کیا تھا؟ دو انڈوں کی زردی، دو تین بسکٹ اور دو پیالی چائے۔ پھر فرمانے لگے کہ چلتا ہوں ذرا حنیف اللہ تک! (حکیم عطاء اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند)۔ میں نے عرض کیا ابا جی! ضعف بہت ہے مت جائیے۔ فرمانے لگے، ذرا دل بہل جاتا ہے۔ کلہاڑی ٹیکتے ہوئے دروازے تک گئے، تھوڑی دیر بعد دیکھتی ہوں تو زنانہ دروازے کے سامنے پردہ کی جو دیوار بنی تھی اس کے پاس کھڑے ہیں۔ آواز دی۔ ''بٹیا''۔ میں ''جی'' کہہ کر بھاگتی ہوئی گئی تو دیکھا کپڑے مٹی سے بھرے ہوئے ہیں۔ فرمایا، بٹیا! میں گر پڑا۔ میں ان کی حالت دیکھ کر رو پڑی۔ کپڑے جھاڑے۔ عرض کیا، ابا جی میں نے تو کہا تھا آج نہ جائیے۔ فرمانے لگے، دروازہ کھولا ہی ہے کہ گر پڑا۔ پھر میرے بازو کا سہارا لے کر گھر کے بر آمدے میں آ کر بیٹھ گئے۔ بار بار یہ کہتے رہے تم نے تو منع کیا تھا میں نہ مانا اور گر پڑا۔ میری معمولی سی بات کا اتنا اثر؟ ان کی شفقت کی انتہا تھی۔

ایک قادیانی کی آمد برائے عیادت:

ابا جی کی علالت کے دنوں میں ایک روز معروف قادیانی اللہ دتہ جالندھری ملتان کے چند مرزائیوں کے ہمراہ اُن کی عیادت کے لیے اچانک آدھمکا۔ بھائی جان نے بتلایا کہ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے طنزاً کہا:

''میں ہوں ابوالعطاء''، اللہ دتہ جالندھری''

ابا جی نے جواباً فرمایا:

''میں ہوں ''ابوالعطایا'' عطاء اللہ بخاری''

پھر پوچھا: کیا حال ہے؟

ابا جی نے ہاتھ پکڑ کر پوری قوت سے جھٹکا دیتے ہوئے فرمایا:

''جنوں میں جیسے ہونا چاہیے ویسا گریباں ہے''

کچھ دیر بعد جب اللہ دتہ اور اس کے ساتھی قادیانی واپس چلے گئے تو ابا جی بیٹھک سے اٹھ کر اندر گھر تشریف لے آئے۔ اُن کا چہرہ اضطراب وجلال سے تمتمار ہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب کر کافی دیر صحن میں چہل قدمی کرتے رہے۔ انھیں اس خاص کیفیت میں دیکھ کر اماں جی نے پوچھا:

''آج کیا بات ہے؟ آپ پریشان لگتے ہیں''

فرمانے لگے:

''بڑھیو! میں اس لیے پریشان ہوں کہ یہ اللہ دتہ قادیانی میری تیمارداری کے لیے کیوں آیا؟ دھرتی پر انگریز اور اس کے خود کاشتہ پودے قادیانیوں کا میں سب سے بڑا دشمن ہوں۔ پھر یہ میرے پاس کیا لینے آیا ہے؟ میں تو اپنے ایمان کا جائزہ لے رہا ہوں اور اعمال کا محاسبہ کر رہا ہوں کہ تحفّظِ ختمِ نبوت کے لیے میرے کام میں کوئی کمزوری تو واقع نہیں ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ مجھے طاقت دیں اور میں پہلے سے بھی بڑھ کر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ ختمِ نبوت کے تحفّظ کے لیے کوئی خدمت انجام دے جاؤں۔ اللہ تعالیٰ میرے ایمان کی حفاظت فرمائے اور کسی کمزوری کے واقع ہونے سے پہلے موت دے دے۔ دشمن مجھے کمزور سمجھ کر مطمئن نہ ہو اور قیامت کے روز

حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مجھے شرمندگی نہ ہو۔"

اس واقعے کی مناسبت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ابا جی کو حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے کتنی محبّت تھی۔ انھوں نے اپنے ایمان کی کس طرح حفاظت کی اور اعمال کا کس طرح محاسبہ کیا۔

پھر فرمانے لگے:

"قادیانی میری علالت کی خبریں سن کر شاید یہ دیکھنے آئے ہیں کہ میں کتنا کمزور ہو چکا ہوں اور کب مرتا ہوں۔ اللہ کی توفیق سے میں نے انھیں یہ پیغام دے دیا ہے کہ میری جسمانی کمزوری میرے ایمان پر غالب نہیں آسکتی۔ میں جس حال میں بھی ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں اور ختم نبوت کے منکروں کے مقابلے میں پہلے سے بھی زیادہ طاقت ور اور توانا ہوں۔ میرا وجود ان کی تباہی و بربادی کے لیے کافی ہے۔"

قادیانی جھوٹ کی حقیقت:

بہت دیر بعد معلوم ہوا کہ یہ بھی قادیانیوں کی چال اور سازش تھی جسے اللہ دتہ قادیانی نے اپنی عمر کے آخری حصے میں ظاہر کیا۔ اس نے اپنے کذاب نبی مرزا قادیانی کے تتبع میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا کہ:

"وہ مرزا بشیر الدین کی طرف سے شاہ جی کے علاج معالجہ کے لیے بھیجی گئی رقم انھیں دینے گیا تھا۔ علالت کے دنوں میں شاہ جی کے معاشی حالات دگرگوں تھے اور اُن کی حالت یہ تھی کہ وہ تنہا تھے اور اُن کی تیمارداری کے لیے بھی اُن کے پاس کوئی نہیں تھا۔"

لعنۃ اللّٰہ علی الکاذبین

جن کا نبی جھوٹا، اس کا بیٹا اور جانشین جھوٹا، اس جھوٹے کے پیروکار جھوٹ نہیں بکیں گے تو اور کیا بکیں گے۔ قادیانیوں کو سچ سے کیا نسبت؟ جنھوں نے کائنات کے سب سے بڑے سچے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی نبوت کا انکار کیا اور اُن کے مقابلے میں جھوٹی نبوت گھڑ لی، وہ تحفّظِ ختم نبوت کے سپہ سالار پر تہمت نہیں باندھیں گے تو اور کیا کریں گے؟

ابا جی نے دولت اکٹھی کرنی ہوتی تو انگریز حکمرانوں کی طرف سے کی گئی پچاس مربع زمین کی پیش کش قبول کر لیتے اور دس برس تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت نہ کرتے۔ وہ تو فقرِ غیور

کے پیکر تھے اور انھیں فقر پر ناز تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ''الفقر فخری'' کا عملی نمونہ تھے۔

شدید علالت کے دنوں بھائی عطاء المحسن رحمتہ اللہ علیہ مستقل اُن کی خدمت میں رہے۔ اور خدام بھی موجود رہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر عطاء فرمائے اور اُن کی مغفرت فرمائے۔ (آمین) ہم نے تو صحت کے عالم میں بھی ابا جی کو جی بھر کے نہیں دیکھا۔ جلسوں میں خطاب کے لیے اکثر سفر میں ہوتے یا پھر جیل میں قید ہوتے۔ علالت کے دنوں میں بھی لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ انھوں نے تو اپنی چارپائی بھی بیٹھک میں بچھوالی تھی کہ تیمارداروں کی آمد کی وجہ سے بار بار اٹھ کر باہر نہ آنا پڑے۔ انھوں نے اللہ کی مخلوق سے اللہ کی رضا کے لیے محبّت کی تو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے دلوں میں اُن کے لیے بے پناہ محبّت اور احترام پیدا کر دیا تھا۔

علامہ طالوت کا تجزیہ:

انھی دنوں معروف عالم دین، شاعر وصحافی اور دانش ور علامہ طالوت رحمتہ اللہ علیہ نے اللہ دتہ قادیانی کی آمد اور ملاقات کا حال اپنے ایک تاثراتی مضمون ''عہد آفریں بخاری'' میں لکھا جو اُن کے قلمی نام ''نو بخت تماشائی'' سے غالباً روزنامہ ''امروز'' ملتان میں شائع ہوا۔ علامہ طالوت اس ملاقات میں موجود تھے۔

انھوں نے لکھا تھا:

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ایسی شخصیت تھے جن سے دوست اور دشمن دونوں متاثر تھے۔ قادیانیوں میں لکھے پڑے جاہلوں کی کثرت ہے اور اللہ دتہ جالندھری انھی میں نادر الوجود ہیں۔ ''اللہ دتہ'' کا عربی میں ترجمہ کیا جائے تو ''عطاء اللہ'' بنتا ہے۔ وہ مرزائیوں کے ''عطاء اللہ'' بننا پسند کرتے ہیں۔ مگر اللہ دتہ کو بدل کر عطاء اللہ بن جانے میں قادیانی آمر مطلق (مرزا بشیر الدین) کی ناراضی آڑے آتی تھی۔ چنانچہ اپنے بچوں کے نام عطاء المنعم، عطاء المحسن، عطاء المومن اور عطاء المہیمن کے وزن پر ''عطاء المجیب'' وغیرہ رکھ کر ''ابوالعطا'' بننے کی راہ نکالی۔ وہ شاہ جی کے جواب ''ابوالعطایا'' اور اپنی کنیت ''ابوالعطاء'' کی کیفیت اور نزاکت کو بھی نہ سمجھ سکے اور پھر ''اللہ دتہ'' کو ''عطاء اللہ'' سے دور کی بھی نسبت نہیں:

اللہ کی طرف سے پہنچتی ہے کُل عطا
وہ سمجھے، اچھے نام پر ہوتے ہیں کُل عطا

بلبل ہمیں کہ قافیۂ گُل شود بس است
اللہ دیے بھی بننے لگے ہیں ابو العطاء

آخری علالت:

ملتان میں حکماء اور نشتر کالج کے ڈاکٹروں کا ہر حیلہ جب نا کام ہوگیا تو ان کی خواہش پر ان کو گھر لے آئے۔ پھر ان کے ہمدم دیرینہ چچا شیخ حسام الدین رحمہ اللہ کے پر زور اصرار پر بادل نخواستہ اماں جی لاہور لے جانے پر راضی ہوگئیں۔ مولوی محمد اکرم صاحب مرحوم (یکے از مالکان سلطان فونڈری) کے ہاں قیام رہا مگر چند روز کے عارضی افاقہ کے بعد نقاہت پہلے سے بھی بڑھ گئی تو اماں جی سب کی مخالفت کے باوجود واپس گھر لے آئیں اور یہ ان کا ہم پر احسانِ عظیم تھا۔ ہم بہن بھائی بٹے ہوئے تھے۔ بسلسلۂ تعلیم کچھ لاہور، کچھ ملتان۔ اس طرح ہم دم واپسیں تک ان کی خدمت میں اکٹھے حاضر رہے۔ لاہور سے واپسی پر طبیعت ہم سب کے اکٹھے ہونے پر نسبتاً بہتر ہوگئی۔ لیکن یہ چراغ بجھنے سے پہلے لو کا اونچا ہونا تھا۔

انہی دنوں ملتان کے مشہور معالج ڈاکٹر عون محمد خان دیکھنے آئے تو کہنے لگے:

''شاہ صاحب! آپ کو اللہ تعالیٰ نے سو سال تک نہ گھلنے والا جسم دیا تھا' جسے آپ نے چالیس برس میں ختم کر دیا۔''

فرمایا: ''ایسا مت کہو میں نے اپنی توانائی صحیح مقصد پر صرف کی ہے۔''

آخری بیماری میں عصر و مغرب کے درمیان کچھ طبیعت بحال ہوتی تو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہم ابا جی کو کرسی پر کچھ دیر کے لیے بٹھا دیتے۔ اکثر مغرب کی اذان تک بیٹھتے' ورنہ ٹانگیں تھک جاتیں تو کبھی زبانی اور کبھی ہاتھ کے اشارے سے کہتے تھک گیا ہوں تو پھر ہم لٹا دیتے۔

ایک بوڑھے کی محبّت:

ایک روز ایسے ہی بٹھایا تھا۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت بھائی کوئی گھر نہ تھا۔ دروازہ پر دستک ہوئی۔ پڑھنے والے ایک دو بچے موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک بابا کہتا ہے شاہ جی سے ملنا ہے۔ بڑا تنگ وقت تھا۔ میں صحن کے کونے میں چولھے پر روٹی پکا رہی تھی اور مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ میں نے کہا اماں جی' میں چارپائی کھڑی کر لیتی ہوں، بے چارا پتا نہیں کہاں سے آیا ہوگا۔ چنانچہ میں نے چارپائی پر چادر ڈال لی۔ اماں جی کمرے میں چلی گئیں اور بچہ اس بوڑھے دیہاتی کو لے آیا۔ ملگجے کپڑوں والا وہ بوڑھا برآمدے میں بیٹھے ابا جی کی کرسی کے پاس آ کر زمین

پر بیٹھ گیا اور سلام کر کے ان کی دونوں پنڈلیوں کو پکڑ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے سنا......ابا جی نے دو دفعہ کہا: ''نہ رو آخرا یہوا نجام اے''۔ میں نہیں جانتی وہ کون تھا؟ چند منٹ بعد وہ اٹھا اور سلام کر کے پگڑی کے پلو سے آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔ یہ تھی وہ محبوبیت جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لوگوں کے دلوں میں القاء کر دی تھی اور جس کے مظاہر بار بار مشاہدہ میں آئے۔

سفر آخرت کی تیاری:

وفات سے تقریباً بارہ دن قبل غسل فرمایا۔ اماں جی نے سر میں بادام روغن لگایا اور بڑے عرصے بعد اس دن سرمہ بھی لگایا۔ چہرہ اس دن ایسے روشن تھا جیسے بیمار ہیں ہی نہیں۔ غسل کے بعد نماز ظہر پڑھی۔ کچھ دیر لیٹے پھر عصر و مغرب بھی ادا کیں، مغرب کے بعد دلیہ کھایا اور عشاء کا وقت ہوتے ہی فرمایا نماز پڑھا دو۔ نماز پڑھ کر لیٹ گئے۔ کمزوری کی وجہ سے سردی محسوس کرتے تھے۔ برآمدے میں پلنگ تھا اور برآمدے کے درے کے سامنے صحن میں بیٹھ کر میں اور اماں جی کھانا کھانے لگی تھیں کہ بھائی عطاء المحسن باہر سے آیا اور آتے ہی ابا جی کی طرف بڑھا اور پوچھا اماں جی، آج ابا جی نہائے ہیں۔ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ محسن نے ابا جی کا ماتھا چومنے کے لیے جیسے ہی منہ رکھا تڑپ کر بولا ابا جی کو تو بخار ہے۔ ہم دونوں نے کہا کہ ابھی تو لٹایا ہے، کچھ بھی نہ تھا۔ جب آ کر ہاتھ ماتھے کو لگایا تو تیز بخار سے تپ رہا تھا۔ اور یہ بخار ۲۱/ اگست ۱۹۶۱ء کو عصر و مغرب کے درمیان اس وقت اترا جب انھوں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ضعف و نقاہت کی شدت کو دیکھتے ہوئے بھی کم از کم مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ابا جی ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔ ہفتہ ۱۹/ اگست کو میں ظہر پڑھ کر پڑھنے والی بچیوں کو قرآن مجید کا سبق دینے برآمدے میں آ گئی۔ اماں جی، عطاء المحسن اور عطاء المؤمن پاس بیٹھے تھے۔ اچانک جو میں نے مڑ کر دیکھا تو بھائی اور اماں جی آنسو بہا رہے تھے۔ میں متوحش سی ہو کر بڑے کمرے میں آئی تو اماں جی کہہ رہی تھیں کہ مجھ سے آپ کی خدمت نہیں ہو سکی معاف کر دیجیئے گا۔ وہ آنکھیں بند کیے خاموش لیٹے تھے۔ ابا لیٹے رہے۔ انھوں نے اچانک آنکھیں کھولیں اور سامنے دیکھ رہے تھے۔ اماں جی نے پوچھا: ''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' فرمایا: ''ابّا''۔ اماں جی نے کہا: ''آپ کو ابا جی لینے آئے ہیں!'' تو اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اماں جی نے کہا، میں تو آپ کے سہارے ہر دکھ بھول گئی تھی (وطن کا

چھوڑنا، املاک کی بربادی وغیرہ) آپ مجھے کس کے سہارے چھوڑ رہے ہیں؟ انھوں نے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اٹھا دی۔۲۰ راگست کا دن ایسے ہی گزرا۔ گفتگو موقوف تھی مگر آواز دینے پر پہچانتے بھی تھے اور دوا یا دودھ سوڈا جو بھی ہم دیتے تھوڑا سا پی لیتے۔۲۱ راگست کو صبح ''محسن'' بجائے پاس بیٹھنے کے ایک طرف بیٹھ کر منزل پڑھنے لگا۔ مجھے اچھا نہ لگا۔ میں نے کہا آج ابا جی کے لیے دوا نہیں لاتے' کتنی طبیعت خراب ہے۔گلوگیر آواز میں کہنے لگا'' کی کرنی جے دوا'' (کیا کرنی ہے دوا)؟ قانونِ الٰہی سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی میرا ذہن ابا جی کی موت قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ میں دکھی سی ہو کر باہر آ گئی۔ بھائی جان کے مدرسہ کے دس گیارہ طلباء کا کھانا پکایا، گھر کے لیے سالن پکایا۔ایک بجے کے قریب کام کاج سے فارغ ہوئی تو اماں جی فرمانے لگیں: آؤ اپنے ابا جی کے پاس بیٹھو اور دودھ سوڈا پلاؤ۔ میں رات بھی نہیں سو سکی' تھوڑی دیر لیٹ لوں۔ میں پلنگ کے ساتھ لگی کرسی پر آ بیٹھی اور آواز دی۔ابا جی! تھوڑا سا دودھ سوڈا پی لیں۔چمچہ منہ سے لگایا تو انھوں نے پی لیا۔دو تین چمچے پینے کے بعد منہ بند کر لیا۔پھر میں نے کہا ابا جی پی لیں' اور تو کچھ کھاتا ہی نہیں' تو چند چمچے اور پی لیے۔اماں جی اور میں ظہر پڑھنے لگیں۔

حکیم عطاء اللہ خان کی آمد:

میں نماز پڑھ چکی تو بھائی کہنے لگے۔ بڑے حکیم صاحب آئے ہیں پردہ کر لیں۔اس وقت شدید بخار تھا' ہم لوگ برف کے پانی کی پٹیاں ان کے ماتھے پر رکھ رہے تھے۔ میں اٹھ کر اندر تو آ گئی پر طبیعت بے چین تھی۔ میں دروازے میں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔بڑے حکیم صاحب کو ان کے پاؤں کی طرف جھکتے دیکھا۔ بعد میں پتہ چلا وہ کوئی چیز پاؤں سے لگا کر دیکھ رہے تھے کہ حرکت ہے یا نہیں اور اس کے بعد انہوں نے تین آوازیں دیں'' شاہ جی! شاہ جی! شاہ جی''! اور چیخیں مار کر رونا شروع کر دیا۔''شاہ جی بخار اتر گیا' شاہ جی آرام آ گیا۔شاہ جی صحت ہوگئی!'' فرطِ جذبات میں حکیم عطاء اللہ خاں صاحب کی زبان سے یہ جملہ بھی نکل گیا کہ:''شاہ جی! شریعت یتیم ہوگئی'' بھائی جان مولانا سید ابوذر بخاری نے فوراً ٹوکا:''حکیم صاحب ایسے نہ کہیں۔شریعت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی یتیم نہیں ہوئی۔'' یہ ابا جی کی تربیت اور علم دین کا فیض تھا کہ اس موقع پر بھی اُن کے حواس بحال اور دینی شعور بیدار تھا۔تب مجھے پتہ چلا محسن کیوں کہتا تھا'' دوا کی

کرنی ہے''اور بجلی کی طرح یہ خبر پھیلنا شروع ہوگئی۔مفتی محمود صاحبؒ،عبدالغفور انوری صاحبؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ اور یکے بعد دیگرے کئی حضرات آنے لگے۔بڑی مشکل تھی،اندر بیٹھی رہیں اور وقت آخر بھی پاس نہ بیٹھیں۔پھر ہم چادریں لے کر پاس بیٹھ گئیں۔سب قرآن کریم پڑھ رہے تھے اور باری باری زمزم منہ میں ڈال رہے تھے۔ایک قطرہ بھی باہر نہیں بہا' وہ سکون سے پیتے رہے۔چند سانسیں باقی تھیں کہ اماں جی نے متوجہ کیا کہ دیکھو زبان ذکر کر رہی ہے۔اللّٰہ اللّٰہ اللّٰہ کا ورد جاری تھا۔ میں نے دیکھا کہ جس اللّٰہ نے ان کو اقلیم خطابت کا یکتا تاجدار بنایا اور جس کی دی ہوئی قوت کو انھوں نے اس کے حبیب محمد کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے منصبِ ختم نبوت کے بیان میں ختم کردیا۔اسی اللّٰہ کا نام لیتے ہوئے انھوں نے ایک دفعہ آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

میرے ابا جی!میرے پیارے ابا جی!اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن.

بڑے لوگ پہلے بھی ہوئے اور اللّٰہ کو منظور ہے تو پھر بھی پیدا ہوتے رہیں گے مگر ہم نے ابا جی جیسا کوئی نہیں دیکھا۔

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے

☆☆☆

وہ اٹھتا ہوا اِک دھواں اوّل اوّل
وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر
قیامت کا طوفان صحرا میں اوّل
غبارِ رہِ کارواں آخر آخر
چمن میں عنادل کا مسجود اوّل
اور گیاہِ رہِ گُل رُخاں آخر آخر

حضرت امیر شریعتؒ کے غیر مطبوعہ اشعار جو مجموعہ کلام ''سواطع الہام'' کی اشاعت کے بعد دورِ آخر میں کہے۔یہی اشعار مختار مسعود کی آٹوگراف بک پر تحریر کیے۔

عظیم باپ

ابا جی کے ایک مرید تھے‘ جالندھر کے حاجی غلام محمد صاحب۔ تقسیم کے وقت جائیداد کی تباہی کا دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ حواس مختل ہو گئے۔ صحیح ہوں یا دورے کی حالت میں‘ آتے ہر روز تھے۔ ایک دن فجر کے وقت ہی گلی میں چکر لگا رہے تھے اور نجانے کیا کچھ پڑھ رہے تھے۔ ابا جی نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور بلا کر پاس بٹھا لیا۔ سمجھایا بجھایا، چائے بنوا کر لے گئے اور انہیں پلائی۔ اُن کی طبیعت بحال ہوئی تو وہ گھر چلے گئے۔ سنا ہوا تھا کہ بہار کے دنوں میں جنون تیز ہو جاتا ہے۔ جن دنوں یہ قصہ پیش آیا‘ موسم بہار ہی کا تھا۔ میرے ذہن میں مصرعہ آیا:

’’جنوں میں فصل بہاری ستم ہی ڈھاتی ہے‘‘

بہت سال بعد‘ ایک دن ابا جی بہت یاد آئے‘ اور اچانک یہ مصرعہ بھی۔ ساتھ ہی یہ چند شعر موزوں ہو گئے۔

جنوں میں فصل بہاری ستم ہی ڈھاتی ہے
عظیم باپ تری یاد خوں رُلاتی ہے

تری وفات نے جینے کی آرزو کھو دی
پہ تیرے پیار کی لو حوصلہ بڑھاتی ہے

تری عطوفت و رأفت کی یاد یوں کہیے
شعاعِ نور کہ سینے میں جھلملاتی ہے

تفکّرات و حوادث نے کر دیا محزوں
تری حیات ہے قندیل ‘رہ دکھاتی ہے

میں تیرے چہرۂ انور کو دیکھنے کے لیے
ترس گئی ہوں مری روح بلبلاتی ہے

ترے کمالِ خطابت کا تذکرہ جب ہو
عدو بھی کہتے ہیں‘ تاریخ جگمگاتی ہے

میرے ابا جی

جب کبھی وہ سفر پہ جاتے تھے
دل بہت بے قرار ہوتا تھا
ان کی آمد کا بالخصوص مجھے
رات دن انتظار ہوتا تھا
مجھ سے اکثر خطائیں ہو جاتیں
ان کی جانب سے پیار ہوتا تھا
اس زمانہ میں جبکہ بیٹی سے
بات کرنا بھی عار ہوتا تھا
مجھ پہ بیٹوں سے کچھ سوا شفقت
ان کا خاص اک شعار ہوتا تھا

....

وہ انوکھا سا پیار کرتے تھے
جان ہم پہ نثار کرتے تھے
ہم تو اولاد تھے وہ غیروں سے
اس طرح کا پیار کرتے تھے
لوگ اپنوں کو بھول جاتے تھے
جان ان پہ نثار کرتے تھے

باب دوم

مکاتیب

بیٹا!

کوئی سہارا نہیں سوائے اللہ کے

اور لعنت ہے اُس سہارے پر

جو ماسوا، اللہ کے ہو!

(بیٹے کو نصیحت)

میرے متعلّق تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مُسبِّبِ حقیقی کے سوا
میں ساری کائنات سے کٹ چکا ہوں
میرے لیے دنیا میں، دنیا والوں سے کوئی امید، کوئی آرزو باقی نہیں
اللّٰہ بس، باقی ہوس۔ ہاں اللّٰہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہیں

یَفْعَلُ مَا یَشَاء ہے شان اس کی
یَحْکُمُ مَا یُرِیْد آن اس کی

(بیٹی کے نام خط)

میرے متعلّق بے فکر رہیے
مجھے صرف اللہ تعالیٰ اور رسول علیہ السّلام کی رضا چاہیے۔
(بیٹی کے نام خط)

یَفعَلُ اللّٰہُ مَایَشَاء، ساری کائنات سے کٹ کر، صرف اُسی ایک ذات
سے عقیدتاً جڑا ہوا ہوں اور بس
آپ لوگ بھی اسی رنگ میں رہیں تو بہتر ہے۔

(بیٹی کے نام خط)

ایک خط
مادرِ مہربان کے نام

۱

والدہ ماجدہ کے نام

(۱)

سیالکوٹ۔۱۳رنومبر ۱۹۳۵ء

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

بخدمت حضرت مکرمہ ومعظّمہ والدہ صاحبہ دامت برکاتکم ❶

السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

پہلے مقدمہ ❷ میں پھنسا رہا پھر صادقہ ❸ بیمار ہوگئی۔ اس کے بعد ایک اور مصیبت آپڑی جس کی وجہ سے حاضر نہیں ہوسکا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ ناراض نہ ہوں گی۔ اب فرصت ملی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ کچھ دنوں تک حاضر ہوکر سعادت حاصل کروں گا۔ اطمینان رکھیں۔

طاہرہ خاتون کو دیدہ بوسیاں اور دعائیں

والسّلام

سید عطاء اللہ بخاری

حواشی

۱ مدتوں پہلے کا پڑھا ہوا شعر اس خط کو دیکھ کر یاد آیا: ؎

نوِشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

''سفید کاغذ پہ لکھے ہوئے سیاہ حروف تو باقی رہیں گے لیکن لکھنے والے کو امید نہیں کہ وہ کل زندہ رہے گا۔''

ہماری دادی صاحبہ مرحومہ کے نام ۷۰ برس قبل کا لکھا ہوا یہ خط کفیل احمد سلمہ کے ذریعے سے لاہور میں مقیم پھوپھی زاد بہن کے توسط سے (اگست ۲۰۰۴ء میں) نظر نواز ہوا ہے' جو اڑھائی برس کی عمر میں یتیم ہو گئیں اور ننھیالی گاؤں ناگڑیاں میں انھوں نے پرورش پائی۔ دیدہ بوسیاں انہیں کے نام لکھی ہوئی ہیں۔ واضح رہے ہماری یہ دادی صاحبہ ابا جی کی حقیقی والدہ نہیں تھیں۔ وہ تو ابا جی کی چار برس کی عمر میں پٹنہ میں انتقال فرما گئی تھیں۔ لیکن ابا جی نے ہمیشہ ان کا احترام حقیقی ماں ہی کی طرح کیا۔ یہ میری والدہ ماجدہ کی نانیا زاد بہن بھی تھیں اور ساس بھی۔ حافظۂ قرآن' یہی ماں تھیں۔

۲ جس مقدمہ کا ذکر ہے یہ احرار تبلیغ کانفرنس قادیان، اکتوبر ۱۹۳۴ء میں خطاب پر بنا تھا۔

۱۹۳۴ء میں ہم دو بہن بھائی تھے' بھائی جان (سید ابوذر بخاریؒ) اور میں۔ اماں جی کو پھیپھڑے سے خون آنے کی بنا پر ڈاکٹروں نے موسم گرما پہاڑی علاقہ میں گزارنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ چار برس تک ابا جی مسوری پہاڑ پر لے جاتے رہے جو دہرہ دون سے آگے ہے۔ ہمیں وہاں چھوڑ کر خود پنجاب کے دورے بھگتاتے رہتے۔

میری بیماری کا جو لکھا ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں مجھے ''اپنڈے سائٹس'' کی تکلیف ہوئی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب کے بھائی حکیم عبدالمجید خان صاحب اور ایک ہندو ڈاکٹر جادو رام گوئل کے علاج سے بغیر آپریشن کے اللہ تعالیٰ نے شفا دے دی تھی۔

☆☆☆

بیٹی کے نام
(سکھر جیل سے)

(۲)

۳۰/ مارچ ۱۹۵۳ء [1]

سید عطاء اللہ بخاری

قرۃُ عینی ۔ وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ

تمہارا اور وکیل شاہ سلمہ اور بھائی فیض [2] کا خط کراچی سنٹرل جیل سے واپس ہوکر پرسوں مجھے ملا۔ خطوط ملنے سے پہلے' میں محسن سلمہ کے نام خیرالمدارس [3] کے پتا پر ایک خط یہاں سکھر جیل سے لکھ چکا تھا۔ مجھے شک تھا کہ شاید میرا کراچی جیل سے لکھا ہوا خط تمہیں نہ ملا ہو۔ سوالحمدللہ تم لوگوں کی خیریت معلوم ہوگئی ۔ میرے متعلّق ہر اطمینان رکھیں ۔ بعض جسمانی شکایتیں جو جیل سے باہر تھیں' ایک حد تک کم ہوگئی ہیں ۔ الحمدللہ ۔ تم نے لکھا ہے کہ مومن سلمہ ملاقات کے لیے آنا چاہتے ہیں ۔ سو اب تو میں سکھر سنٹرل جیل میں آ گیا ہوں ۔ یہاں شہر میں ٹھہرنے کے لیے پہلے معلومات حاصل کرلیں ۔ پھر دیکھا جائے گا ۔ ابھی ملاقات کی جلدی نہ کریں ۔ باقی اگر کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو میں خود ہی لکھ دوں گا ۔ انابت الی اللہ کی ضرورت ہے ۔ اللہ تعالیٰ مجھ کو اور تم لوگوں کو اس کی توفیق بخشیں اور بس، باقی ہوس ۔ بھائی جان [4] کو اور پیر جی [5]، محسن [6] اور مومن [7] سلمہم کو سلام اور دعائیں ۔ اپنی امی جان کو السّلام علیکم کہیں ۔ خط لکھنے میں اس بات کا خیال رکھیں کہ کوئی غیر ضروری بات اس میں نہ ہو ۔ اپنے گھر کی خیریت ہو اور اپنے عزیز و اقارب کی خیریت ہو اور بس ۔ نورچشمی وکیل احمد شاہ [8] سلام و دعا قبول کریں ۔ پرسان حال کو سلام و دعا ۔

والدعا

سید عطاء اللہ بخاری

سید عطاء اللہ بخاری' سیکورٹی قیدی سنٹرل جیل' سکھر

پتا: بمطالعہ نورِ چشم، راحت جاں سید عطاء المہیمن بخاری (پیر جی سلمہ اللہ تعالیٰ)

محلّہ ٹبی شیر خاں، بر مکان سید عطاء اللہ بخاری در آید ملتان شہر

حواشی

❶ ابا جی، مجلس احرار اسلام کی دعوت و مساعی سے قائم ہونے والی ''کل جماعتی مجلس عمل تحفّظ ختم نبوت'' کے اجلاس، منعقدہ ۲۶ر فروری ۱۹۵۳ء میں شرکت کے لیے کراچی تشریف لے گئے۔ اسی اجلاس میں کل جماعتی مجلس عمل کے مطالبات تسلیم نہ کرنے پر حکومت کے خلاف راست اقدام کا فیصلہ ہوا۔ رات آرام باغ میں جلسہ سے خطاب کیا اور تحریک تحفّظِ ختم نبوت کے آغاز کا اعلان کیا۔ ۲ بجے شب تقریر ختم ہوئی اور ۴ بجے علی الصبح ابا جی کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے بعد ایک ماہ سے زائد عرصہ تک سب رابطے منقطع تھے۔ بہت دنوں بعد خط کتابت شروع ہوئی۔ یہ خط ۷ر اپریل ۱۹۵۳ء کو موصول ہوا، جب کہ وہ کراچی سے سکھر جیل منتقل کر دیئے گئے تھے۔ میرے پاس کراچی سنٹرل جیل سے لکھا ہوا کوئی خط موجود نہیں۔

❷ بھائی فیض سے مراد ایک ہمسائے فیض احمد سومرا مرحوم ہیں۔ جن کو دفتر احرار ملتان میں، چندہ محصل مقرر کیا گیا تھا۔ کسی وقت گھر کا کوئی کام بھی کر دیتے تھے۔

❸ بھائی عطاء المحسن مرحوم اُن دنوں حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں جامعہ خیر المدارس ملتان میں زیر تعلیم تھے۔

❹ ہمارے سب سے بڑے بھائی مولانا حافظ سید عطاء المنعم بخاری رحمہ اللہ جو بعد میں سید ابوذر بخاری کے نام سے معروف ہوئے۔

❺ سب سے چھوٹے بھائی سید عطاء المہیمن بخاری۔ ابا جی انہیں بچپن سے ہی ''پیر جی'' کہا کرتے تھے۔

❻ ❼ مجھ سے چھوٹے دونوں بھائی حافظ قاری سید عطاء المحسن بخاری رحمہ اللہ اور سید عطاء المؤمن بخاری۔

❽ سید محمد کفیل بخاری کے والد۔

Edited with the trial version of
Foxit Advanced PDF Editor
To remove this notice, visit:
www.foxitsoftware.com/shopping

[illegible]

(۳)

بٹیا جی! جیتی رہو اور اللہ تعالیٰ تمہیں خوش و خرم رکھیں۔

تمہارا ایمان افروز خط ملا' جسے پڑھ کر ایمان کو جلا نصیب ہوئی۔ ٹھیک ہے میری بیٹی' اللہ کی رحمت بیٹی' اللہ کی نعمت بیٹی کو یہی لکھنا چاہیے تھا کہ بے معنیٰ واپسی کی دعا چہ معنی دارد۔ ماشاءاللہ عزیزی محمد عثمان ❶ کے انتقال کی خبر سے صدمہ ہوا۔ مجھے اس کی پیدائش کی اطلاع تو ملی نہیں تھی۔ اس لیے موت وحیات کی خبر اکٹھی ہی ملی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ ماموں جان ❷ اور ممانی کو میری طرف سے تعزیت کا خط لکھ دینا۔ تمہارا ، ۳۱ / مارچ اور ۶ / اپریل کا خط اور وکیل احمد سلمہ کا ۶ / اپریل کا خط مجھے ۱۰ / اپریل کو اکٹھے ملے (۳۱ / مارچ والا خط کراچی سے واپس ہو کر سکھر آیا)۔ یہاں ڈاک کا انتظام کچھ ایسا ہی ہے۔ وکیل احمد سلمہ نے اس میں لکھا تھا کہ میں ۱۰، ۱۱ / اپریل کو ملاقات کے لیے آ رہا ہوں اور دس کو خط پہنچا۔ اب میں کیا کرتا۔ جواب لکھنا فضول تھا۔ ورنہ میں ان کو روک دیتا۔ میں نے پہلے خط میں اسی لیے لکھا تھا کہ ابھی ملاقاتوں کا خیال چھوڑ دو' دیکھا جائے گا۔ مگر میری بات' معلوم ہوتا ہے تم لوگوں کی سمجھ میں نہ آئی اور برخوردار نے خواہ مخواہ تکلیف اٹھائی ہو گی۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ سیکورٹی قیدیوں کے لیے کچھ قوانین ہیں۔ بیٹا، بیٹی، ماں، باپ، بہن، بھائی، بیوی مل سکتے ہیں' داماد نہیں مل سکتا۔ یہاں سے جس کو میں خط لکھوں یا سلام لکھوں اس کا پتا اور ولدیت بھی ضرور لکھوں۔ چنانچہ میں نے لکھ دیا کہ چار لڑکے اور ایک داماد ہے۔ جن کو دعائیں اور سلام لکھتا ہوں اور یہ میرے ہی گھر میں رہتے ہیں۔ چنانچہ پوسٹ کارڈ پر پتا بھی میں نے اپنے ہی نام کا لکھا۔ میرا خیال تھا' دوسرے خط میں ملاقات کے متعلّق لکھوں گا۔

میرا خیال ہے کہ وکیل احمد شاہ سلمہ یہاں آئے ہوں گے اور اجازت نہ ملی ہوگی۔ اگرچہ کارڈ پڑھتے ہی، میں نے ایک درخواست سینئر جیلر صاحب کی خدمت میں بھیج دی تھی کہ اگر کچھ رعایت کی گنجائش ہوسکتی ہے تو ملاقات کرادیں۔ مگر اس دن سے آج تک جیلر صاحب ہماری وارڈ میں تشریف نہیں لائے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ برخوردار آئے یا نہ آئے، اور آئے تو کیا گزری؟ بہر حال ملاقات کا قصہ ابھی چھوڑو۔ مجھے ہفتہ میں دو خط لکھنے کی اپنے پیسوں سے اجازت ہے۔ اور چار خط ہفتہ میں موصول ہوسکتے ہیں۔ روپے میرے یہاں دفتر میں جمع ہیں۔ دس روپے تک مہینے میں خرچ بھی کرسکتا ہوں۔ باقی تم نے اپنے متعلّق لکھا ہے کہ میں کیا کروں؟ تو بٹیا جی! جب ابا جی خواب میں مل لیتے ہیں تو پھر سکونِ قلب حاصل ہونا چاہیے نہ کہ اداسی۔ پہلے بھی میں کونسا گھر ہی میں تم لوگوں کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ ''جیہا کِلّے بَدّھا جیہا چوراں کھڑیا''۔ اطمینان سے رہو اور اللہ اللہ کرو۔ دور دراز کا سفر ہے، موسم گرما ہے، ملک بیگانہ ہے، وہی دعا کرو جو کر رہی ہو کہ اللہ تعالیٰ عزت کے ساتھ ملاقات کرائے۔ ہاں! تمہارے بھائی جان خط نہیں لکھتے۔ کیا مجھ سے روٹھے ہوئے ہیں یا وہ بھی کہیں سیر کو گئے ہوئے ہیں؟ پچھلے خط میں تم نے لکھا کہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہ باہر سے واپس آئے یا ابھی باہر ہی ہیں۔ اطلاع دو یا ان کو کہو کہ خط ضرور لکھیں۔ ۞ ہر ہفتہ چار خط مجھے موصول ہوجاتے ہیں اور یہ نصف ملاقات ہوجاتی ہے۔ میری صحت بہت اچھی ہے۔ کئی شکایتیں دور ہوچکی ہیں۔ پیاس بہت کم ہوگئی ہے، یعنی حیرت انگیز کمی ہے۔ پیشاب بھی اب بہت کم آتا ہے۔ چائے چھوڑ دی ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ پان بھی چوبیس گھنٹے میں ایک دو دفعہ۔ یہ دونوں مصیبتیں دور ہوگئی ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم میرے حال پر ہے۔ یہ ارادۃً نہیں چھوڑیں بلکہ خواہش ہی جاتی رہی۔ اختلاج اور نفخ جس سے میں تنگ رہتا تھا، اب بالکل نہیں۔ کوئی نئی شکایت ابھی تک نہیں ہوئی۔ کراچی جیل میں ایک دن درد گردہ ہوا تھا اور ایک گھنٹہ تک سخت تکلیف رہی تھی۔ بس اس کے بعد خیر ہی خیر ہے۔ حالانکہ غذاؤں کے لحاظ سے اس کا عکس ہونا چاہیے تھا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کا کرم ہوتو ''عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْـاً وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ'' ۞ ہوجاتا ہے۔ میرے متعلّق، یعنی میری صحت کے متعلّق قطعاً فکر نہ

کرنا۔جس حال میں، میں گھر سے چلا تھا' اسے بھول جاؤ۔باقی حال دوسرے خط میں لکھوں گا۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔اپنے چچا سید فیض الحسن صاحب [۵] کی طرف سے درجہ بدرجہ سلام و دعا قبول کریں۔حافظ سید عطاء المحسن بخاری، حافظ سید عطاء المومن بخاری، حافظ سید عطاء المہیمن بخاری سلمہم اللہ تعالیٰ کو دعائیں، دیدہ بوسیاں اور السّلام علیکم۔حضرت "امیر المومنین" [۶] یعنی جناب مولانا مولوی حافظ قاری سید عطاء المنعم صاحب بخاری کو السّلام علیکم۔جناب حافظ سید وکیل احمد شاہ صاحب بخاری کو السّلام علیکم۔اپنی امی جان کو السّلام علیکم پڑھا دیں۔باقی سب کو درجہ بدرجہ سلام اور دعائیں پہنچائیں۔پرسان حال کو بھی سلام اور دعائیں۔سب لوگ دعاؤں سے غافل نہ ہوں۔

والدعا

سید عطاء اللہ بخاری

۱۴/اپریل ۱۹۵۳ء از سکھر جیل' لفٹ برانچ

پتا: بمطالعہ نور چشم راحت جاں جناب حافظ سید وکیل احمد شاہ صاحب بخاری سلمہ اللہ
برمکان سید عطاء اللہ بخاری۔درآید' محلّہ ٹبی شیر خان' ملتان شہر

موصولہ: ۱۹/اپریل ۱۹۵۳ء

حواشی

❶ محمد عثمان ہمارا ماموں زاد بھائی تھا، چند ماہ کا ہو کر انتقال کر گیا۔

❷ ہمارے اکلوتے ماموں سید عبدالحمید شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

❸ بھائی جان سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ، تحریک تحفّظ ختم نبوت کے دنوں روپوش تھے۔ پولیس گرفتاری کے لیے چھاپے مار رہی تھی۔ اس لیے خط کتابت کا سلسلہ منقطع تھا اور ابا جی اس صورت حال سے بے خبر تھے۔

❹ ترجمہ: ''عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بُری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو۔'' (سورۃ البقرہ۔ ۲۱۶)

❺ چچا سید فیض الحسن سے مراد ہیں، صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب مرحوم، آلومہار (ضلع سیالکوٹ) والے۔ جنھیں ساری عمر مجلس احرار اسلام میں گزار کر، آخر میں ''غلطی'' کا احساس ہوا اور پھر بریلوی حضرات کی جمعیۃ علماء میں لوٹ گئے۔ کسی نے ابا جی سے پوچھا: ''شاہ جی! صاحبزادہ صاحب آپ کو کیوں چھوڑ گئے؟'' ابا جی نے لطیف استعارے میں فرمایا:

''بھائی! وہ نوری، ہم خاکی! نوری پیچھے رہ گئے، خاکی آگے نکل گئے۔''

صاحبزادہ صاحب، ہمارے بچپن میں اکثر امرتسر والے گھر آتے۔ بڑے دھڑلّے سے ابا جی کی ڈائری اٹھاتے اور خود ہی ''عرس آلومہار'' کی تواریخ پر لکھ جاتے...... ''عرس آلومہار، لازماً پہنچنا ہے''۔ ابا جی عرس کے اجتماع میں تشریف لے جاتے اور تقریر فرماتے۔

ایک دفعہ شب معراج کے حوالے سے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''حضرت جبریل علیہ السّلام تو سدرۃ المنتہیٰ پر رُک گئے کہ آگے اُن کے پر جلتے تھے۔ ہوتا میں، تو جل کر راکھ ہو جاتا مگر محبوب ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑتا۔''

❻ بھائی جان مرحوم کے تبحرِ علمی و ادبی، افتادِ طبع، حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریکِ جہاد سے متاثر ہونے اور مستقبل میں دینی جد و جہد کے بلند عزائم کی وجہ سے انہیں پیار سے ''امیر المومنین'' کہا کرتے۔

(۴)
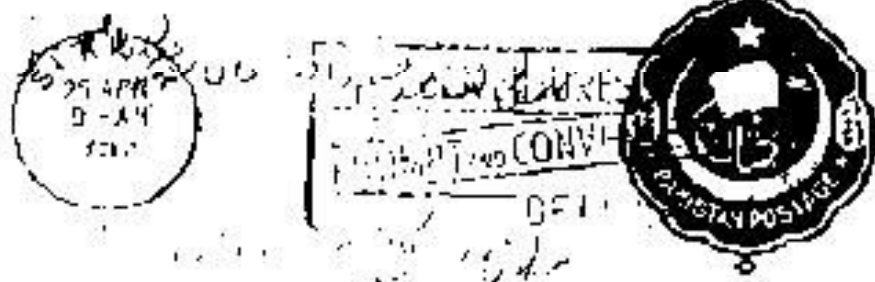
بٹیا جی! سلمک اللّٰہ تعالیٰ وعافانِ

آج ۲۳ کو تمہارا ۱۹ کا لکھا ہوا خط ملا ❶ اور اس سے پہلے برخوردار وکیل احمد شاہ صاحب سلمہ کا خط مل چکا تھا۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ میرے خط کا جواب آئے تو پھر میں خط لکھوں۔ سو الحمد للہ تمہارا خط پڑھ کر حالات سے آگاہی ہوگئی۔ سوائے الحمد للہ کے اور کیا کہوں؟ آپ کے چچا صاحب نے جو میرا حال یا پتہ پوچھا ہے تو ان کو جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اللہ راضی رکھے۔ بس یہی کافی ہے۔ تم ملاقات کے لیے اصرار کررہی ہو۔ میرا دل تو تمہاری رائے سے اتفاق نہیں کرتا لیکن دماغ یہ کہتا ہے کہ تم بلا وجہ اصرار نہیں کرسکتیں۔ اس لیے تمہاری مخالفت نہیں کرتا۔ خدا کرے، وکیل شاہ کو اجازت مل جائے۔ یہ دِقّت بھی سچ بولنے کی وجہ سے ہورہی ہے، ورنہ بیٹے اور داماد میں کیا فرق ہے؟ میں نے بھی یہاں لکھ کر دے دیا کہ یہ نام میرے بیٹوں کے ہیں اور یہ داماد کا نام ہے۔ ادھر سے انھوں نے بھی وہی لکھا۔ اب باپ، بیٹے کی ملاقات میں قانون حائل ہورہا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے؟ اللہ اچھا کرے۔ تمہارے اصرار کی وجہ کر آخری صورت بھی لکھ دیتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ برخوردار کو اجازت نہیں ملتی تو پھر یہ ہوسکتا ہے کہ تم اور تمہارے بھائی مل لیں اور وہ غریب باہر کھڑا رہے۔ اگرچہ یہ چیز میرے قلب پر بڑی شاق ہوگی۔ لیکن تمہاری رضا اگر اسی میں ہے اور کسی خاص وجہ سے ہے تو پھر ماشاءاللہ۔ یہ سطریں لکھتے ہوئے بھی تمہارے دوردراز سفر کا تصور میرے لیے تکلیف دہ ہے۔ باقی جو کچھ "شب معراج کا قصہ" ❷ تم نے لکھا ہے، اس سے میری طبیعت میں ایک الجھن سی پیدا ہوگئی ہے۔ شاید وہ ملاقات ہی میں دور ہوسکے۔ ایک لفافہ میں دو رقعے نہ رکھا کرو۔ وہ یہاں بجائے ایک خط کے دو خط شمار

کیے جاتے ہیں۔ایک ہی کاغذ پر دوسلام کلام ایک ہی خط بنتا ہےاور یہاں سے ایک کاغذ پر دوسلام کلام الگ الگ لکھنے کی اجازت نہیں۔ بہر حال یہ ضابطے ہیں اور جیل ہے۔ مومن سلمہ کے حالات سے دل کو دکھ ہی ہوا کہ اب رات کو بھی مدرسہ ہی میں رکھنا پڑا۔[۳] دن کو یا شام کو کھانا کھانے بھی گھر آتا ہے یا کھانا بھی وہیں اور مکمّل بائیکاٹ ہے۔اس سے بھی مطلع کرو۔بالکل بائیکاٹ تو اس کی زندگی کے لیے مناسب نہیں۔ خیر بہر حال کچھ دن تمہارے یوں گزریں اور ہمارے یوں۔ دیکھو اللہ تعالیٰ کیا کرتے ہیں۔ جو شخص مجھ کو سلام کہے اسے تم بھی میری طرف سے سلام کہلا دو۔ محسن میاں اور مومن جی اور پیر جی سلمہم اللہ تعالیٰ کو دعائیں اور دیدہ بوسیاں۔سکینہ کوٗاِز دہاری [۴] ،کریم بخش،محمد فاروق سب کو پیار، وسّو کو پیار، اس کی ماں کو دعائیں، وسّو کے بابا کو سلام۔

میرے ڈیسک میں وظیفہ کی کتاب میں سے ''سیفی شریف'' کی ترکیب جو مولانا معین الدین اجمیری مرحوم ومغفور کی طرف سے لکھی ہوئی ہے' نقل کر کے بھیج دواور ایک اسم اور بھی ہے جو آپ کی اماں جان کو بھی پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ سیدھا الٹا موافق مخالف دونوں کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ وہ بھی اور اس کا وقت اور ترکیب نقل کر کے بھیج دینا اور ایک جنتری بھی ہے۔اس میں سے آج کل کے زوال کا وقت بھی دیکھ کر لکھنا' اس میں سارے سال کے رات دن کا زوال حساب سے نکلا ہوا ہے۔ باقی خیریت ہے۔ اپنی امی جی کو سلام کہو۔ گاؤں والے جو سلام کہتے ہیں' ان کو سلام لکھ دینا۔ مولانا خیر محمد صاحب [۵] کا حال بھی لکھیں۔ وکیل احمد شاہ صاحب سلام قبول کریں اور اپنے والد [۶] کو بھی سلام کہیں۔عزیزی افضل سلمہ [۷] کو السّلام علیکم اور دعائیں۔

والدعا

سید عطاء اللہ بخاری

پتا: نورِ چشم، راحت جاں سید عطاء المہیمن بخاری سلمہ اللہ تعالیٰ در آید

بر مکان سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ محلّہ ٹبی شیر خان' ملتان

حواشی

❶ یہ خط ۲۳/اپریل ۱۹۵۳ء کو سکھر سنٹرل جیل سے لکھا گیا۔ ملتان ڈاکخانہ کی مہر ۲۷/اپریل کی ہے، ہمیں ۲۸ کو ظہر کے وقت ملا۔

❷ بھائی جان کی گرفتاری کے لیے پولیس گھر آئی۔ تفصیل آگے خط نمبر ۹ کے حاشیہ میں آئے گی۔

❸ حفظ قرآن میں کچھ بے توجہی پر استاد صاحب نے مدرسہ ہی میں رکھ لیا تھا۔

❹ ''اِذدِہار'' محلّہ کی ایک بچی جو اماں جی کے پاس قرآن پاک پڑھتی تھی۔ کوئی عرب پیر ملتان آیا تو اس بچی کی والدہ کو اولاد کے زندہ بچنے کے لیے تعویز دیا۔ اور پھر نام بھی خود بتایا۔ ''اِذدِہار''...... جہاں تک مجھے یاد ہے بھائی جان (سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ) نے اس کا مطلب ''کلی کا کھِلنا'' بتایا تھا۔ باقی تمام ہمسایوں، پڑھنے والے بچے، بچیوں اور ان کے والدین کو سلام و دعا لکھے ہوئے ہیں۔

❺ مدرسہ عربیہ خیر المدارس جالندھر کے بانی و مہتمم اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ۔ قیام پاکستان کے بعد خیر المدارس، ملتان منتقل ہوگیا جو الحمدللہ آج بھی قائم ہے اور بہت بڑے جامعہ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ بڑے بھائی جان مرحوم، تینوں چھوٹے بھائی اور خود میرے بچے، حضرت مولانا مرحوم کی شفقتوں کی وجہ سے اسی مدرسہ کے فیض یافتہ ہیں۔

❻ میرے سسر سید محمد شفیع شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، انتہائی صالح اور تہجّد گزار تھے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ علماء سے بہت محبّت کرتے۔ دینی جلسوں میں ذوق وشوق سے شریک ہوتے اور علماء کے بیانات بڑے انہماک سے سنتے۔ اپنی نجی اور گھریلو مجالس میں علماء کے واقعات ، اُن کے اقوال اور اپنے مشاہدات اکثر سناتے، خود بھی حظ اٹھاتے اور گھر والوں کو بھی محظوظ کرتے۔ بہت محنتی آدمی تھے، خوب مشقّت کرتے۔ دین والوں سے ہی دوستی تھی۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز حضرت پیر سید خورشید احمد شاہ ہمدانی، حافظ محمد حسین صاحب، پیر سید مبارک شاہ صاحب اور حکیم حافظ غلام قادر رحمہم اللہ اُن کے خاص دوستوں میں تھے۔ ۵/ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۸/جون ۱۹۹۱ء کو تقریباً ۹۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ بھائی جان نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ رحمہ اللہ رحمۃً وّ اسعۃً

❼ ایک غریب شخص تھا، اس کو یہاں ملازمت دلوائی، کچھ دنوں گھر پر رہا۔

POST CARD

(۵)

۷رمئی ۱۹۵۳ء

سکھر جیل

بٹیا جی! وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ

میرا تار پہنچ گیا ہوگا اور تم سب لوگ اب مطمئن ہو گے۔ اس قسم کی افواہوں [1] پر کان دھرنے کیا ضرورت ہے؟ ہفتہ میں دو خط لکھنے کی اجازت ہے۔ میں تم لوگوں کو اپنے حال سے بے خبر کیوں رکھوں گا۔ اس کے علاوہ اکیلا بھی نہیں ہوں۔ اطمینان سے وقت گزارو۔ زندگی اور موت کے متعلّق کیا سوچنا۔ ہاں خود بھی اور جتنے متعلقّین ومخلصین ہیں، دعاؤں سے غافل نہ ہوں۔ آج ہفتہ ختم ہو رہا ہے، اس لیے کارڈ لکھ رہا ہوں ورنہ خواہش یہی تھی کہ تمہارا خط آلے تو جواباً لکھوں۔ امید ہے تم نے وظیفے لکھ بھیجے ہوں گے۔

وکیل احمد شاہ صاحب سلمہ کو چاہیے کہ درخواست ملاقات چیف کمشنر صاحب کراچی کو دیں۔ وہی اجازت دے سکتے ہیں۔ امتحان خیر وخوبی سے ختم ہوگیا ہوگا۔ ان شاء اللہ پرچے بھی اچھے ہوئے ہوں گے۔ [2] اس سے بھی مطلع کریں۔ یہاں گرمی شروع ہوگئی ہے۔ سناؤ وہاں کیا حال ہے؟ محسن سلمہ کی صحت کیسی ہے؟ میں نے تو مولانا [3] کو لکھا ہے کہ اگر محسن سلمہ آپ کے پاس ہی رہتا ہے تو قرآن کریم بھی آپ ہی سن لیں۔ انھوں نے بھی اس کی صحت کے متعلّق یہی لکھا ہے کہ وہ تندرست نہیں رہتا۔ کیا بات ہے، کیا شکایت ہے؟ امید ہے کہ پیر جی اور مومن سلمہم اللہ تعالیٰ خیریت سے پڑھنے جاتے ہوں گے۔ گیہوں کا کچھ انتظام ابھی سے کر لینا۔ اگر کسی نے

کچھ کر دیا ہے تو مطلع کر دینا۔باقی خیریت ہے۔اپنی امی جان کو سلام مسنون کہو اور بھائیوں کو پیار کرو۔محسن سلمہ کو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اپنی خیریت کا خط ضرور لکھیں۔

والدعا

سید عطاء اللہ بخاری

خط لکھ چکا تھا کہ تمہارا خط ملا۔خیریت معلوم ہوگئی۔الحمدللہ‘ بدھ کو جواب لکھوں گا۔تمام پرسان حال،خورد وکلاں کو درجہ بدرجہ سلام اور دعائیں۔

پتا: بمطالعہ برخوردار حافظ سید وکیل احمد شاہ صاحب بخاری سلمہ اللہ تعالیٰ در آید
برمکان سید عطاء اللہ شاہ بخاری‘ محلّہ ٹبی شیر خان‘ ملتان شہر

موصولہ: ۱۳؍مئی ۱۹۵۳ء

....

حواشی

❶ ان کی شدید علالت کی خبر کئی لوگوں نے آ کر سنائی تھی۔

❷ تب وکیل احمد شاہ صاحب بی۔اے کے طالب علم تھے ان کا امتحان تھا۔

❸ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ۔بانی جامعہ خیر المدارس ملتان۔

۲

POST CARD

PAKISTAN

(۶)
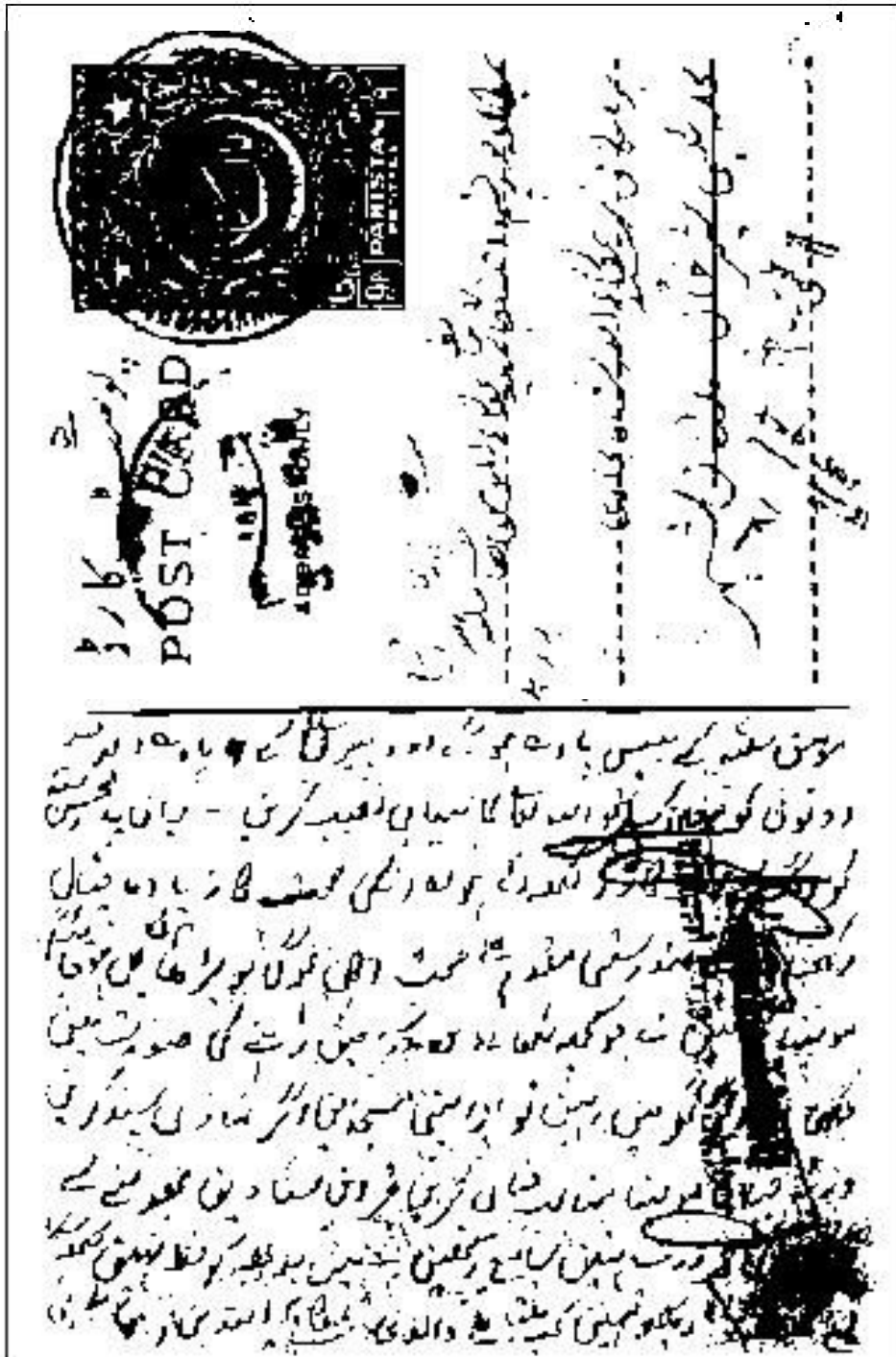
بٹیا جی! وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ

پوسٹ کارڈ مل گیا ہوگا اور امید ہے سب لوگ ان شاء اللہ مع الخیر ہوں گے۔تم نے ایک خط میں پوچھا تھا کہ اخبار ملتا ہے؟ تو ایک اردو کا ''جنگ'' کراچی اور انگریزی کا ''ڈان''۔یہ دو اخبار ملتے ہیں۔کل کے اخبار میں عاجز [1] کی موت کی خبر نے حیرت میں ڈال دیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔واللہ اعلم حقیقت کیا ہے؟ باقی میں تم لوگوں کے متعلق پریشان نہیں ہونا۔فطرت کے تقاضوں میں تو بےبسی ہوتی ہے۔اسے پریشانی نہیں کہنا چاہیے۔ملاقات کا معاملہ تم نے چھیڑ رکھا ہے۔مجھے تو امید نہیں کہ کراچی سے اتنا جلد جواب آجائے گا اور پھر موافق آئے گا۔یہاں جیل کے افسروں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سکھر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب بھی اجازت دے سکتے ہیں اور درخواست یہاں بھی دی جاسکتی ہے۔خیر جو اللہ کو منظور ہوگا' ہوکر رہے گا۔ میرے تین چار کرتے اور ۴۰ نمبر کی بنیائن بکس میں تھیں۔اگر ملاقات کی صورت نکل آئے تو خیر۔ ورنہ دو ایک ٹوپیاں، سفید کرتے، ایک ملیشیا کی چادر' وہ بھی دھلی ہوئی نہیں ہے اور اگر تہبند بھی موجود ہو تو پارسل کے ذریعہ بھیج دینا۔ڈیسک میں ایک تسبیح' پانچ سو دانوں کی ہے' وہ بھی کپڑوں میں رکھ دینا۔باقی اللہ کے فضل سے چائے، پان، برف، اس وقت تو سب سے نجات حاصل ہے اور کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔حالانکہ یہ چیزیں اپنے دام سے مل سکتی ہیں۔مومن سلمہ کے بیس پارے ہوگئے اور پیر جی سلمہ کے نو پارے۔الحمد للہ' دونوں کو مبارک ہو۔اللہ تعالیٰ کامیابی نصیب کریں۔جانِ پدر محسن سلمہ کو الگ پوسٹ کارڈ لکھ رہا ہوں۔ان کی صحت کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے ۔تندرستی مقدم ہے۔صحت اچھی ہوگی تو پڑھائی بھی ہوجائے گی۔مولانا [2] کو میں نے جو کچھ لکھا

ہے‘وہ مدرسہ میں رہنے کی صورت میں لکھا ہے۔اگر گھر میں رہیں تو پھر اپنی مسجد میں‘ اگر نمازی پسند کریں۔ورنہ جہاں مولانا مناسب خیال کریں‘ قرآن سنادیں۔بھولنے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں،سامع رکھیں۔میں بدھ کو خط نہیں لکھ سکا‘ آج لکھ رہا ہوں‘ دیکھو تمہیں کب ملتا ہے؟اپنی امی جان کو سلام کہو اور بھائیوں کو پیار کرو۔آنے جانے والوں کو دعائیں اور سلام پہنچادیں۔وکیل احمد سلمہ السّلام علیکم قبول کریں۔

سکھر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس بھی درخواست لکھ دیں۔شاید یہیں منظور ہوجائے۔

والدعا

سید عطاء اللّٰہ بخاری

۷رمئی‘سکھر جیل

پتا: بمطالعہ نورچشم راحتِ جاں حافظ سید عطاء المؤمن بخاری سلمہ اللّٰہ تعالیٰ
برمکان سید عطاء اللّٰہ شاہ بخاری‘ محلّہ ٹبی شیر خان۔ملتان شہر

موصولہ: ۱۳رمئی ۱۹۵۳ء

☆☆☆

حواشی

❶ خواجہ عبدالرحیم عاجزؔ مرحوم، پنجابی کے معروف شاعر، مجلس احرار اسلام کے رہنما اور تحریک آزادی میں جلسوں کی جان تھے۔ تحریک تحفّظ ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں خواجہ عبدالرحیم عاجزؔ صاحب یا تو قید نہ ہوئے تھے یا پہلے رہا ہو گئے تھے۔ یاد نہیں۔ ساری عمر محنت ومشقّت کی۔ کثیر العیال تھے۔ امرتسر میں لوگ ہندوؤں سے بڑیاں لیا کرتے۔ ابا جی کے کہنے پر انھوں نے یہ کاروبار شروع کیا۔ جہاں جلسہ پر جاتے، نظمیں بھی پڑھتے اور بڑیوں کا پروپیگنڈا بھی ہو جاتا۔ ابا جی سے ۱۹۲۱ء میں میانوالی جیل میں قرآن مجید پڑھا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں کاروبار ٹھپ ہو گیا، دماغ پر ایسا کوئی منفی اثر ہوا کہ اپنے ہاتھوں زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ ان کی والدہ ماجدہ ہمارے بچپن میں زندہ تھیں۔ ابا جی، اماں جی، دونوں انہیں اماں ہی کہتے۔ بڑی خیرخواہ، مخلص، دیندار خاتون تھیں۔ جوانی میں بیوہ ہوئیں، اولاد کو پالا پوسا، بڑیاں بھی بیٹے کے ساتھ بنوایا کرتیں۔ استسقاء سے انتقال ہوا۔ اماں جی کو پیغام بھیجا مجھے آ کر مل جائیں۔ اماں جی ایک رات گئیں۔ چند دن بعد انتقال ہو گیا۔ اللہ پاک ہم سب کو حسن خاتمہ کی نعمت نصیب فرمائیں۔ (آمین)

❷ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمتہ اللہ علیہ

❸ یہ خط بھی ۷رمئی ۱۹۵۳ء ہی کا لکھا ہوا ہے۔ ان کی ناسازیٔ طبع کی افوہ سن کر میں نے خط لکھا تو انھوں نے پھر فوراً جواب لکھ دیا۔
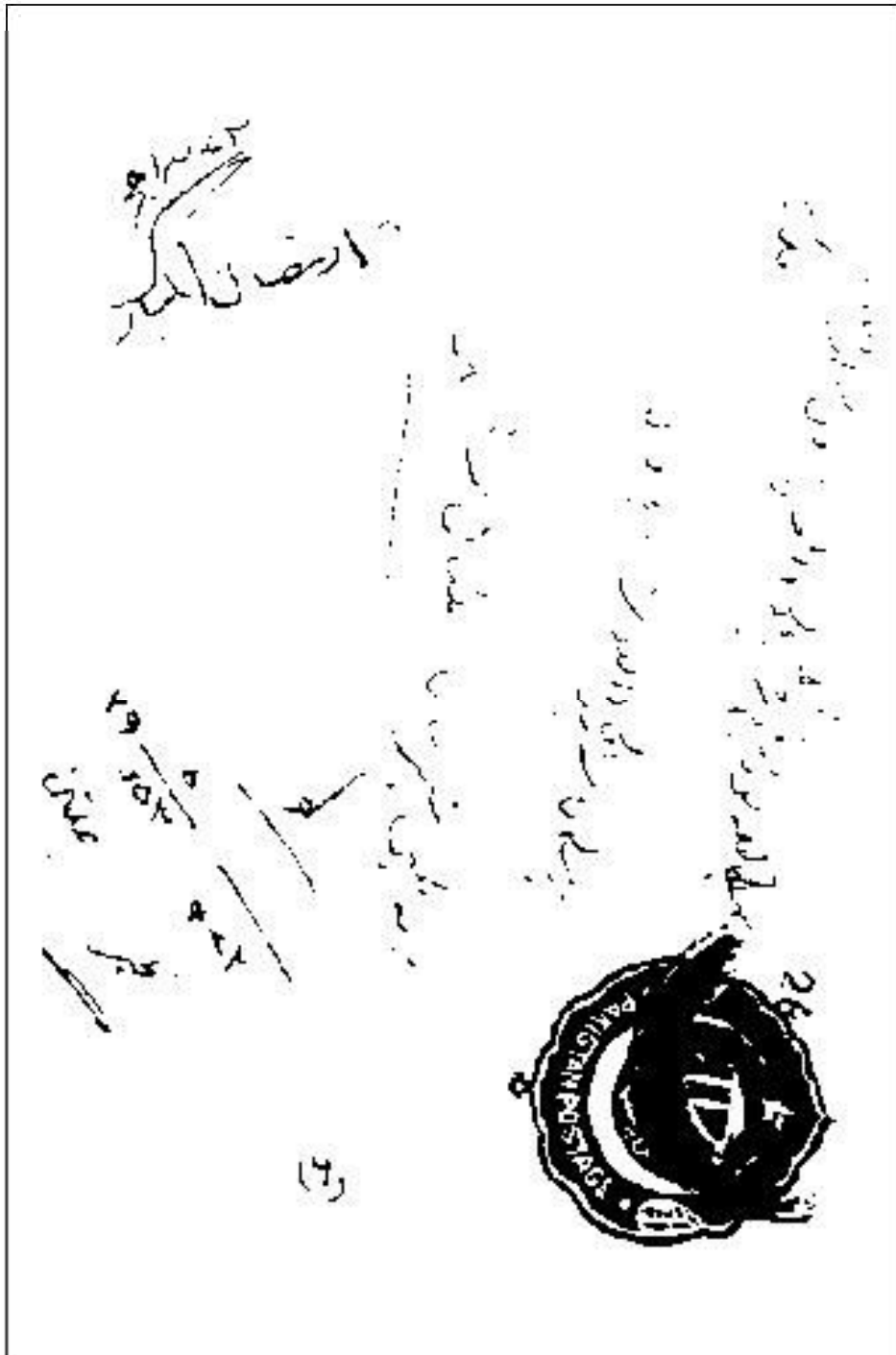
(۷)

۲۲ مئی ۱۹۵۳ء

سید عطاء اللہ بخاری

سکھر سنٹرل جیل

بٹیا جی! وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ

اب کی ڈاک ذرا دیر سے ملی۔ یعنی پہلی تاریخ رمضان کا تمہارا لکھا ہوا خط کل مجھے سات رمضان کو ملا۔ یہ اتفاق کی بات ہے۔ ورنہ یہاں ڈاک ہمیں جلد ہی مل جاتی ہے۔ بہرحال قید قید ہی ہے۔ تم نے میری پریشانی میرے چہرے سے پڑھی' ٹھیک ہے۔ ❶ دو مہینے کے بعد اتنا چل کر ڈیوڑھی گیا' وہاں جا کر معلوم ہوا کہ تم لوگ واپس شہر چلے گئے۔ اس سے صدمہ ہوا۔ یہ تھی پریشانی۔ پھر واپس لوٹا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر جانا پڑا۔ اس تین ماہ کے عرصہ میں چلنے پھرنے کی عادت نہیں رہی ہے۔ اس وجہ سے میں تھک گیا تھا۔ تو دراصل میری وہ کیفیت تمہاری وجہ سے تھی۔ باقی رہی مایوسی' اس کے متعلّق میں ابھی کچھ نہیں لکھتا۔ اللہ تعالیٰ کو سب اختیار ہے۔ میں جو مشورہ دینا چاہتا تھا' وہ بھی میرے قلب کی کمزوری کی وجہ سے تھا۔ آپ کی اماں جان کی رائے سے میں متفق ہوں۔ جس طرح کام چل رہا ہے' اسی طرح اللہ توفیق دیئے جائیں تو چلے چلو۔ دیکھو غیب سے کیا سامان ہوتا ہے۔ میری وجہ سے کسی کام میں تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ گھر کا کام کاج گھر والے ہی بہتر جانتے ہیں۔ باقی تم نے لکھا ہے کہ حالات بدل گئے ہیں۔ ہم کو دو اخبار یہاں ملتے ہیں۔ ایک ''جنگ'' کراچی اور ایک ''ڈان''۔ ان میں تو کوئی خاص تبدیلیٔ حالات نظر نہیں آتی۔ اگر اجازت مل گئی تو پنجاب کا کوئی اخبار جاری کرائیں گے۔ اتنا کل کے اخبار سے معلوم ہوا

ہے کہ ''آثار'' نکل آیا ہے۔ ہاں ملتان یا لاہور کے دفتر کے متعلق اگر کوئی بات معلوم ہوئی ہو یا اخبار میں آئی ہو تو لکھ دینا۔ دونوں جگر گوشوں نے قرآن کریم سنانا شروع کردیا۔ مجھے خوشی ہوئی ہے' الحمدللہ۔ قاری صاحب اگر مومن سلمہ کا قرآن بھی نفلوں میں سن لیتے تو اچھا ہی ہوجاتا۔ آئندہ جیسا وہ مناسب خیال فرمائیں اور پیر جی سلمہ کے نو پارے تو تم ہی سن لو۔ کیا رمضان میں بھی مدرسہ جاتے ہیں اور ان کے سبق وغیرہ ہوتے ہیں۔ تمہارے چچا صاحب دعائیں کہتے ہیں۔ کل تمہاری چچی صاحبہ ملاقات کو آئی تھیں۔ امید ہے واپسی پر تمہیں ملیں گی، اطلاع دینا۔ جن عزیزوں کی طرف سے سلام تم نے لکھا ہے۔ ایک ایک کو میری طرف سے سلام اور دعائیں پہنچا دو۔ الحمدللہ گیہوں وغیرہ کا انتظام ہوگیا۔ مجھے فکر نہیں تھا' یونہی پوچھا تھا۔ رمضان شریف الحمدللہ بہت اچھا گزر رہا ہے۔ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پلنگ پر پڑے رہتے ہیں۔ دن کو ذرا گرمی ہوتی ہے۔ رات کو سب کپڑے اوڑھ کر سوتے ہیں۔ کچھ رعایتیں خورونوش کی بھی مل گئی ہیں۔ بہر حال الحمدللہ، الحمدللہ۔ محسن، مومن، مہیمن، وکیل احمد سلمہم اللہ تعالیٰ کو دعائیں۔ آپ کی اماں جان کو السّلام علیکم۔ جواب جلد ہی لکھنا' پہلے بھی دیر ہوگئی۔

والدعا

سید عطاء اللہ بخاری

پتا: بمطالعہ نورچشم حافظ سید عطاء المحسن بخاری سلمہ اللہ تعالیٰ' درآید
برمکان سید عطاء اللہ شاہ بخاری' محلّہ ٹبی شیر خان۔ ملتان شہر

موصولہ: ۱۵؍ رمضان المبارک ۱۳۷۲ھ، ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء

حواشی

1 ہم لوگ ۲۹؍شعبان ۱۳۷۲ھ ۱۴؍مئی ۱۹۵۳ء کو بعداز ظہر ابا جی سے سکھر سنٹرل جیل میں ملے تھے۔ انہیں یہ کہا گیا کہ بچے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ مجھے اور میرے دونوں چھوٹے بھائیوں عطاء المومن اور عطاء المہیمن کو ایک مہاجر ڈاکٹر صاحب کے ہاں بٹھا کر ابوالکفیل اور محسن میاں پہلے جیل گئے اور آمد کی رپورٹ کی اور ساتھ اجازت نامہ دکھا کر ملاقات کا وقت مانگا تو انھوں نے ۲یا ۳ بجے دن کا وقت دیا تھا۔ ابا جی ڈیوڑھی پر آئے تو یہ لوگ واپس آ چکے تھے۔ اس لیے ان کو تکلیف ہوئی۔ پھر ہم سب دوبارہ گئے۔ ابا جی کو دوبارہ بلایا گیا تو ہم پھاٹک کے ساتھ کھڑے تھے۔ ہم بہن بھائیوں کے لیے دروازہ کھولا گیا اور پھر ہم ابا جی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل میں ایک کمرے میں چلے گئے۔ قانوناً داماد نہیں مل سکتا تھا اس لیے ان سے سلاخوں کے درمیان سے صرف مصافحہ ہو سکا۔ ابا جی کو پھوڑے نکلے ہوئے تھے اور بہت کمزور معلوم ہو رہے تھے۔ اسی حوالے سے میں نے کچھ لکھا اور پریشانی کا اظہار کیا۔ یہ اُسی کا جواب ہے۔

2 قاری محمد اجمل صاحب رحمہ اللہ جو ان دنوں قاسم العلوم، ملتان میں مدرس تھے۔ دائرہ دین پناہ (ضلع مظفر گڑھ) کے رہائشی تھے۔ غالباً ۲۰۰۶ء میں انتقال ہوا۔

3 صاحبزادہ سید فیض الحسن کی بیگم صاحبہ۔ لیکن وہ بے چاری ہمارے ہاں کہاں آنے والی تھیں، اور نہیں آئی تھیں۔

(۸)

سکھر جیل (۱۲ر رمضان ۱۳۷۲ھ/ ۲۶ر مئی ۱۹۵۳ء)

سید عطاء اللہ بخاری

بٹیا جی! وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ

تمہارا ۹ر رمضان المبارک کا لکھا ہوا خط آج ۱۲ر رمضان شریف کو مجھے ملا۔ خیریت معلوم ہوئی۔ تمہاری خالہ صاحبہ ❶ سلّمہا اللہ تعالیٰ کے آنے کی خبر سے مجھے بہت مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے۔ میں اس سے قبل ایک خط لکھ چکا ہوں۔ امید ہے وہ اب مل گیا ہوگا۔ اس میں، میں نے لکھا تھا کہ تمہاری چچی صاحبہ گوجرانوالہ جاتے ہوئے تمہیں ملیں گی۔ اگرچہ طویل سفر اور موسم کی شدت کے باعث زحمت ہے۔ مگر امید یہی ہے کہ وہ تمہیں ملی ہوں گی، اطلاع دینا۔

میں اپنے روزوں کا حال پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور اب پھر لکھتا ہوں کہ الحمدللّٰہ ثم الحمدللّٰہ بہت ہی اچھے گزر رہے ہیں۔ تمہارے والی بات، نہ بھوک نہ پیاس۔ رات کو ٹھنڈک کافی ہوتی ہے اور دن بھی قابل برداشت گرم ہے، نا قابل برداشت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ملتان یہاں سے زیادہ گرم ہوگا۔ پچھلے دنوں اخبار میں بھی یہی چھپا تھا۔ شربت ابھی پیا نہیں ہے۔ اس کے متعلّق تو دوسرے خط میں لکھوں گا۔ قاری صاحب کو سلام مسنون۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ دونوں بچوں ❷ سے آپ نے نفلوں میں پڑھوانا شروع کر دیا ہے۔ مجھے بے حد مسرت ہوئی ہے اور میں ممنون ہوں اور دعا گو ہوں۔ مولانا ❸ کی رہائی پڑھ لی۔ خوشی ہوئی۔ بے چارے بیمار تھے، اللہ ان کو سلامت رکھے۔ باقی تم جو لکھو گی اس کے متعلّق میں لکھ چکا ہوں۔ میری

رائے یہی ہے کہ تسلی تشفّی کے ساتھ جس طرح کام چل رہا ہے، اب چلنے دو، کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ۔اللہ تم لوگوں کا حافظ وناصر ہو۔گھر کی ذمہ داری تمہیں لوگوں پر ہے۔اللہ تعالیٰ ہمت دے دیں۔توفیق الٰہی تم لوگوں کے شامل حال ہو۔تمہیں لوگوں سے مراد آپ کی اماں جی ہیں۔ان پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل وکرم ہے۔تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ انہی کی دعاؤں کو قبول کریں۔کسی افواہ پر ہرگز اعتبار نہ کرنا۔حتیٰ کہ اگر کوئی میری تحریر یا دستخط پیش کرے تو اعتبار نہ کرنا۔لوگ خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں۔ہر ہفتہ دو خط لکھنے کی اجازت ہے۔اگر خدانخواستہ مجھے کوئی تکلیف ہوتو میرے ساتھی تمہیں اطلاع دے سکتے ہیں۔تمام پرسان حال کو سلام اور دعائیں۔بھائیوں کو دعائیں کہواور پیار کرو۔خالہ جی اور امی جی کو سلام کہو۔باقی حالات پنجاب کے متعلّق تمہیں جو علم ہو ،لکھو۔اس میں کوئی حرج نہیں۔باقی دوسرے خط میں مولانا لاہوری کو خط لکھ کر ان کی خیریت معلوم کرنا اوران کے حال سے مطلع کرنا۔راحت جاں وکیل احمد شاہ صاحب کو السّلام علیکم ۔اپنے ابا جی ⓬ کوسلام کہہ دیں۔

والدعا

سید عطاء اللہ بخاری

پتا: نورچشم ،راحت جاں جناب حافظ سید وکیل احمد شاہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ
برمکان سید عطاء اللہ شاہ بخاری، محلّہ ٹبی شیر خان، ملتان شہر

موصولہ: ۳۱رمئی ۱۹۵۳ء

حواشی

❶ ہماری اکلوتی خالہ، ہم سب بہن بھائی اُنہیں ''ماسی جی'' کہتے۔ چھٹے ماہ کی بیاہی ہوئی، زلزلہ کوئٹہ ۱۹۳۵ء میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ پھر ساری عمر مصلّے پر اور بچوں کو قرآن پڑھانے میں گزار دی۔ میکے گھر ''ناگڑیاں'' (ضلع گجرات) میں رہتی تھیں۔ کبھی کبھی ملنے ملتان تشریف لاتیں۔ بہت بہادر اور صالحہ خاتون تھیں۔ ۱۸/اگست ۱۹۸۵ء کو ۷۵ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ ناگڑیاں کے آبائی قبرستان ''جنڈی'' میں والدین اور بھائی کے قدموں میں آسودۂ خاک ہوئیں۔ گاؤں کے چار پانچ سو بچے بچیوں کو قرآن کریم پڑھایا۔ کئی بچیاں تو مستقل اُن کے پاس رہتی تھیں۔ اُنہی کی دعاؤں کا ثمر ہے کہ آج اس گاؤں میں خاندان کا تو کوئی فرد حیات نہیں مگر ہمارا آبائی گھر بچیوں کے مدرسہ کی شکل میں آباد ہے۔ سو سے زائد بچیاں قرآنِ کریم حفظ و ناظرہ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ بچوں کے لیے مدرسہ محمودیہ معمورہ پہلے تو گھر سے ملحق آبائی قدیمی مسجد میں قائم ہوا پھر کسی مخلص دین دار نے قریب ہی ایک قطعۂ زمین وقف کر کے پختہ عمارت بھی تعمیر کر دی۔ اب مسجد اور مدرسہ دونوں جگہوں پر سو سے زائد بچے حفظِ قرآن کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جبکہ گاؤں کے دو بچے مکمّل عالم دین بن چکے ہیں اور مزید عالم بن رہے ہیں۔ مدرسہ کے قیام میں ساری کوشش مرحوم بھائی سید عطاء المحسن بخاری نے کی۔ یہ دینی خدمت خاندان کے تمام مرحومین کے لیے صدقۂ جاریہ، توشۂ آخرت اور ذریعۂ نجات ہے۔ (ان شاءاللّٰہ)

❷ برادرانِ عزیز عطاءالمومن، عطاءالمہیمن سلّمہم اللّٰہ

❸ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللّٰہ علیہ، جو تحریک تحفّظ ختم نبوت میں قید ہوئے اور ملتان سنٹرل جیل سے رہا ہو کر مدرسہ قاسم العلوم تشریف لائے۔ پھر گھر آئے، اماں جی کو تسلّی دی، آم ہدیہ لائے، بھائی عطاءالمحسن کو نصیحتیں کیں۔ اس وقت وہی گھر تھا اور پھر لاہور تشریف لے گئے۔

❹ میرے سسر، چچا سید محمد شفیع شاہ صاحب رحمۃ اللّٰہ علیہ

۹

POST

ADDRESS

(۹)

سکھر جیل ۔ ۲۷ مئی ۱۹۵۳ء
سید عطاء اللہ بخاری
بٹیا جی! وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ

پارسل آج وصول ہوا۔ اس لیے رسید آج لکھ رہا ہوں۔ شام کو افطار کے وقت معلوم ہوگا، کیسا بنا ہے۔ میری کئی ٹوپیاں نئی بکس میں موجود تھیں مگر تم نے ایک پرانی ٹوپی بھیج دی۔ اس کی کیا وجہ؟ باقی جس دن ملاقات ہوئی' اس دن سے میرے قلب میں امرِ معلوم ❶ کے متعلّق ایک کھٹک سی رہتی ہے۔ واللہ اعلم کیا وجہ ہے؟ اگر چہ تم نے بہت اطمینان دلایا تھا مگر پھر بھی دعوتِ شیراز کا خیال رہتا ہی ہے۔ اگر کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہو تو ضرور لکھنا۔ باقی سب پرسان حال کو سلام و دعائیں۔ حالات میں اگر کوئی خاص تبدیلی ہوئی ہو تو ضرور لکھو۔ ہمارے اخبار میں بہت کم خبریں ہوتی ہیں۔ آج مولانا عارف اللہ ❷ وغیرہ کی رہائی کی خبر پڑھی ہے اور بس۔ ملتان کے متعلّق کوئی خبر نہیں پڑھی۔ بہر حال جو کچھ تم لکھ سکو' لکھ دینا۔ صحت میری بفضل خدا اچھی ہے اور روزے تو بفضلہٖ تعالیٰ بہت ہی اچھے گزر رہے ہیں۔ الحمد للہ۔ اپنی امی جی اور خالہ جی کو السّلام علیکم کہو۔ بھائیوں کو پیار کرو۔ اور سب خورد و کلاں کو سلام اور دعائیں۔ محسن سلمہ سے کہو اپنی خیریت اپنے ہاتھ سے ضرور لکھے۔ حافظ سید وکیل احمد کو سلام اور دعائیں۔

والدعاء
سید عطاء اللہ بخاری

پتا: بمطالعہ نور چشم، راحت جاں حافظ سید عطاء المحسن بخاری سلمہ اللہ تعالیٰ' در آید بر مکان سید عطاء اللہ شاہ بخاری' محلّہ ٹبی شیر خان' ملتان شہر

موصولہ: ۳۱ر مئی ۱۹۵۳ء

حواشی

❶ ''امرِ معلوم'' بھائی جان مرحوم ومغفور (سید ابوذر بخاری) کے حالات تھے اور تفصیل لکھے بغیر سمجھ نہیں آ سکتی۔ وہ مجلس احرار اسلام کی مجلس عاملہ کے رکن تھے اور ابا جی کے کہنے پر نہیں بلکہ مجلس کے مرکزی رہنماؤں ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین اور مولانا محمد علی جالندھری مرحومین نے ان کو ان کی علمی صلاحیت کی بنا پر شامل کیا۔ دستور کمیٹی کا ممبر بنایا اور سب سے بڑی ذمہ داری یہ تھی کہ مرکزی دفتر لاہور میں ایک گروپ ایسا تھا جو مالیات کے معاملے میں نا قابل تحسین حرکات کرتا تھا۔ بھائی جان کہتے تھے ہم اللہ اور رسول کے نام پر پائی پائی اکٹھی کرتے ہیں اور عنداللہ جواب دہ ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم کی تجویز اور بھائی جان کی تائید سے صوبائی مجلس کا دفتر ملتان منتقل کر دیا گیا اور مجلس کا فنڈ بھائی جان کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اب کوئی رقم تب تک خرچ نہیں ہوسکتی تھی' جب تک مولانا محمد علی جالندھری اور بھائی جان دستخط نہ کردیں۔ ''اس گروپ'' نے یہ حالت کردی تھی کہ لاہور جیسے شہر کی مضبوط جماعت کے پاس ایک دفعہ مرکزی دفتر کے کرایہ تک کے لیے رقم نہ تھی۔ ماسٹر تاج الدین انصاری ملتان تشریف لائے، کارکن جمع کر کے چندہ کیا گیا۔ میرے پاس والدین سے وقتاً فوقتاً' خصوصاً ابا جی سے ملنے والے پیسے' ۱۰۰ روپے جمع تھے۔ ابا جی سفر سے آتے تو پانچ دس مجھے بھی دے دیتے' وہ میں نے ہدیہ کیے۔ بھائی جان نے ۱۰ روپے دیئے۔ والدہ نے بھی کچھ رقم دی تھی' اب یاد نہیں۔ اور محسن سلمہ (جب یہ سطور لکھی تھیں' تب میرا ویر زندہ تھا۔ انتقال ۱۲/نومبر ۱۹۹۹ء) جو ابھی ابتدائی کتب پڑھتا تھا' اپنے جیب خرچ سے ۵ روپے اس نے دیئے اور باقی کارکنوں نے بھی۔ اس طرح ماسٹر جی نے لاہور جا کر واجبات ادا کیے۔ یہ دفتر کی ملتان منتقلی سے کچھ دن پہلے کا قصہ ہے۔ جب تحریک شروع ہوئی، اکابر تو کراچی سے گرفتار کر لیے گئے۔ بھائی جان نے حالات بھانپتے ہوئے ملتان دفتر میں سے ریکارڈ اور کچھ کتب جو اٹھوا سکتے تھے' اٹھوا کر گھر منگالی تھیں۔ پھر وہ لاہور گئے اور وہاں دفتر میں سے امکانی حد تک ریکارڈ اٹھوا کر کہیں رکھوا دیا۔ جتنے دن روزنامہ ''آزاد'' شائع ہوتا رہا۔ مولانا مجاہد الحسینی صاحب اور بھائی جان خوب خبریں شائع کرتے رہے۔ پھر اخبار بند ہوا۔ مجاہد صاحب گرفتار ہوئے، دفاتر سیل کر دیئے گئے اور دریاں تک پولیس اٹھا کر لے گئی۔ روزنامہ ''آزاد'' کی سرگرمیوں اور جماعت کے دیگر انتظامی ومالی معاملات میں عدم تعطّل سے سرکار کو سخت پریشانی تھی۔ اور حکام کو یہ سُن گُن بھی تھی کہ اس کے روحِ رواں بھائی جان ہی ہیں۔ چنانچہ خصوصی طور پر ان کی ڈھنڈیا پڑی ہوئی تھی۔ ادھر جماعت کے بڑوں کی رائے یہ ٹھہری کہ بھائی جان گرفتاری نہ دیں۔

بھائی جان نے اماں جی سے بھی پوچھ بھیجا کہ کہیے تو گرفتاری دے دوں۔ کہنے لگیں بہتر یہی ہے کہ نہ گرفتاری دو، نہ گھر آؤ۔ کہیں روپوش رہو۔ اُدھر پنجاب انتظامیہ نے اُن کے وارنٹ گرفتاری جاری کر رکھے تھے۔ چنانچہ بھائی جان تقریباً چھے ماہ ملتان سے باہر رہے۔ انھوں نے روپوشی کے ایام مختلف جگہوں پر گزارے اور تحریک کی قیادت سے رابطے میں رہے۔ کسی نہ کسی ڈھنگ سے کارکنوں تک ہدایات پہنچاتے رہے۔ پہلے لاہور ''سلطان فونڈری'' کے مالکان جناب صوفی محمد اسلم، محمد افضل صاحبان (مرحومین) نے خطرہ مول لے کر اپنے پاس رکھا لیکن جب محسوس کیا کہ وہ ان کے پاس محفوظ نہیں ہیں تو ان کو کہیں باہر بھیجنے کا پروگرام بنایا۔ ساتھ جانے والا آدمی راستہ میں کسی طرح بچھڑ گیا۔ بھائی جان اچھرہ میں میاں محمد رفیق صاحب (مرحوم) کے پاس پہنچ گئے۔ بے چارے فونڈری والوں نے بہت ڈھونڈا' کہیں نہ ملے۔ حتیٰ کہ جرأت کر کے وہ تھانے بھی چلے گئے کہ ایک حافظ تراویح پڑھانے کے لیے منگوایا تھا' ناواقف تھا، راستہ بھول گیا۔ کہیں آپ کے پاس تو نہیں؟ مگر بھائی جان وہاں نہ تھے۔ میاں محمد رفیق صاحب نے فونڈری والوں کو پیغام بھیجا تو وہ رات کو آئے اور اپنے ایک ملازم نیاز احمد کے ہمراہ' وار برٹن ضلع شیخوپورہ میں اپنے کسی واقف کے ہاں پہنچا دیا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بھائی جان کہیں بھی ہوں' دیکھنے والے فوراً پہچان لیتے۔ یہ کون ہے؟ بس وہاں اس گھر میں منزل پڑھتے رہتے۔ لیکن جب وہاں پولیس کے چھاپے کا خطرہ محسوس ہوا تو پھر ان کو کراچی پہنچا دیا گیا۔ جس ٹرین پر وہ کراچی جا رہے تھے' ملتان سے وکیل احمد شاہ صاحب بھی اس میں سوار ہوئے اور بھائی جان کے رفیق سفر بنے۔ کراچی اسٹیشن سے باہر نکلے تو وہاں بھی بعض لوگوں نے پہچان لیا۔ وہ اشاروں سے اپنے ساتھیوں کو بتلاتے کہ وہ شاہ جی کے بیٹے جا رہے ہیں۔ پہلے تو ایک مخلص حافظ سعید صاحب کے ہاں قیام کیا پھر مولانا محمد اسلم صاحب مرحوم جو بعد میں نشتر کالج ملتان کی مسجد کے خطیب رہے' ان کے پاس کئی ماہ رہے۔ وہ مجلس احرار اسلام کے قدیم کارکن اور ابا جی کے بہت ہی عقیدت مند تھے۔ خوش الحان تھے اور کسی زمانے میں ابا جی کی طرز اور لہجے میں قرآن پڑھتے تھے۔ بعد میں تبلیغی جماعت میں دعوت و تبلیغ اور اصلاح کے کام میں مشغول ہو گئے۔ چند برس قبل نشتر میڈیکل کالج کی مسجد سے ملحق مکان میں ہی ان کا انتقال ہوا۔ بہت ہی صالح انسان تھے۔ والدہ ماجدہ اور میں' بھائی جان کو وار برٹن مل کر آئے۔ میں تو اس صورت میں کہ نہ میرے پاس ٹکٹ تھا' نہ مجھے معلوم' کہاں جانا ہے؟ ٹکٹ وکیل احمد شاہ صاحب کے پاس تھے۔ جب گاڑی وار برٹن رکی اور انھوں نے کہا کہ اترو' تب معلوم ہوا کہ یہاں اترنا ہے۔

ہم لوگ ابا جی سے سکھر جیل میں مل کر آئے تو رمضان شروع ہو گیا۔ عید کے بعد بھائی جان سے ملاقات کی۔ پھر میں بیمار ہو گئی۔ پورے چھے ماہ چارپائی پر گزرے اور کچھ دن بے ہوشی میں۔ پھر بھائی جان کو بڑے جتنوں سے کراچی سے گھر لایا گیا۔ ابا جی کی رہائی تک گھر کے اندر ہی رہے۔ مولوی یٰسین صاحب تب قاسم العلوم ملتان کے طالب علم تھے اور اب نائب مہتمم اور معروف مولانا ہیں۔ ان کو بھیجا گیا

اور وہ ساتھ لے کر آئے۔ سارا دن بند کمرے میں بیٹھے رہتے۔ اکثر اوقات منزل پڑھتے رہتے۔ پڑھنے والے بچوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ چونکہ ''آپا جی'' بیمار ہیں۔ ایک حافظ صاحب آئے ہوئے ہیں، پڑھتے ہیں، کمرے میں نہیں جانا۔

گزشتہ صفحات میں چوتھے خط میں ابا جی نے لکھا ہے ''شب معراج کا قصہ معلوم ہوا'' تو تفصیل در تفصیل یہ ہے کہ بھائی جان کی ''گمشدگی'' کے بعد اکثر محلّہ کے ایک سپاہی کی بیوی آتی' یہ جہلم کے علاقہ کی تھی۔ اماں جی سے کہتی: 'اماں جی! کی حال اے؟'' اماں جی کہتیں: ''شکر ہے اللہ کا''۔ پھر ابا جی کا پوچھتی اور پھر کہتی: ''اماں جی! ساڈے وڈے بھراؤ نا کجھ پتہ لگا کہ نئیں؟ تہاڈے پتر کوں وڈا فکر اے''۔ یعنی ...... اماں جی ہمارے بڑے بھائی کا بھی کچھ پتا لگایا نہیں؟ آپ کے بیٹے (یعنی محترمہ کے شوہر) کو بڑا فکر ہے۔ اماں جی فرما دیتیں کچھ پتا نہیں۔ تحریک ختم ہونے کے بعد نہ کبھی ''پتر'' نے خیریت دریافت کرائی اور نہ کبھی ''بیٹی'' کا دل پھڑکا۔ ایک دن بھائی عطاءالمحسن سلمہ کو خیر المدارس میں، پڑھائی کے دوران بخار چڑھا۔ وہ عصر کے بعد بخار کچھ ہلکا ہونے پر چادر اوڑھے منہ سر لپیٹے آیا۔ ظاہر ہے محلّہ میں سے گزرا اور اس نے محلّہ میں رہنے والے پولیس کے ایک سپاہی کو بھی کسی دکان پر بیٹھے دیکھا۔ رات کو بخار تیز ہو گیا۔ وہ ''شبِ معراج'' تھی۔ گھر میں موجود واحد مرد' ابوالکفیل کو اماں جی نے سکھر بھیجا تھا کہ جا کر پتہ کرو' ملاقات کی کوئی صورت بن سکتی ہے یا نہیں؟ اماں جی اور تینوں چھوٹے بھائی گھر پر تھے۔ محسن کا بخار سر کی طرف چڑھنے لگا تو ہم ماں بیٹی نمک گھی ملا کر اس کی پنڈلیاں سونتنے لگیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ گلی سے ملحقہ میدان میں کوئی لاری کھڑی ہوئی ہے۔ آواز تھی پہیوں کی۔ میرے کان کھڑے ہوئے کیونکہ کئی روز سے افواہ تھی کہ شاید پولیس تلاشی کے لیے آئے۔ پھر گلی میں بوٹوں کی آواز آنے لگی جیسے فوجی یا پولیس والے چلیں۔ تو میں نے کہا اماں جی لگتا ہے کہ پولیس آئی ہے اور ساتھ ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ محسن نے اس حال میں اٹھنے کی کوشش کی لیکن ہم ماں بیٹی نے اسے روکا اور ہم دونوں دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہوئیں۔ اماں جی نے پورے دبدبہ سے پوچھا کون ہے؟ جواب ملا دروازہ کھولو' پولیس ہے۔ اماں جی نے کہا گھر میں مرد کوئی نہیں' دروازہ نہیں کھل سکتا۔ ایک پولیس مین نے کہا اماں جی! آپ کے مرد کہاں ہیں؟ اماں جی نے کہا جیل میں تم نے ڈالے ہیں اور پوچھتے مجھ سے ہو کہاں ہیں۔ کہنے لگے دروازہ کھول دیں ورنہ دیوار پھاند کر اندر آ جائیں گے۔ اماں جی نے کہا شاباش، پاکستانی بچو! یہ سلوک ہمارے ساتھ انگریز نے بھی نہیں کیا تھا جو تم کر رہے ہو۔ ایک بولا' یہ محلے کا نمبر دار کھڑا ہے' یہ ساتھ اندر آئے گا۔ دروازہ کھول دیں۔ اماں جی نے کہا ہم کسی نمبر دار کو نہیں جانتے۔ ایسے دروازہ نہیں کھل سکتا۔ کیا تمہارے پاس کوئی حکم نامہ ہے تلاشی کا؟ تو ایک صاحب نے اپنے آپ کو ماں کی گالی دی اور کہا اجازت نامہ نہیں تو یونہی' ایسے ایسے...... اماں جی نے کہا تم کو تمیز نہیں ہے بات کرنے کی؟ ماؤں بہنوں سے ایسی گفتگو کرتے ہیں؟ تو کہنے لگا آپ کو ماں تو کہہ رہے ہیں۔ میں نے سوچا جو لوگ اتنی کمینگی پر اتر آئے ہیں' ان سے کچھ

بعید نہیں کہ دیوار بھی پھلانگ لیں۔تب میں نے کہا کہ ہمارا ایک آدمی مسجد بی بی عائشہ میں سویا ہوا ہے'اس کو بلا لائیں تو دروازہ کھل سکتا ہے۔اماں جی دروازے کے پاس کھڑی رہیں۔میں نے جلدی سے ایک ہمسائی کو جگایا' جس کے گھر میں نلکا نہ تھا تو ہم نے صحن میں کھڑکی کھول دی تھی۔وہ وہاں سے پانی بھر لیتی تھی۔ایک تو اماں جی کے کہنے پر اسے کہا کہ اپنے خاوند کو بھیجو' جس طرح بھی ہو مقامی احرار رہنما خان مظہر نواز خان درانی کو بلا لائے۔وہ گلیوں میں سے ہو کر کسی نہ کسی طرح خان صاحب کو لینے چلا گیا۔دوسرا کام یہ کیا کہ ہمسائی کو ساتھ لے کر مجلس کے ریکارڈ کے بورے' کھڑکی کے راستے' ہمسائے کے گھر میں اور اس نے آگے اپنے ہمسائے کے گھر میں دے مارے۔۱۲ بجے شب یہ دھاوا بولا گیا۔ایک پولیس والا مسجد بی بی عائشہ میں اس شخص کو بلانے گیا۔اس کے آنے تک پولیس دروازہ پر کھڑی رہی۔ہم نے دروازہ نہیں کھولا۔پولیس والا مسجد عائشہ گیا اور اس آدمی کو پاکستانی پولیس کے روایتی اخلاقی انداز میں کہا کہ ''چل اوئے! تیرے وارنٹ ہیں''۔وہ ہانپتا کانپتا آیا۔تب میں نے بیٹھک کا دروازہ کھولا۔میں صحن میں آ گئی تو وہ شخص اور پولیس داخل ہو گئی۔میں نے اس شخص کو کہا جو کچھ یہ لوگ اٹھائیں' تم ان کی فہرست بنا لینا۔آواز آئی آپ پردہ کریں۔ہم فہرست بنا کر دیں گے۔تینوں معصوم بھائی تصویر حیرت بنے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔جب میں بات کرتی تو کہتے بہن جی۔بہر حال ہم کمرہ میں چلی گئیں۔اس مکان کی شکل یہ تھی کہ داخل ہوں تو صحن تھا پھر برآمدہ اور تین کمرے ایک لائن میں۔تینوں کے دروازے برآمدے میں کھلتے تھے۔ہم درمیان والے کمرے میں بیٹھ گئیں۔پولیس والوں نے مشرقی جانب کے پہلے کمرے کی تلاشی لی۔تخت پر بھائی جان کی کتب اور رسائل پڑے تھے۔انھوں نے حضرت قاری محمد طیب رحمتہ اللہ علیہ کی تصنیف ''فطری حکومت'' (قاری صاحبؒ کی اجازت سے) چھپوائی۔تحریک شروع ہو گئی اور وہ ویسی کی ویسی پڑی تھی۔اب چھوٹے بھائی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ساتھ تھے۔پھر دوسرے کمرے میں گئے۔

پھر ہم ماں بیٹی کے پاس محلّہ کی ایک عورت کو سوتے سے اٹھا کر لائے کہ دیکھو بیبیاں اکیلی ہیں یا ساتھ کوئی مرد بھی بیٹھا ہے۔وہ عورت اسی روز صبح اماں جی سے بچھو کے کاٹنے پر' پاؤں پر دم کرا کر گئی تھی۔اس نے آنکھیں ملتے ہوئے سلام کیا اور کہا ''مائیاں سیناں کلیاں بیٹھیاں ہن۔بیبیاں کلیاں بیٹھی ہن''۔اماں جی نے کہا اکیلی ہیں تو پھر کیا' تو اس وقت کیوں اٹھ کر آئی ہے؟ کہنے لگی ''کوئے ناں بی بی سین'' مجھے تو نمبردار اٹھا کر لایا ہے کہ جا کر دیکھو بیبیاں اکیلی ہیں یا ساتھ کوئی مرد چھپا ہوا ہے۔اماں جی کو غصہ آ گیا۔کہنے لگیں صبح دم کرا گئی تھی'اب جاسوسی کرنے آئی ہو؟ ہمارے مرد اندر چھپ کر نہیں بیٹھے ہوئے۔وہ بے چاری معذرت کرتی ہوئی چلی گئی۔صبح آ کر پھر معافی مانگی اور کہا نمبردار زبردستی اٹھا کر لایا تھا۔ایک پولیس مین نے پیر جی عطاء المہیمن کو' جو اس وقت سات آٹھ برس کا تھا' پکڑ لیا۔سناؤ پھر بڑے بھائی جان کہاں ہیں؟ اس نے کہا باہر ہی کہیں ہیں' مجھے نہیں پتہ۔کسی نے محسن سے پوچھا' اس نے سرگودھا کہہ دیا۔سب کمرے دیکھ بھال کر آرام سے صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔اتنے میں مظہر نواز خان

درانی بھی پہنچ گئے۔انہیں روکنے کی کوشش کی گئی تو انھوں نے کہا میں ہر صورت میں مکان تک پہنچوں گا۔ روکو گے تو شور مچا کر سارا محلّہ اکٹھا کرلوں گا۔تب انہیں آنے دیا گیا۔عطا محمد نون انسپکٹر تھا یا کون؟ اور خوشی محمد تھانیدار جس نے میری اماں جی کی بات کے جواب میں بکواس کی تھی اور ساتھ یہ کہا تھا آپ کو ماں تو کہہ رہے ہیں؟ اور اماں جی نے کہا تھا ماؤں، بہنوں سے یہ زبان بولتے ہیں؟

دس بارہ مسلح پولیس والے تشریف فرما تھے۔خان صاحب نے آ کر وجہ آمد پوچھی تو معلوم ہوا کہ ''حافظ جی'' کی آمد کی مخبری ہوئی تھی۔محسن جو بخار کی وجہ سے چادر اوڑھ کر آیا تھا۔اس سے بھائی جان کا شبہ ہوا۔خان صاحب نے کہا میری ملتان میں جتنی جائیداد ہے' میں اس بات کی ضمانت پر لگانے کو تیار ہوں کہ حافظ جی تحریک چلنے کے بعد سے ملتان نہیں آئے۔خان صاحب کے آنے سے پہلے' ہمسائی کی دس گیارہ سال کی بیٹی نیچے سے تو گھر نہ گئی کہ کھڑکی بند کر دی تھی۔کوٹھے پر سے جانے لگی تو دو تین سپاہی اس کے پیچھے کوٹھے پر چڑھ گئے۔لطیفہ یہ ہوا کہ وکیل شاہ صاحب کی چارپائی گھر کی چھت پر بچھی ہوئی تھی۔ابا جی سے ملاقات کے لیے وہ سکھر جیل گئے تو کسی کو بھی بستر اٹھانا یاد نہ رہا۔اب جو پولیس والوں نے بستر دیکھا تو ہمسائی کے گھر کود گئے اور کہا ''ایہہ تے بڑے ڈونگے راز نیں''۔اس کے داماد کو پکڑا اور کہا کہ بچّو! تیری مالش کریں گے' صحیح صحیح بتا دے حافظ جی کو کہاں بھگایا ہے؟ اس نے قسمیں کھائیں کہ نہ مجھے پتہ ہے نہ یہاں سے کوئی بھاگا ہے اور نہ میں کبھی شاہ جی کی بیٹھک میں گیا ہوں۔وہ موچی تھا' سارا دن جوتے بناتا۔اس نے صحیح کہا تھا' وہ کبھی بیٹھک میں نہ آتا تھا۔آخر خان صاحب کو بتایا گیا کہ یہ چارپائی وکیل شاہ صاحب کی ہے اور دیکھا جا سکتا ہے' اس پر دھول پڑی ہوئی ہے' یہ اٹھانی یاد نہیں رہی۔خان صاحب کے ضمانت دینے پر دو بجے شب کے بعد پولیس والے واپس گئے۔سٹی انسپکٹر (یوسف شاہ شیرازی) وکیل شاہ صاحب کے رشتہ دار تھے۔اماں جی نے ایک عورت کو ان کے گھر بھیجا اور کہا ہمیں تلاشی کا ذرا افسوس نہیں لیکن تم کسی شریف آدمی کو تو بھیجتے۔صاف قسم کھا گیا کہ مجھے تو پتہ ہی نہیں۔سٹی انسپکٹر اور پتہ ہی نہیں؟ اللہ غریق رحمت کرے مولوی محمد شفیعؒ (کبیر والا والے) کو' وہ ہر جمعہ مسجد سراجاں حسین آگاہی میں تقریر کرتے اور غائب ہو جاتے۔انھوں نے سنا تو آگ بگولا ہو گئے۔جمعہ کے خطاب میں کہا ''او خوشی رام! تو نے میری ماں کے سامنے گالی بکی۔تو ہُڑ ای نہ مویوں (تو ڈوب نہ مرا)''؟ صبح کو ایک دو ہمسائیاں آئیں تو اماں جی نے دکھ کا اظہار کیا کہ ہم دو ماں بیٹی گھنٹہ بھر پولیس کو جواب دیتی رہیں لیکن کسی ہمسائے کو توفیق نہ ہوئی کہ نکلتا اور جواب دیتا۔تو سامنے مکان والے ہمسائے نے کہلا بھیجا۔میں نے دروازہ کھول کر سر نکالا تو سپاہی نے بندوق کی نالی میری طرف کر کے کہا تھا ''خبردار! جو باہر نکلا''۔بعد میں پتہ چلا کہ میدان سے گھر تک پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔مخدوم شوکت حسین گیلانی مرحوم کو پتہ چلا تو انھوں نے دو آدمی بھیجے کہ حال احوال معلوم کر آؤ۔گھر کون تھا؟ وہ گلی میں کھڑے رہے اور بیٹھک کے دروازے کے اندر کھڑے ہو کر میں نے ساری تفصیل ان کو بتائی۔وہ بے چارے کیا کر سکتے تھے؟ ایک دو دفعہ ہا، ہا! کی آواز آئی پھر

کہنے لگے مخدوم صاحب کہتے ہیں پورا واقعہ لکھ دیں۔ ہم کچھ کریں گے۔ دوسرے دن پھر آئے اور لکھا ہوا لے گئے۔ اب تو کئی باتیں بھول بھی گئی ہوں۔ مگر ہونا ہوانا کیا تھا یہاں؟

ابا جی یہ قصہ سن کر تھوڑے سے پریشان ہوئے تھے۔ تفصیل تو ان کو بعد از رہائی ہی سنائی تھی۔ ما شاء اللہ ''مادر پاکستان''، مسلم لیگ کی حکومت تھی۔ پولیس والے ہمارے آبائی گاؤں ناگڑیاں (ضلع گجرات) بھی پہنچے۔ ایک تو ''جائیداد'' کا پتہ کرنے' دوسرے بھائی جان کا۔ وہاں ''دارے'' (''دارا'' گاؤں کی چوپال کا مقامی نام ہے) میں سے ایک پٹواری نے گھر آ کر بات کی ہوگی۔ گاؤں کے نوے فیصد لوگ ہمارے ددھیال یا ننھیال کے شاگرد تھے' قرآن مجید پڑھا ہوا تھا' تو ایک خاتون نے آ کر خالہ جی مرحومہ کو کہا کہ کہہ رہے ہیں پورے پاکستان میں تفتیش کی ہے ان کی کہیں زمین نہیں۔ پتہ نہیں کھاتے کہاں سے ہیں؟ خالہ جی نے کہا' جا کر کہو ''آسمان کے دروازے بند کر سکتے ہو تو کر لو''۔ پھر کہنے لگے بڑے بیٹے کا نام کیا ہے؟ بچپن میں کچھ سال بھائی جان کو ''عبدالصادق'' بھی کہا گیا۔ ٹمن ضلع میانوالی کے مولانا امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نام تجویز کیا تھا۔ پھر دادا جی کا رکھا ہوا نام ''عطاء المنعم''، مشہور ہوا۔ مائی سننے والی کے ذہن میں عبدالصادق تو رہا نہ' کہنے لگی ''اس کا نام صادق حسین شاہ ہے''۔ پھر بڑے بھولے پن سے آ کر خالہ جی کو بتایا کہ میں نے نام بتایا تو پوچھنے والے نے ہنس کر سر ہلایا اور کہا یہ نام نہیں ہے۔

شوال میں بیمار ہو کر میں تو نحیف تر ہوتی چلی گئی۔ ملتان کا کوئی حکیم ڈاکٹر اماں جی نے نہ چھوڑا' جس کا علاج نہ کیا ہو۔ ایسے حالات میں حکیم عطاء اللہ خان صاحب مرحوم نے مشورہ دیا کہ پیرول کی درخواست دے دیں۔ شاید شاہ جی کی ملاقات سے طبیعت سنبھل جائے۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے ابا جی کے وقار پر کوئی حرف آئے لیکن تقریباً تین دن بے ہوشی رہی۔ پھر کئی گھنٹے نبض بھی معلوم نہ ہوتی تھی تو پیرول پر رہائی کی درخواست دے دی گئی۔ کوئی تین ماہ بعد جب میں لاٹھی پکڑ کر ایک طرح سے دوبارہ چلنا سیکھ رہی تھی تو ایک لیڈی ڈاکٹر آئیں کہ آپ کا سرکاری علاج ہوگا' معائنہ کرا لیں۔ اس وقت تو میں ٹھیک تھی۔ پھر وہ ٹونٹیاں لگا کر دیکھ بھال گئیں۔ الحمد للہ نہ اس کے بعد ان کی شکل دیکھی اور نہ دوائی۔ البتہ تین ماہ بعد پیرول کی درخواست نامنظور کر دی گئی کہ مریضہ کی حالت قابل اطمینان تھی۔ خان مظہر نواز خان صاحب بے چارے بھی ایک عیسائی لیڈی ڈاکٹر ''مس شا'' نامی کو لے آئے۔ اس نے دیکھا بھالا، دوائیں دیں۔ پھر کہنے لگی تمہارا جی چاہتا ہے کہ تمہارا باپ قید ہو؟ میں نے کہا وہ حضور ﷺ کے لیے قید ہوئے ہیں' اس لیے ان کی قید سے میرے دل کو کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں اداسی تو ضرور ہوتی ہے۔ کہنے لگی میں تو اپنے باپ کو کبھی نہ قید ہونے دوں۔ بہر حال آرام اس کے نسخے سے بھی نہیں آیا تھا۔ تفصیل کا موقع نہیں' مگر ذہن کی گرہیں کھل رہی ہیں۔ بھائی عطاء المحسن کا بخار اترا تو نہا دھو کر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم کی تقریر سننے جمعہ کے دن مسجد سراجاں حسین آگاہی پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد مسجد بی بی عائشہ کے متولی حافظ نذیر حسین مرحوم نے آ کر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم ماں بیٹی دروازے پر گئیں۔ اماں جی نے پوچھا

کون؟ کہنے لگا میں نذیر حسین ہوں۔ میں کسی کام سے بازار گیا تھا تو دیکھا دو پولیس والے محسن کو ٹانگے میں بٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ اماں جی نے کہا بیٹا! گھر تو کوئی نہیں' اسے تسلّی دینی تھی۔ اتنے میں وکیل شاہ صاحب ایمرسن کالج سے پڑھ کر واپس آ گئے اور کہا میں نے بھی دیکھ لیا ہے' میں جاتا ہوں۔ پولیس لائنز میں وہی ''سچا'' سٹی انسپکٹر یوسف شاہ بیٹھا تھا۔ محسن نے آ کر بتایا مجھے لے کر پولیس والے پہنچے تو انہیں گالی دے کر کہا ''اوئے! اینہوں کیوں لے آئے او؟'' پھر کہا ''سنا یار...... ساڈا ڈنڈے والا پیر کتھے اے؟ خدا دی قسمے اوہنوں تُردیاں ویکھ کے ڈر لگدا اے''۔ محسن تب چودہ سال کا لڑکا تھا۔ اس نے کہا اُن کو بھی تو پتہ ہے' پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔ ہم نے گھر کبھی نام ہی نہ لیا تھا کہ بھائی جان کہاں ہیں۔ محسن نے جان چھڑانے کو کہہ دیا' سرگودھا گئے تھے۔ گھر آ کر بتایا کہ میں نے خود یوسف شاہ کو اشارہ کرتے دیکھا کہ اسے پکڑ لو۔ اتنے میں وکیل شاہ صاحب پہنچ گئے' ان کو دیکھ کر پھر یہی کہا ''اینوں ای فلانے ڈھینگے پھڑ لیائے نیں۔ خدا دی قسمے مینوں تے پتا وی نئی سی''۔ انھوں نے کہا میں چھڑانے نہیں آیا صرف بتانے آیا ہوں کہ باپ جیل میں ہے، بڑے بھائی کا بھی پتہ نہیں کہاں ہے؟ اسے تم نے منگوالیا، دو چھوٹے (عطاء المومن اور عطاء المہیمن) بھی بخار میں پڑے ہیں۔ چارپائیاں اور سپاہی بھیج کر ان کو بھی اٹھوالو۔ میں بھی عبدالحکیم چلا جاتا ہوں' پھر جیسے ہوگا' ماں بیٹی گزارا کرلیں گی۔ یوسف شاہ نے صاف مکرتے ہوئے دو چار گالیاں پولیس والوں کو دیں اور محسن کو بہنوئی کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ اُن دنوں نجف خان ڈی آئی جی پولیس تھے اور بھائی جان کو اس پر بہت غصہ تھا کہ اس سارے قصے کا محرک اور ذمہ دار وہی ہے۔ جب رہائی کے بعد ابا جی اور بھائی جان اکٹھے ہوئے تو بھائی جان نے اس واقعہ پر شدید ردّعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کے خلاف تقریر کروں گا اور لوگوں کو اصل حقائق سے آگاہ کروں گا۔ اس پر ابا جی نے فرمایا:

''ہوا ہی کیا ہے؟ یہی کہ تمہاری اماں اور بہن کے سامنے پولیس والوں نے بدزبانی کی اور گالیاں بکیں۔ نبی کریم ﷺ کی ختم نبوت کے تحفّظ کے لیے اس سے بھی زیادہ بدسلوکی ہوتی تو ہماری سعادت ہوتی۔ اگر تمہاری اماں اور بہن کو گھسیٹ کر سڑک پر لاتے اور اُن کو مارتے تو میں سمجھتا کہ تحفّظ ختم نبوت کا کچھ حق ادا ہوا۔ اللہ کے دین کے کام میں سختیاں اور امتحانات نہ آئیں اور مار نہ پڑے' یہ ہو نہیں سکتا۔ دین کا کام کرو گے تو مار بھی پڑے گی۔ اس کے لیے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھو۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ نبی خاتم ﷺ جیسی رؤف و رحیم ہستی کو دین کے نام پر کتنی تکالیف اٹھانی پڑیں۔ جانتے نہیں! آپ ﷺ کی بیٹی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو زخمی کیا گیا اور وہ اسی زخم سے شہید ہوئیں۔ ہماری کیا حیثیت ہے؟ اس لیے صبر کرو اور دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس حقیر سی قربانی کو قبول فرمائے۔ (آمین)''

[۲] مولانا عارف اللہ قادری' بریلوی مکتبِ فکر کے عالم تھے۔ تحریک میں قید ہوئے تھے۔

(١٠)

۹/ جون ۱۹۵۳ء۔سکھر جیل

سید عطاء اللہ بخاری

بٹیا جی! وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ

شربت اچھا تھا' پیا گیا۔لیکن بادام کے شربت کی عمر بہت ہی کم ہوتی ہے۔اس لیے زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔بہر حال کام آ گیا۔آئندہ اس قسم کی چیزیں بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔تمہیں معلوم ہے کہ میں ان چیزوں کا نہ عادی' نہ شوقین۔ہاں رمضان شریف میں احتیاج ہوتی ہے۔سو روح افزاء کی بوتل جو ملاقات میں ملی تھی ابھی ہے اور یہ باقی روزے اس سے افطار ہوں گے۔ان شاء اللہ۔آج چھبیسواں روزہ ہے۔خدا کرے یہ میرا خط تمہیں عید سے قبل ہی مل جائے۔تم نے جو لفافہ لکھا اور اس میں کچھ حالات لکھے' اس کا ایک ورق تو مجھے دیا گیا۔جو مفتی صاحب کی کراچی سے آمد کے لفظ سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا ورق ضبط ہو گیا۔کئی دن کوشش کرتا رہا کہ وہ بھی ملے۔مگر کامیابی نہ ہوئی۔آخر جیل خانہ ہے۔رنج اور افسوس کی گنجائش نہیں۔لیکن تم اب جو خط لکھو تو انہیں حالات کو ذرا سلجھا کر پھر لکھو' کوئی حرج نہیں۔اب کی امید ہے مجھے دے دیا جائے گا۔بہت زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں' اجمال ہی کافی ہوگا۔باقی وہ ہدایت نامہ [1] بیوی خاوند بھی پڑھ لیا۔الحمد للہ میں غفلت میں تو وقت نہیں گزار رہا۔اگر باہر غافل رہا اور یقیناً باہر بہت کچھ غفلتیں دامن گیر رہیں' اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں۔تو یہاں بھی غافل رہنا' ایمان کی موت کے برابر ہے۔رمضان شریف کی وجہ کر ذرا چلنا پھرنا میرے لیے مشکل تھا اس لیے پڑے ہی رہنا پڑتا تھا اور یہ تو گھر پر بھی اپنا معمول تھا۔چائے اور پان کا چھوڑنا بھی بلا وجہ نہ تھا۔کچھ دقتیں تھیں اور اس سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔اگرچہ برسوں کی عادت تھی۔دراصل ہماری کلاس' سی کلاس تھی۔آج دو تین دن ہوئے' ہمیں بی کلاس دی گئی ہے۔اس میں چائے وائے بھی مل جاتی ہے اور غذا میں بھی خاصا فرق ہے اور جو رعایتیں سیکورٹی قیدی کی حیثیت سے حاصل تھیں' وہ بھی بحال ہیں۔دن کو گرمی خاصی ہے۔رات ابھی ٹھنڈی ہے۔آپ لوگ ان باتوں کے متعلق قطعاً متفکر نہ ہوں اور اصل معاملہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہیں اور بس!

مجھے جس چیز کی ضرورت ہوگی‘ میں خود ہی لکھوں گا۔اپنی امی جان سے کہو کہ وہ ان باتوں کا خیال ہی نہ کریں۔ یہ سب چیزیں یہاں مہیا ہوتی رہتی ہیں۔وکیل احمد شاہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کا خط بھی مل گیا ہے۔لاہور کے دفاتر کا حال معلوم ہوگیا۔غالباً ملتان کے دفتر کا بھی اب تک یہی حال ہوگا۔محسن میاں اور وکیل سلمہما غالباً کل ہی قرآن کریم ختم کریں گے۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔حافظ محسن سلمہ اپنے ہاتھ سے ضرور اپنا حال لکھیں۔شرم کی بات نہیں۔دو چار حرف سیدھے ٹیڑھے ہوں گے تو لکھنے ہی سے ٹھیک بھی ہو جائیں گے۔میرا اپنا خط بھی کونسا عمدہ خط ہے ‘بس گزارا ہے۔میری تو خواہش ہے کہ رمضان کے بعد خواہ قاری صاحب کو کہہ کر اور خواہ گھر میں مومن اور مہیمن سلمہما بھی لکھنے کی مشق ضرور کریں۔تاکید ہے۔جس دن مومن اور پیر جی مجھے اپنے ہاتھ سے خط لکھیں گے‘ وہ دن میرے لیے بڑی خوشی کا دن ہوگا۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔تم نے لکھا ہے کہ ٹوپیاں سلا کر میں بھیجوں گی۔دراصل مجھے ٹوپیوں کی ضرورت تو ہے نہیں۔پہلے ایک تھی اب دو ہیں۔صرف نماز کے وقت پہنتا ہوں اور بس! خط ملنے سے پہلے اگر روانہ کر چکی ہو تب تو خیر۔ورنہ ابھی ضرورت نہیں۔اپنے بھائیوں کو قرآن سنانے پر میری طرف سے مبارک باد کہو۔دعائیں پہنچاؤ اور دیدہ بوسی کرو۔اپنے چچا صاحب ❷ کو میری طرف سے سلام مسنون کہہ دینا اور بچی کے انتقال پر اظہار تعزیت کر دینا۔اپنی امی اور خالہ کو السّلام علیکم کہہ دو اور امید ہے آپ کی خالہ جی دعاؤں میں لگی رہتی ہوں گی۔سب بچوں کو دعائیں۔مسجد میں نمازیوں کو محسن کی معرفت سلام مسنون۔حافظین ❸ اور شاہ صاحب ❹ کو‘ خصوصاً وَدُّو ❺ اور افضل ❻ کو سلام مسنون۔باقی کل پرسان حال کو سلام بھجوا دینا۔اب عید کے بعد غالباً خط لکھ سکوں گا۔

والدعاء

سید عطاء اللہ بخاری

پتا: بمطالعہ جناب حافظ سید وکیل احمد شاہ صاحب بخاری سلمہ اللہ تعالیٰ در آید
برمکان سید عطاء اللہ شاہ بخاری، محلّہ ٹبی شیر خان، ملتان شہر

موصولہ: ۱۳؍جون ۱۹۵۳ء

حواشی

❶ ایک خط میں ابا جی نے لکھ دیا کہ رمضان اچھا گزر رہا ہے۔ لیٹے رہتے ہیں۔اماں جی نے مجھ سے لکھوایا اور مجھے لکھنا پڑا کہ ''آپ لیٹے کیوں رہتے ہیں، پڑھتے پڑھاتے نہیں؟'' اس جملے پر لطیف تبصرہ ہے۔

❷ میری ایک جوان نند انتقال کر گئی تھی تو اس کے متعلّق میرے سسر، چچا سید محمد شفیع شاہ صاحب (رحمہ اللّٰہ) سے تعزیت کا لکھا ہے۔

❸ حافظین، مسجد بی بی عائشہ کے متولّی حافظ عبدالغفار صاحب مرحوم ومغفور اوران کے بھتیجے، داماد اور ان کے بعد مسجد کے امام بننے والے حافظ نذیر حسین صاحب مرحوم۔

❹ محلّہ کے ایک پختہ نمازی اور صبح کی اذان ہمیشہ دینے والے سید محمد حسن شاہ صاحب مرحوم۔

❺ حافظ واحد بخش، حافظ نذیر صاحب کا شاگرد اور مسجد کا نمازی، جو ''وڈّو'' کے نام سے معروف تھا۔

❻ ہمارے گھر کا کام کاج کرنے والا خادم

POST CARD

PAKISTAN

(۱۱)

۲۰ رجون ۱۹۵۳ء ❶

سید عطاء اللہ بخاری

بٹیا جی! وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

خط بھی ملا، عید کارڈ بھی ملے اور پارسل بھی وصول ہوگیا۔ امید ہے کہ میرا خط بھی عید سے پہلے مل گیا ہوگا۔ مجھے تمہارے اس پارسل ❷ پر تعجّب ہے۔ ''ادھیلے کی بڑھیا ٹکا سرمنڈائی'' اسی کو کہتے ہیں۔ خیر آئندہ بغیر میری اجازت کے کوئی چیز نہ بھیجنا۔ خط میں دیر ایک تو پارسل کے انتظار میں ہوئی اور پھر مجھے خیال آیا کہ شاید اس کے بعد خط بھی لکھا ہو۔ لیکن آج تک خط نہیں آیا۔ اب اس وقت مختصر سا پوسٹ کارڈ لکھ رہا ہوں۔ باقی پھر لکھوں گا۔ وہ تمہارے خط کا ورقِ گم گشتہ الحمد للہ کہ مجھے مل گیا۔ اطمینان رکھو۔ ''ڈان'' کراچی میں ۱۹۵۲ء والے خلیفہ صاحب ❸ کا ایک بیان چھپا ہے۔ مگر ''جنگ'' میں نہیں چھپا۔ اگر وہاں کسی پرچہ میں وہ چھپا ہو تو اس کا کٹنگ ضرور بھیج دو۔ عزیزی غلام یٰسین ❹ یہاں ملاقات کے لیے آئے تھے مگر قانون مانع تھا۔ اب وہ کراچی گئے ہیں۔ واللہ اعلم کیوں؟ تم میرے خط کا انتظار کیے بغیر اپنے لوگوں کی خیریت لکھ دیا کرو۔ ورنہ میرا دھیان ادھر ہی لگا رہتا ہے اور حالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہو تو ضرور لکھو۔ مگر مجمل تفصیل کی ضرورت نہیں۔ تم نے بیان دینے کو لکھا۔ بٹیا! جیل خانہ ہے یہاں سے بیان کون دینے دیتا ہے۔ باقی اللہ میاں لوگوں کے دلوں میں خود ہی صحیح بات ڈال دیں گے۔ بھائیوں کو پیار کرو اور اپنی خالہ جی کو، امی جی کو سلام کہو۔ وکیل شاہ صاحب، افضل کو السّلام علیکم اور کل حال پرسان کو سلام

مسنون پہنچا دو۔ ہر ہفتہ ایک دو خط لکھ دیا کرو تاکید ہے۔

والدعاء

سید عطاء اللہ بخاری

پتا: بمطالعہ برخوردار حافظ سید وکیل احمد شاہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

برمکان سید عطاء اللہ شاہ بخاری، محلّہ ٹبی شیر خان، ملتان شہر

موصولہ: ۲۳ رجون ۱۹۵۳ء

....

حواشی

❶ یہ خط بھی سکھر جیل سے تحریر کردہ ہے۔

❷ میں نے سوچا گرمی کا رمضان ہے، وہ جیل میں ہیں۔ اماں جی سے کہہ کر گھر شربت بنوا کر بھیجا۔ اس زمانہ میں بھی محصول کافی لگا، اس کے متعلّق لکھا ہے۔ وہ اپنی ذات کے لیے اتنے تکلفات کے عادی نہ تھے۔

❸ مرزا محمود قادیانی مراد ہے۔ اخبار میں اس کا بیان چھپا تھا:

''۱۹۵۲ء گزرنے نہ پائے گا اور بلوچستان احمدی سٹیٹ بن جائے گا''۔ اس کے جواب میں ابا جی رحمہ اللہ نے بیان دیا تھا کہ ''۱۹۵۲ء گزر گیا۔ اب ۵۳ء میرا ہے۔''۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کے لیے مجلس احرار اسلام نے زبردست تحریک برپا کی۔ ہزاروں مسلمان گرفتار اور شہید ہوئے۔ بہ ظاہر تحریک کو تشدد سے دبا دیا گیا مگر ۱۹۷۴ء میں شہداء ختم نبوت کا خونِ بے گنا ہی رنگ لایا اور پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک آئینی ترمیم کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

❹ مولانا محمد یٰسین صاحب خطیب جامع مسجد القادر گجر کھڈہ، ملتان۔ حال نائب مہتمم جامعہ قاسم العلوم ملتان

POST CARD

ADDRESS ONLY

(۱۲)

سکھر سنٹرل جیل

۷؍جولائی ۱۹۵۳ء

بٹیا جی! وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ

تمہارا مفصّل خط ملا۔ بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ آج ایک خط میں قاضی جی سلّمہٗ (۱) کے نام بھی روانہ کررہا ہوں۔ جس میں بڑے قاضی صاحب مرحوم (۲) کی تعزیت اور گورنمنٹ کی انکوائری کمیٹی میں شہادت کے متعلّق کچھ لکھا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ تم نے خواہ مخواہ اپنا خون خشک کرنا شروع کردیا ہے۔ بٹیا! یہ کوئی اس درجہ میں سوچنے کی بات ہے؟ جو کچھ ہو چکا وہ تمہاری اور دنیا کی نظر کے سامنے ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی ناقابل فہم نہیں اور مستقبل کا آئینہ ماضی و حال ہی ہوا کرتا ہے۔ اس لیے اپنے آپ کو مضمحل بنانے کی ضرورت نہیں۔ میرے متعلّق تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مُسببّ ِحقیقی کے سوا میں ساری کائنات سے کٹ چکا ہوں۔ میرے لیے دنیا میں، دنیا والوں سے کوئی امید، کوئی آرزو باقی نہیں۔ اللہ بس، باقی ہوس۔ ہاں اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں۔

یَفۡعَلُ مَا یَشَاءُ ہے شان اس کی

یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدِ آن اس کی (۳)

آج رات بارہ بجے سے بارش شروع ہوئی اور ہوا بھی خوب چلی۔ فضا خوشگوار ہوگئی ہے۔ بارش صبح کو بھی ہوئی اور ابر اس وقت بھی ہے الحمد للہ۔ یہاں کے بسنے والے کہتے ہیں کہ تین برس کے بعد یہ بارش ہوئی ہے۔ تم نے پوچھا تھا کہ گرمی کا کیا حال ہے؟ یہاں کا درجہ حرارت ۱۲۵ تک پہنچ چکا تھا۔ بس اسی سے اندازہ کرلو۔ مگر الحمد للہ راتیں اچھی ہوجاتی تھیں۔ اب بارش ہوئی ہے، دیکھیے

اب راتیں کیسی گزرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملتان پر بھی رحم فرمائیں ۔ مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ وہاں بھی رحمت پروردگار نازل ہوچکی ہوگی ۔ یہ ملاقات بھی اچانک ہوگئی ۔ میں خط لکھنے والا تھا مگر کچھ موانع تھے اس لیے دیر ہوگئی اور وہ آ گئے ۔ خیر جو ہوا اچھا ہوا۔ تمہاری دوسری باتوں کا جواب پھر لکھوں گا ۔ مجھے امید ہے میرے ملاقاتی (۴) مع الخیر واپس پہنچ گئے ہوں گے۔ اب کی مومن سلّمہٗ رخصت ہوتے ہی رونے لگ گیا اور ماشاء اللہ پیر جی حوصلہ میں رہے۔ اندازہ لگا لو کہ مجھ پر کیا گزری۔ وکیل سلّمہٗ نے اب کی بڑی تکلیف اٹھائی ۔ اللہ دینی اور دنیاوی برکتوں سے مالا مال کرے۔ محسن تمہیں کیا ہوگیا۔ تم خط کیوں نہیں لکھتے ؟ محسن سلّمہٗ کا خط نہ لکھنا میرے لیے تکلیف دہ ہے۔ اس کو کہو مجھے خط لکھے۔ اپنی امی اور خالہ کو سلام کہو اور بھائیوں کو پیار کرو اور کیا کہوں؟

والدعاء

سید عطاء اللہ بخاری

پتا: بمطالعہ برخوردار حافظ سید وکیل احمد شاہ صاحب بخاری سلمہ اللہ تعالیٰ در آید
محلّہ ٹبی شیر خان، مکان نمبر ۲۳۲، ملتان شہر

موصولہ: ۱۲ر جولائی ۱۹۵۳ء

حواشی

(۱) قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم و مغفور۔ مجلس احرار اسلام کے مرکزی رہنماء

(۲) جناب قاضی محمد امین صاحب مرحوم و مغفور۔ والد گرامی قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادیؒ اُن کا انتقال قاضی صاحب مرحوم کے زمانۂ اسارت میں ہوگیا تھا۔

(۳) یہ ابا جی کا اپنا شعر ہے۔ جو اُن کے مجموعۂ کلام ''سواطع الالہام'' میں شامل نہیں۔ غالباً اس کی اشاعت کے بعد کہا گیا۔

(۴) برادرانِ عزیز عطاء المؤمن بخاری اور عطاء المہیمن بخاری سلمہم اللہ جو وکیل احمد شاہ صاحب کے ساتھ ملاقات کے لیے گئے تھے۔

۱۲
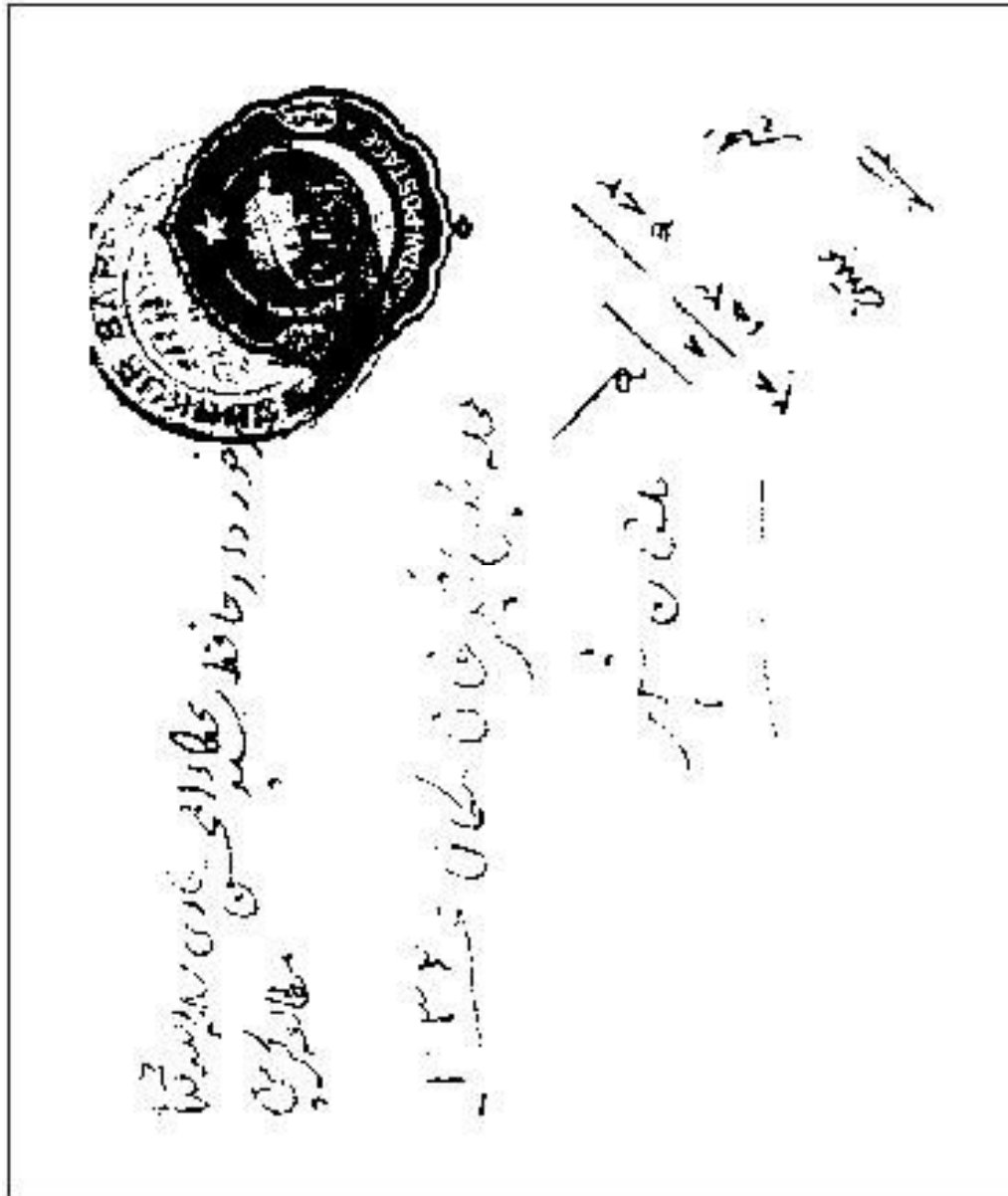
(۱۳)

۲۴/ جولائی ۱۹۵۳ء

سکھر سنٹرل جیل [1]

بٹیا جی! وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ

انتظار شدید کے بعد آج بارہ بجے تمہارا خط ملا۔ الحمد للہ خیریت معلوم ہوئی، اطمینان حاصل ہوا۔ ابھی خط رفیقوں کو سنا ہی چکا تھا کہ دفتر سے آدمی آیا کہ بستر باندھئے اور تیار رہیئے جیلر صاحب نے فرمایا ہے۔ چنانچہ کمر باندھے ہوئے چلنے کوئیاں سب یار بیٹھے ہیں۔ غالبًا لاہور ہی بھیجے جارہے ہیں۔ اب وہاں پہنچ کر خط لکھوں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ بھائیوں کو پیار کرو اور دعائیں دو۔ تمہاری امی جان آچکی ہوں گی۔ [2] ان کو اور خالہ جی کو سلام کہو۔ وکیل شاہ جی! السّلام علیکم۔ اب ملاقات ان شاء اللہ تعالیٰ لاہور ہوگی۔ محلّہ ٹولہ والے چھوٹے بڑے سب کو درجہ بدرجہ سلام اور دعائیں۔ تار میں خیریت ہی دریافت کی تھی اور کچھ نہیں تھا۔

والدعاء

سید عطاء اللہ بخاری

پتا: برخوردار سید عطاء المحسن بخاری سلمہ اللہ تعالیٰ مطالعہ کریں

محلّہ ٹبی شیر خان مکان نمبر ۲۳۲۔ ملتان شہر

موصولہ: ۲۷/ جولائی ۱۹۵۳ء

حواشی

❶ یہ سکھر جیل سے میرے نام لکھا ہوا آخری خط ہے۔

❷ والدہ صاحبہ بھائی جان سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئی تھیں جو تحریک میں روپوش تھے۔

بیٹی کے نام

سنٹرل جیل لاہور سے

(۱۴)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

سنٹرل جیل لاہور ❶

بٹیا جی! وعلیکم السّلام

تار اور خط دونوں مل گئے۔ تم لوگوں کی خیریت معلوم ہوگئی۔ الحمدللہ! میں نے لاہور پہنچ کر ۲۶ر جولائی کو خط لکھ دیا تھا۔ ❷ واللہ اعلم۔ کیوں نہیں پہنچا؟ یہاں کے ضوابط سندھ سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ ملاقات کے متعلّق ضابطہ یہ ہے کہ مہینے میں دو دفعہ ملاقات کا حق ہے اور جمعرات کا روز متعیّن ہے اور اس کی اجازت ملتان کے سپرنٹنڈنٹ پولیس سے لینی چاہیے۔ یہاں داماد کے لیے ممانعت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ملاقات کے لیے جلدی نہ کرو۔ میں خود ہی لکھوں گا۔ محسن سلّمۂ کا خط بھی سکھر سے واپس ہوکر یہاں مل گیا۔ شکریہ۔ جواب میں صرف خیریت لکھا کریں۔ اور بس۔

سید عطاء اللہ بخاری

سیکورٹی قیدی، سنٹرل جیل، لاہور

حواشی

❶ سکھر سنٹرل جیل سے لاہور سنٹرل جیل منتقلی کے بعد ابا جی کے کئی خطوط میرے نام آئے۔ یہ انہی میں سے ایک ہے، جو سپرنٹنڈنٹ جیل کے مہیا کردہ مطبوعہ سرکاری کاغذ پر تحریر تھا اور آخر میں سی آئی ڈی آفیسر کے مطالعہ وملاحظہ کے بعد تصدیقی دستخط اور مہر ثبت ہے۔ خط پر تاریخ درج نہیں۔ لفافے پر موصولی کی تاریخ درج کی جاتی تھی۔ مگر میرے پاس اصل خط ہے، نہ لفافہ۔ خط کا عکس ہے جو بھائی جان کے کاغذات سے مہیا ہوا۔ اصل خط انہی کے پاس رہ گیا۔

❷ اس خط میں ۲۶ر جولائی ۱۹۵۳ء کے جس خط کا ذکر ہے، وہ میرے پاس نہیں۔ اندازہ ہے کہ یہ خط ۲۹، ۳۰ر جولائی کو تحریر فرمایا۔ شکر ہے کہ اس خط کی نقل میسر آ گئی۔ یہ دونوں خطوط بھائی جان مرحوم کے بہت سے مسودات کی طرح انہی کے ہاں سے گم ہوگئے۔

ایک خط

اہلیہ کے نام

(۱۵)

۱۷/ اکتوبر ۱۹۵۳ء

سید عطاء اللہ بخاری

والدہ سید عطاء المحسن بخاری! السّلام علیکم

بٹیا جی سلّمہا اللہ تعالیٰ کی مسلسل علالت کی خبریں پڑھتا اور زبانی سنتا رہتا ہوں۔ کل وکیل شاہ صاحب ملاقات کو آئے، ان سے معلوم ہوا کہ معدہ پر ورم وغیرہ کی شکایت ہے اور تمہارا ارادہ لاہور لانے کا ہے۔ کیا اس غریب میں اتنی طاقت ہے کہ وہ لاہور تک سفر کر سکے؟ اور پھر اتنی کمزوری میں اپنا گھر چھوڑ کر دوسری جگہ وہ آرام اسے مل سکے گا۔ اگر محض علاج ہی کے لیے لانا ہے تو پھر وہاں بھی ڈاکٹر خان صاحب ❶ موجود ہیں اور فن کے لحاظ سے بہت بڑے آدمی ہیں۔ انہیں کیوں نہ دکھایا جائے۔ ان سے تو پھر بھی علیک سلیک ہے اور یہاں سب اجنبی۔ مولوی محمد شریف ❷ نے اپنے گھر کا بالکل ایسا ہی حال سنایا کہ زندگی سے مایوسی ہوگئی تھی اور پانچ ماہ تک بالکل کوئی چیز ہضم نہ ہوتی تھی۔ پھر اللہ نے فضل کر دیا اور آہستہ آہستہ امرود اور انگور ہضم ہونے لگ گئے۔ دوران علالت میں چہرہ پر بھی سیاہی پڑ گئی تھی۔ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ لیکن سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔ بٹیا سلّمہا اللہ تعالیٰ نے میرے پیرول کی درخواست کا ذکر کیا ہے۔ ❸ ان کی خاطر مخالفت نہیں کرتا۔ لیکن سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اگر تم لوگوں کو اس میں کوئی فائدہ نظر آتا ہے اور کسی قسم کی کسی سے امید ہے تو درخواست دے دو۔ بہر حال میں مخالف نہیں۔ محسن سلّمہٗ کا خط مل گیا تھا۔ میں نے جواب میں غفلت کی ہے، جس کا افسوس ہے لیکن میں خط سے مطمئن ہوگیا

ہوں اور راضی ہوں۔دوسرا خط پھر لکھوں گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بٹیا نے میری جدائی کو بہت محسوس کیا ہے۔ میں ایک فقرہ جو سکھر جیل میں ملاقات پر انھوں نے مجھے کہا تھا۔ان کو یاد دلاتا ہوں کہ ''ابا جی !میں آپ کی رہائی کے لیے تو دعا نہیں کر سکتی۔'' جس دلیر بیٹی نے باپ کو یہ سہارا دیا وہ اب اِدھر اُدھر کی باتیں سن کر اپنے دل و دماغ کو پریشان کیوں ہونے دے۔میرے متعلّق بے فکر رہے۔اللہ تعالیٰ اور رسول علیہ السّلام کی رضا چاہیے۔میری ظاہری ،باطنی صحت یعنی جسمانی و روحانی کیفیت بفضلہٖ وبحمدہٖ اچھی ہے۔تم بھی خوش رہو اور مطمئن رہو۔محسن ،مؤمن ،مہیمن سلمہم اللہ تعالیٰ کو دعائیں۔م ح اور ن ج [۲] کو دعائیں اور سلام، دیگر پرسان حال کو جواباً سلام مسنون ۔خط کا جواب مفصّل لکھو اور فوراً لکھو۔

والسّلام

سید عطاء اللہ بخاری

سنٹرل جیل، لاہور

حواشی

[۱] ڈاکٹر عون محمد خان صاحب، جون پور (ہندوستان) کے مہاجر تھے۔ابا جی سے غائبانہ تعارف تھا۔سال یاد نہیں، اُن کے بھائی ہندوستان سے انہیں ملنے آئے اور ابا جی کے قیام ملتان کا سن کر گھر پر ملنے آئے۔وہ پرانے شناسا نکلے اور متعدد جلسوں کے سامع۔ابا جی نے پھر ان کی بمع ڈاکٹر صاحب دعوت کی۔آخری بیماری میں ڈاکٹر صاحب ابا جی کو دیکھنے آئے تو کہا'' شاہ صاحب خدا نے آپ کو سو سال تک نہ گھلنے والا جسم دیا تھا، جسے آپ نے پچاس سال میں ختم کر دیا۔''

[۲] مولوی محمد شریف مرحوم، مجلس احرار اسلام کے کارکن تھے بعد میں مجلس تحفّظ ختم نبوت میں مبلغ رہے۔

ہم بہن بھائی شعبان کی آخری تاریخ ابا جی سے سکھر مل کر آئے۔رمضان المبارک گزرا تو میں بھائی جان سے ملنے واربرٹن گئی جہاں وہ ہم سب کے مشورے سے ہی روپوشی کا وقت گزار رہے تھے۔واپس آنے کے چند دن بعد بیمار پڑ گئی اور پورے چھ ماہ پلنگ پر گزرے۔تفصیل کیا لکھوں؟ کئی گھنٹے تو نبض بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔میرے ماموں جان، خالہ جی، ممانی جی (مرحومین) سب پہنچے ہوئے تھے۔ایسی حالت میں ماموں جی ڈاکٹر نور محمد سول سرجن سول ہسپتال کو لے آئے۔انھوں نے ٹیکہ لکھ دیا۔لگانے کے لیے ماموں جی کسی ایم۔بی۔بی۔ایس ڈاکٹر کی تلاش میں نکلے اور ڈاکٹر مشتاق احمد خان افشار مرحوم کو لے آئے۔انھوں نے آ کر نبض اور حالت دیکھی تو کہا کہ یہ تو مردے کو ٹیکہ لگانے والی بات ہے۔میں تو اتنے کمزور مریض کو اتنا طاقتور ٹیکہ نہیں لگاتا۔ان سے کہا گیا' آپ علاج شروع کریں۔ان کے علاج سے تین دن بیہوشی کے بعد مجھے ہوش آیا۔ملتان کے جن معالجین نے علاج کیا' اُن کے نام یہ ہیں: حضرت حکیم عطاء اللہ خان صاحب مرحوم، جناب حکیم محمد حنیف اللہ مرحوم، حکیم محمد رمضان مرحوم (تلمیذ حکیم عطاء اللہ خان)، ڈاکٹر نور محمد مرحوم ٹبی شیر خان، ڈاکٹر نور محمد سول سرجن اور آخر میں ڈاکٹر مشتاق صاحب۔حکیم عطاء اللہ خان صاحب مرحوم اور خان مظہر نواز خان کے پرزور اصرار پر اماں جی پیرول پر رہائی کی درخواست دینے پر آمادہ ہوگئیں۔کئی ماہ بعد جب میں اتنی روبصحت ہوگئی کہ لاٹھی یا کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلنے لگی تو ایک دن پولیس والے ایک لیڈی ڈاکٹر کو لائے کہ آپ کا ''سرکاری علاج'' کیا جائے گا۔تب تو حالت ایسی تھی ہی نہیں کہ رہائی کی درخواست کی جاتی۔ظاہر ہے' اس نے جا کر یہی رپورٹ دی ہوگی کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔کوئی صاحب ابا جی سے مل کر آئے اور یہ پیغام دے گئے کہ آخر عمر میں مجھے ذلیل نہ کرو۔میں تب خط لکھنے کے قابل ہوگئی تھی۔میں نے خط میں معافی مانگی کہ میری وجہ سے آپ کو اذیت پہنچی۔انہیں معالجین کے مشورے اور تفصیل بتائی تو وہ مطمئن ہوگئے۔میں نے انہیں لکھا تھا کہ یقیناً آپ کے وقار کا تقاضا یہی تھا کہ میں موت قبول کر لیتی مگر حکومت سے کوئی درخواست نہ کرتی۔

خاندان کی دو خواتین کے نام مرموز طریقے سے لکھے گئے ہیں۔وہ ان دنوں ہمارے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔

رہائی سے پہلے

لاہور جیل سے آخری خط

۱۲

Signature of ordering officer	Date	Name of service

ON PAKISTAN STATE SERVICE — 673 — P.S.E.4.

ملتان شہر

(۱۶)

بٹیا جی !وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ وبر کاتہ ❶

میں آپ لوگوں سے معافی مانگتا ہوں کہ میری غفلت کی وجہ کر آپ سبھوں کو تکلیف پہنچی۔خدا جانے کیوں میرے ہاتھ رک گئے ۔کچھ تو رہا ہونے والوں کی وجہ سے کہ ان کی زبانی خیریت معلوم ہوہی جائے گی اور کچھ کیا‘ بس کچھ بھی نہیں۔اپنی ہی تقصیر اور کچھ نہیں۔اللہ تعالیٰ معافی دیں ۔❷ ہاں تو میری صحت اچھی ہے اور بالکل اچھی ہے۔ جو خبر آپ کو ملی ہے‘ وہ ابھی تک ہمیں نہیں ملی۔واللہ اَعلم آپ کو کہاں سے ملی ہے؟ یوں تو قعاتِ خیر تو ان حضرات سے کبھی نہ تھے ، نہ ہیں۔باقی یَفعَلُ الله مَایَشاء ساری کائنات سے کٹ کر صرف اسی ایک ذات سے عقیدتاً جڑا ہوا ہوں اور بس۔ان شاء اللہ تعالیٰ آپ لوگ بھی اسی رنگ میں رہیں تو بہتر ہے۔’’ہیبیس کارپس‘‘ چار دوستوں کی طرف سے تو کی جا چکی ہے۔ آپ کو علم ہے۔اب مجھے اور ماسٹر جی ❸ کو بھی دوستوں نے یہی مشورہ دیا کہ الگ نہ رہو۔چنانچہ دو چار دن میں ہماری طرف سے بھی حبس بے جا کی درخواست گزاردی جائے گی ۔اپنی صحت کا حال لکھواور اپنی امی جان کو سلام کہو۔دعا تو وہ کرتی ہی رہتی ہوں گی۔سائیں اللہ رکھا ❹ اور وکیل صاحب،محسن میاں ،مؤمن میاں ،مہیمن پیر سلمہم اللہ تعالیٰ کو دعائیں اور سلام۔دیگر پرسان حال کو بھی علیٰ قدر مراتب سلام۔

والدعاء

سید عطاء اللہ بخاری

سید عطاء اللہ بخاری

سنٹرل جیل لاہور

دستخط سنسر آفیسر

پتا: ملتان شہر‘ محلّہ ٹبی شیر خان‘ مکان نمبر ۲۳۲‘ حافظ سید وکیل احمد شاہ صاحب

(پتا‘ ابا جی کے ہاتھ سے نہیں کسی اور کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔)

موصولہ: ۲۳ جمادی الاوّل ۱۳۷۳ھ/ ۲۹ /جنوری ۱۹۵۴ء

حواشی

❶ لاہور سنٹرل جیل سے لکھے گئے خطوط میں یہ آخری خط میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ بھی جیل کے مطبوعہ فارم پر تحریر کیا گیا۔ آخر میں جیل افسر کے تصدیقی دستخط ثبت ہیں۔ خط پر تاریخ درج نہیں البتہ لفافے پر وصولی کی تاریخ ۲۹؍جنوری ۱۹۵۴ء درج ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ خط ۲۷؍جنوری ۱۹۵۴ء کو تحریر کیا گیا۔

جب منیر انکوائری کمیشن مقرر ہوا تو ۲۵؍جولائی ۱۹۵۳ء کو ابا جی کو سکھر سنٹرل جیل سے لاہور سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ محمود علی قصوری مرحوم (بارایٹ لاء) نے تحریک کے رہنماؤں کی نظر بندی کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں رِٹ دائر کی جسے منظور کرتے ہوئے جسٹس ایس اے رحمان نے ۸؍فروری ۱۹۵۴ء کو ابا جی اور اُن کے رفقاء مولانا ابوالحسنات، ماسٹر تاج الدین انصاری وغیرہ رہا کر دیئے۔

❷ کوئی نہ کوئی اوٹ پٹانگ خبران کے بارے میں اڑائی جاتی...... بیمار ہیں، شدید بیمار ہیں، پھر پریشانی ہوتی۔ اصل صورت حال سے ہم بے خبر تھے۔ اسی کے متعلق لکھا ہے کہ میں خط نہیں لکھ سکا۔

❸ محترم ماسٹر تاج الدین انصاری رحمہ اللہ، تب صدر مجلس احرار اسلام پاکستان

❹ میرے مرحوم و مغفور بھائی جان (نور اللہ مرقدہٗ) کا خفیہ نام ''سائیں اللہ رکھا'' جو ان دنوں روپوش تھے۔ ابا جی کی رہائی کی خبر پا کر لاہور پہنچے اور ان کے ساتھ ہی گھر واپس آئے تھے۔

رہائی کے بعد

قیامِ لاہور (بسلسلہ علاج)

کے زمانے کے خطوط، ۱۹۵۶ء

(۱۷)

لاہور

۳۰/اگست ۱۹۵۶ء [۱]

بٹیا جی! سلمک اللہ تعالیٰ

تمہارا اور مہیمن سلّمہ ربّہٗ کا دونوں خط مل گئے۔ خیریت معلوم ہوئی۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ مولوی خلیل اللہ [۲] ملتان، حافظ جی سلّمہٗ [۳] سے مل کر آئے تھے۔ حافظ جی نے انہیں کہا تھا کہ اماں جی کو افاقہ ہے۔ مگر تمہارے خط میں یہ بات نہ تھی۔ میں یہاں علاج تو کرا رہا ہوں۔ مگر دل میرا تم لوگوں کے لیے بے چین رہتا ہے۔ خصوصاً تمہاری امی جان کو جس حالت میں چھوڑ کر آیا تھا۔ اس کا تصور مجھے تکلیف دیتا ہے۔ [۴] تم نے لکھا ہے کہ دوا کھا رہی ہیں۔ کیا حکیم صاحب سے مشورہ کرلیا اور انھوں نے بھی اجازت دے دی ہے۔ مجھے ان کی حالت مفصّل لکھو اور اگر دوا سے دل کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے تو پھر نہ کھائیں۔ بہرحال چھوٹے [۵] اور بڑے حکیم صاحب [۶] سے مشورہ ضرور کرلیں۔ اور غذا میں بہت احتیاط کریں۔ آج قاضی صاحب [۷] ملے اور مولانا محمد علی صاحب [۸] کا خط لائے۔ اس میں پیر جی کی خیریت اور محسن سلمہٗ کا مؤمن سلّمہٗ ربّہٗ کے ساتھ جانے کا ذکر ہے۔ میں پانچوں نمازوں میں تم لوگوں کے لیے دست بہ دُعاء رہتا ہوں۔ میری مختصر حالت یہ ہے کہ پہلے تو ڈاکٹری علاج کراتا رہا۔ حکیم صاحب [۹] دہلی تشریف لے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب [۱۰] نے انسولین کے ٹیکے کا حکم دیا۔ کوئی پندرہ ٹیکے کیے۔ اس سے مرض میں افاقہ تو ہوا مگر بٹیا جی وہ کوئی مستقل علاج نہیں ہے۔ ٹیکے عارضی علاج ہیں۔ آج پانچواں دن ہے۔ حکیم نبی خان صاحب کی دوا کھا رہا ہوں۔ خاص توجہ اور مہربانی سے علاج کررہے ہیں۔ مگر برسوں کی بیماری دنوں میں تو نہیں جاتی۔ اختلاج تو بالکل دور ہوگیا ہے اور روپے (میں سے) چار آنہ قوت بھی محسوس ہوتی ہے۔ امید

ہے کہ اللہ تعالیٰ فضل کریں گے۔ غذا میں صرف شوربہ، ایک پھلکا اور کچھ گوشت ہے۔ باقی صبح کو چائے، ایک دو ٹوسٹ، دو ایک انڈے بس! یعنی بڑا پرہیزگار ہو گیا ہوں۔ کوئی نئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ دعا سے دریغ نہ کرنا۔ وکیل شاہ صاحب نے آج تک مجھے خط نہیں لکھا۔ مؤمن نے کہا تھا گھر گئے ہوئے ہیں، ان کی قمیص جو گم ہوئی تھی وہ ملی یا نہیں۔ میں وہمی سا ہو گیا ہوں۔ طرح طرح کے خیالات دامن گیر رہتے ہیں۔ مجھے سارا حال لکھوا اور اپنی امی جان کی صحت کے متعلق پوری کیفیت لکھو۔ تا کہ مجھے اطمینان ہو۔ باقی میری بانو جی [11] کو میرا پیار کرو۔ اللہ اس کو صحت بخشیں، اس کی خیریت بھی لکھو۔ یہ خط میں قاضی صاحب کے ہاتھ بھیج رہا ہوں، صبح تمہیں مل جائے گا۔ کل ہی جواب لکھو اور حافظ [12] السّلام علیکم، کیا آپ سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا، ایک پوسٹ کارڈ ہی دوسرے تیسرے روز لکھ دیا کریں۔ آپ کی اس غفلت سے مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ دوسرے روز ایک کارڈ لکھ دیا کریں، ضرور تاکید ہے۔ حافظ نذیر حسین [13] کا حال لکھیں۔ ان کو میرا سلام کہیں۔ بڑے حافظ صاحب [14]، عبدالکریم، حافظ نبی بخش اور شاہ صاحب اور سب نمازیوں کو سلام کہیں اور دعا کی درخواست کریں۔ بھائی امیر بخش [15] کا خط آیا ہوا ہے۔ جواب میں دیر ہو رہی ہے۔ مجھے ندامت ہے۔ ان شاء اللہ ان کو بھی جواب دوں گا۔ حکیم جی [16] کو السّلام علیکم۔ مولوی یٰسین صاحب [17] اور بھائی سلیم اللہ [18] اور میرے "کلیم" [19] کو اور سب کو سلام و دعاء۔

پمپ کے نیچے کسی راج کو بلوا کر سیمنٹ ضرور لگوا دو۔ مجھے بار بار خیال آتا ہے۔ ہاں مہیمن کے خط میں کریم بخش کی بیماری کا ذکر تھا۔ اس کا حال ضرور لکھو کیا حال ہے اور کس کا علاج؟ وسّو اور عظیم بی بی اور لال خان (کو) [20] السّلام علیکم اور دعائیں۔ خط کا جواب کل ہی لکھو۔ تاکید ہے۔ پیر جی کو بھی خط لکھوں گا۔ بس ہوش سے رہو اور محنت سے پڑھو۔ کوئی بیہودہ بات اگر سنی تو میری صحت مشکل ہے۔ مجھے تم ہی خوش رکھو تو ان شاء اللہ تندرست ہو جاؤں گا۔ سب بچوں کو دعائیں۔ بڑی وسّو کو دعائیں اور سلام، غلام حسین [21] اور احمد یار [22] کو سلام پہنچا دینا۔ قاضی صاحب آٹھ بجے کی گاڑی سے جا رہے ہیں، ان کو خط پہنچانا ہے۔ اس لیے دعا پر بس کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائیں۔

والدعاء

سید عطاء اللہ بخاری

حواشی

❶ ابا جی شدید علالت کی وجہ سے لاہور تشریف لے گئے اور حاجی دین محمد صاحب مرحوم کے ہاں قیام کیا۔

❷ تحریک تحفّظ ختم نبوت ۱۹۵۳ء کی پاداش میں مجلس احرار اسلام خلافِ قانون قرار دے دی گئی۔ چنانچہ احرار کے شعبۂ تبلیغ تحفّظ ختم نبوت کو دسمبر ۱۹۵۴ء میں مجلس تحفّظ ختم نبوت کا نام دے دیا گیا۔ ابا جی اس کے پہلے امیر اور مولانا محمد علی ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ مجلس کے زیر اہتمام دارالمبلغین قائم کیا گیا۔ جس میں فاتح قادیان مولانا محمد حیات اور دیگر علماء ردّ قادیانیت پر منتخب نصاب پڑھاتے اور مبلّغین تیار کرتے۔ مولوی خلیل اللہ بھی اُنہی مبلّغین میں سے ایک تھے۔

❸ بھائی جان سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ۔ ابا جی انہیں ''حافظ جی'' کہتے اور لکھتے۔

❹ اماں جی کو تب عِرق النساء کی تکلیف تھی، چلا نہیں جاتا تھا۔

❺❻ جناب حافظ حکیم محمد حنیف اللہ مرحوم اور اُن کے والد جناب حکیم عطاء اللہ خان مرحوم

❼ قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم ومغفور

❽ مولانا محمد علی جالندھری مرحوم ومغفور

❾ حکیم نبی احمد صاحب جمال سویدا مرحوم

❿ کرنل ڈاکٹر ضیاء اللہ صاحب

⓫ میری بڑی بیٹی

⓬ بھائی جان رحمتہ اللہ علیہ

⓭ حافظ نذیر حسین مرحوم، ہمارے ہمسائے اور محلّہ کی مسجد بی بی عائشہؓ کے منتظم

⓮ حافظ عبدالغفار صاحب مرحوم، امام مسجد عائشہ جو حافظ نذیر صاحب مرحوم کے چچا تھے اور دیگر مسجد کے نمازی حضرات۔

⓯ امیر بخش صاحب مرحوم (قلعی گر) محلّہ دار تھے۔ احرار کے ورکر بھی تھے۔ اور تقریبات پر دیگیں بھی

وہی پکاتے تھے۔ روزانہ صبح ابا جی کومل کر دکان پر جاتے۔

۱۶ حکیم محمد حنیف اللہ صاحب مرحوم

۱۷ آج کل مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے نائب مہتمم ہیں۔

۱۸ سلیم اللہ صاحب مرحوم، مالک سلیمی دواخانہ (حکیم عطاء اللہ خان مرحوم کے بڑے فرزند)

۱۹ سلیم اللہ صاحب مرحوم کے بیٹے (پرویز)۔ پرویز نام ابا جی کو اس لیے ناپسند تھا کہ ایران کے بدبخت بادشاہ ''پرویز'' نے نبی علیہ السّلام کا نامہ مبارک چاک کیا تھا اور توہین کی تھی۔ اسی لیے ابا جی اسے ہمیشہ ''کلیم'' کے نام سے پکارتے اس سے بہت انس تھا۔ اب وہ بھی انتقال کر گئے ہیں۔ سب سے مراد باقی ہمسائے اور گھر آنے والے بچے، اُن کے والدین۔

۲۰ محلّہ کی ایک بچی' جو اماں جی سے قرآن کریم پڑھتی اور اکثر ہمارے گھر ہی رہتی۔ اس کی والدہ اور والد۔ غریب لوگ تھے' میاں بیوی دونوں محنت مزدوری کر کے گھر چلاتے۔ کریم بخش' جس کی بیماری کا ذکر ہے' ان کا بیٹا تھا، ہمارے گھر ہی رہتا اور اماں جی سے قرآن پاک پڑھتا۔

۲۲ ۲۱ دائیں بائیں جانب کے ہمسائے تھے۔

معرفت

قصبہ عبدالحکیم ضلع ملتان

۲۷ ستمبر ۵۶ء عبدالحکیم

(۱۸)

لاہور

۲۵/ستمبر ۱۹۵۶ء

ایم۔اے۔ایس۔اینڈ کمپنی، حبیب گنج بادامی باغ۔لاہور ❶

بٹیا جی! وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ

تمہارے دونوں خط مل گئے۔کہالت اور غفلت کی وجہ کر جواب میں تاخیر اور بہت تاخیر ہوئی۔جس کے لیے نادم ہوں۔الحمدللہ میں روبصحت ہوں۔دل کی تکلیف تو جاتی رہی اور یہی سب سے بڑا عذاب تھا۔باقی جسم میں قوت بحال ہورہی ہے مگر پاؤں ابھی تک درست نہیں ہوئے۔فی الجملہ اچھا ہوں اور ان شاءاللہ تعالیٰ ہفتہ عشرہ تک ملتان آؤں گا۔وکیل احمد شاہ صاحب نے مجھے لکھا تھا، میرے متعلّق جو حکم ہو لکھیے۔میرا خیال یہ ہوا کہ اگر بی ٹی میں داخلہ کا وقت باقی ہو تو ان کو لاہور داخل کرادوں۔مگر افسوس کہ داخلہ کا وقت گزر گیا۔اب تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جگہ مل جائے وہاں بیٹھ جائیں، بعد میں جو اللہ تعالیٰ کو منظور۔اب میری رائے یہی ہے جو میں نے لکھ دی ہے۔باقی جو وہ خود مناسب سمجھیں، اس پر عمل کریں۔صبیحہ بانو ❷ کے پھوڑے پھنسیاں ختم ہو گئے، الحمدللہ۔ہاں وہ تمہاری موجودگی میں مائی نے جو سیّدوں کے گھر کی بات کی تھی وہ کچھ آگے بڑھی ہے۔میں نے بہن ❸ کو بھیجا وہ تو مطمئن واپس آئیں۔کل وہ سیّد صاحب خود بھی مجھے ملنے آ گئے۔کچھ مختصر سی باتیں ہوئیں۔باقی ملتان سے واپسی پر ملتوی رکھی ہیں۔شاید تمہیں ایک دفعہ پھر لاہور آنا پڑے۔دعا کرو۔اللہ تعالیٰ کوئی اچھی صورت بنا دیں۔محسن سلمہ کا خط بھی آیا تھا۔تمہاری اماں جی کی صحت خراب ہے۔اس چیز نے مجھے متفکّر کر رکھا ہے۔اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں۔حافظ جی ❹ کا خط بھی آیا تھا۔ابھی تک جواب کسی کو نہیں لکھ سکا ہوں۔آپ کے چچا صاحب ❺ تشریف لائے یا نہیں؟ آ گئے ہوں تو میرا اسلام مسنون کہہ دیں۔بانو جی سلّمہا کو میری

طرف سے پیار کرو اور سب بچوں کو دعائیں۔ دونوں بہنوں ❻ کو میرا اسلام اور دعائیں کہو۔ اپنی چچیوں ❼ کو بھی میرا اسلام اور دعائیں پہنچا دو۔ باقی خیریت ہے۔

والدعاء

سید عطاء اللہ بخاری

پتا: معرفت اللہ یار جنرل سٹور، سید وکیل احمد شاہ بخاری سلمہ اللہ تعالیٰ کو مل کر بٹیا جی سلّمہا کو ملے۔ عبدالحکیم ضلع ملتان (اب ضلع خانیوال ہے)

موصولہ: ۲۷ ستمبر ۱۹۵۶ء

....

حواشی

❶ حاجی دین محمد مرحوم، ابا جی کے امرتسر کے قیام کے زمانے کے گہرے دوست تھے۔ ابا جی انہیں بھائی کہتے تھے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمتہ اللہ علیہ کے چہیتے مریدوں میں سے تھے۔ اُن کا لوہے کی ڈھلائی کا کارخانہ تھا اور برف کا بھی۔ اسی میں اُن کا گھر تھا۔ ابا جی علاج کے لیے لاہور تشریف لے گئے تو انہی کے ہاں قیام کیا۔ حاجی صاحب نے بہت خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزاء خیر عطاء فرمائے اور اُن کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

❷ میری پہلی بچی کا نام ''صبیحہ'' رکھا گیا۔ والدہ ماجدہ کہنے لگیں، جنگ بلقان کے دوران پڑھا تھا، کمال اتاترک کی منہ بولی بیٹی کا نام تھا، مجھے اچھا لگتا ہے۔ لیکن جب ابا جی کو پتہ چلا کہ یہی نام ایک ایکٹریس کا ہے تو فوراً بدل کر فاطمہ کر دیا۔

❸ حاجی دین محمد صاحب مرحوم کی اہلیہ مرحومہ۔ ابا جی انہیں بہن کہتے۔ مرحومہ کو ایک سیّد خاندان میں رشتہ دیکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ بھائی جان کے عقد کے سلسلے میں بات چلی تھی مگر پھر ختم ہوگئی۔

❹ بھائی جان مرحوم و مغفور

❺ میرے سسر جناب سید محمد شفیع شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ، میں ان کو چچا کہتی تھی۔

❻ میری نندیں

❼ میری دونوں خوش دامنیں

(۱۹)

ملتان

۶؍ جولائی ۱۹۵۷ء

بٹیا جی! السّلام علیکم ورحمتہ اللہ ❶

میرا حال تمہیں معلوم ہے۔ آج کل کرتے کرتے جواب میں تاخیر ہوگئی۔ جس کی وجہ سے اپنے پر غصہ اور بہت غصہ آیا۔ اللہ یار ❷ کی معرفت جوتی کا جوڑا بھیجا تھا۔ انتظار میں رہا کہ تمہارا خط آئے تو پتہ لگے کہ پاؤں میں ٹھیک آیا کہ نہیں۔ اب طبیعت پریشان ہوئی تو یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ وکیل شاہ جی سلّمہٗ کو نزلہ ہوگیا۔ ان کا ارادہ کل جانے کا ہے۔ مگر میرا دل نہیں چاہتا۔ تم خط دیکھتے ہی اپنی اور بانے جی ❸ اور سب کی خیریت سے فوراً مطلع کرو۔ اس وقت تک یہاں سب لوگ خیریت سے ہیں۔ تمہاری اماں جی، بانے کی خیریت کے لیے کچھ بے تاب سی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو خیریت سے رکھے۔ دو تین دن سے گرمی تیز ہوگئی۔ وہاں کا حال لکھو۔ گھر میں سب کی طرف سے سب کو درجہ بدرجہ سلام و دعا کہو۔ برادرم شاہ صاحب ❹ کی خدمت میں بھی سب کا سلام مسنون۔ بانے جی کو دعائیں اور دیدہ بوسی۔ خصوصاً نانی جی کی طرف سے بہت بہت پیار اور دعائیں۔ جواب جلد لکھو اور مجھے معافی دو۔

والدعاء

سید عطاء اللہ بخاری

پتا: معرفت اللہ یار جنرل سٹور، بگرامی خدمت جناب سید محمد شفیع شاہ سلمہ اللہ تعالیٰ

موصولہ: ۸؍ جولائی ۱۹۵۷ء

حواشی

❶ میں اُن دنوں عبدالحکیم...... اپنے سسرال گئی ہوئی تھی۔ وہیں یہ خط موصول ہوا۔

❷ عبدالحکیم کا ایک دکاندار

❸ میری بڑی بچی کو پیار سے کہتے تھے۔

❹ چچا سید محمد شفیع شاہ رحمہ اللہ

(۲۰)

لاہور

۲۵/اگست ۱۹۵۷ء

بٹیا جی! السّلام علیکم ورحمتہ اللہ!

مومن میاں پہنچ گئے۔ سب کی خیریت معلوم ہوگئی۔ آج ان کو واپس کررہا ہوں۔ بانے جی کے لیے بسکٹ نمکین بھیج رہا ہوں۔ ان کو میرا سلام کہو۔ آپ کی اماں کے لیے جناب حاجی صاحب ❶ نے روغن بلسان کیپسول میں بھردیا ہے۔ ان کا تجربہ ہے کہ اس قسم کے دردوں کے لیے بہت مفید ہے۔ ایک کیپسول صبح کے وقت پہلے ایک گھونٹ پانی سے کھالیں اور بعد میں چائے پی لیں۔ یہ نقصان کی چیز نہیں اور یہ خالص ہے۔ حاجی صاحب مکہ معظّمہ سے خود خرید کر لائے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ پہلی خوراک ہی میں فائدہ محسوس ہوگا۔ ان کی تکلیف سے میری طبیعت یہاں پریشان ہے۔ جی چاہے تو حکیم جی ❷ سے بھی مشورہ کرلیں۔ بہرحال یہ دوا کھائیں ضرور۔ میری حالت اچھی ہے، مرض میں فرق ہے۔ ناتوانی میں بھی کچھ فرق ہے۔

باقی دعا کرو، اللہ تعالیٰ تمام مشکلیں آسان فرمائیں۔ میرا دل تم لوگوں کو دیکھنے کے لیے بےچین ہے۔ مگر دوستوں کا اصرار ہے کہ ابھی علاج کے لیے اور ٹھہروں۔ کل حکیم صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ آج تک تو ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ صاحب کا علاج ہورہا ہے۔

اب حکیم صاحب ❸ نے نسخہ لکھا ہے۔ وہ مستقل علاج کرنا چاہتے ہیں۔ ہاں اپنی اماں جی سے کہہ دو کہ دوا، ایک ایک دن ناغہ کرکے کھائیں۔ باقی اب وقت نہیں ہے۔ مومن گاڑی پر جارہا ہے اور ساڑھے آٹھ ہوچکے ہیں۔ دوسرا خط پھر لکھوں گا۔ ننھّی جی کو پیار کرو، میرا پیار اور سب کو درجہ بدرجہ سلام ودعا۔

والدعاء

سید عطاء اللہ بخاری

حواشی

❶ حاجی دین محمد صاحب مرحوم' ابا جی کے میزبان

❷ حکیم محمد حنیف اللہ صاحب مرحوم

❸ حکیم نبی احمد سویدا مرحوم۔ حکیم اجمل خان کے پوتے اور حکیم جمیل خان کے بیٹے۔ دواخانہ حکیم اجمل خان کے مالک۔ موصوف شاعر بھی تھے۔ ''جمال'' اور ''سویدا'' اُن کا تخلّص تھا۔

محلہ حکیم اشرف خان ملتان

ملتان شہر

۱۸

(۲۱)

ایم اے ایس اینڈ کمپنی، حبیب گنج

بادامی باغ۔ لاہور

بٹیا جی! السّلام علیکم، دعوٰۃ بیغایات ❶

تمہارے خط پہنچنے سے تین چار روز پہلے سحر کے وقت کوئی شخص مجھے خواب میں خط پڑھ کر سنا رہا تھا، کہ عزیزہ بیمار ہے اور بخار ہے۔ میری آنکھ کھلی تو طبیعت پریشان سی ہوئی۔ میرا خیال بانو جی سلّمہا اللہ تعالیٰ کی طرف گیا۔ چنانچہ میں نے جو رقعہ دستی اکاڑہ کے ایک عزیز کے ہاتھ بھیجا، جس کا جواب حافظ جی سلّمہٗ اللہ نے ماشاءاللہ ابھی تک نہیں دیا۔ اس میں بانو کی طرف اشارہ بھی کیا۔ اب تمہارے خط سے تمہاری علالت کی خبر معلوم ہوئی۔ خیر الحمدللہ کہ بلا ٹلی۔ تم نے بڑے لطف کی بات لکھی۔ اگرچہ وہ حقیقت نہیں۔ بٹیا، کسی کی چوکیاں میرے تصور کو کس طرح پورا کرسکتی ہیں۔ مگر میں نے کئی دفعہ پڑھا اور ہنسا۔ میں اپنا حال کیا لکھوں۔ ایک دن بھی تم لوگوں سے جدا ہونا اب گوارا نہیں لیکن مجبوری اور پھر معذوری۔ جو کام ہے وہ کسی سے کرانا پڑتا ہے۔ خود عاجز بھی ہوں اور دنیاوی کاموں سے ناواقف بھی۔ کراچی کا کام، جو حافظ جی نے ایک سرکاری خط مجھے بھیجا تھا وہ بھی کسی کے سپرد کرنا پڑا۔ اس کے لیے بھی مختارنامہ دینا پڑا اور وہ بھی کچہری جا کر تصدیق کرنی پڑی۔ یہاں لاہور میں ایک کام تھا وہ بھی اسی قسم کا تھا، وہ بھی کسی سے لینا پڑا۔ گجرات والی زمین کا قصہ ❷ بھی پہلے لاہور میں ختم کرانا چاہا۔ خریدار کو بلایا مگر اس میں قانونی الجھنیں زیادہ تھیں۔ اس کے لیے بھی مختارنامہ رجسٹری کرانا پڑا۔ چنانچہ جس وقت کار میں بیٹھ کر کچہری جانے لگا تو تمہارا خط ملا۔ وہ میں نے راستہ میں پڑھا۔ خیر کسی کے ذریعہ وہ کام بھی ہوگیا۔ لیکن کاغذات لینے ایک آدمی

گئے ہوئے ہیں' خدا کرے آج مل جائیں۔ وہ گجرات بھیجتے ہیں۔ ایک کام میں ہفتہ دو ہفتے لگ جاتے ہیں۔ اب علاج کا حال سنو۔ پہلے تو ٹیکے ہوتے رہے جن سے میں تنگ آ گیا اور وہ ایسا علاج تھا کہ جتنی زندگی ہے ٹیکے لگواتے جاؤ۔ ڈیڑھ نمبر پر آ کر بیماری رک گئی۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے ایک اور دوا دی جو حال ہی میں جرمنی سے اس کے لیے آئی ہے۔ اس لیے فرمانے لگے کہ چھ روز کے لیے ہسپتال داخل ہو جاؤ۔ میں تو شاید آمادہ ہو ہی جاتا' مرتا کیا نہ کرتا۔ لیکن احمد میاں سلّمہٗ ۳ نے کہا کہ آپ گھر ہی روز آ کر دیکھ لیا کریں۔ بات یہ تھی' دوا تیز تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ دل پر زیادہ اثر نہ کرے۔ لیکن بحمد للہ تین گولیاں میں نے ایک دن میں کھائیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہ ہوئی اور شکر ایک نمبر کم ہوگئی۔ اس دوا کا کورس ہے۔ مرض کم ہو تو دوا کم کرتے جاتے ہیں۔ دوسرے تیسرے روز قارورہ ٹیسٹ کرانا۔ پھر اطلاع دینا۔ یہ کام مجھ سے وہاں نہ ہوسکتا تھا۔ اس لیے اور ٹھہرنا پڑا۔ الحمدللہ آج دو ہفتے ہوئے شکر بالکل بند ہوگئی ہے اور دوا بھی کم کر دی گئی ہے۔ آواز کے معاملہ میں حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب دونوں ناکام ہیں۔ پاؤں میں کوئی فرق نہیں۔ علی حالہ ہیں۔ برسوں کی بیماری ہے آخر اس کے لیے وقت درکار ہے۔ شیخ صاحب ۴ کے متعلّق ایک کام تھا' وہ اللہ کا بندہ' انتخاب کے طریقہ کو کامیاب بنانے میں لگ گیا ہے۔ خیر اس معاملہ کے لیے میں رکتا بھی نہیں ہوں۔ دیکھی جائے گی' اللہ مالک ہے۔ کل عزیزی خلیل الرحمٰن ۵ دہلی سے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت اقدس مدظلّہ ۶ آ رہے ہیں۔ ایک یا دو روز لدھیانہ ٹھہریں گے۔ سعید الرحمٰن ۷ اور محمد احمد ۸ سلمہم اللہ کے پاس اور ۳۰ یا ۳۱ کو لاہور آ جائیں گے۔ بس یہاں پر طبیعت رک گئی ہے۔ جی یہی چاہتا ہے' زیارت کرلوں اور دعائیں لے لوں اور پھر بستر باندھوں۔ بٹیا جی میرا بستر تو کھلتا ہی نہ تھا۔ اب میری غفلتوں کی سزا مل رہی ہے کہ بستر کھلا پڑا ہے۔ یہ میں نے بہت مختصر الفاظ میں اپنا حال لکھا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ زبانی مفصّل سناؤں گا۔ کہو کیا رائے ہے؟ میں تو پچھلے سال بھی حضرت کی زیارت سے محروم رہا۔ اب جیسا کہو۔ آج ۲۷ ہے' آج صوفی عبدالحمید ۹ اور سلطان فونڈری سے غالباً مولوی اکرم ۱۰ کاریں لے کر سہارن پور روانہ ہوگئے ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ کی بات ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ اجازت مل جائے گی ۔ پھر خدا جانے کیا ہو، کیا نہ ہو۔ حضرت روز روز کہاں ملتے ہیں۔ حضرت سے حافظ جی اور اپنے متعلّق کچھ کہنا ہے ۔ دنیا میں ان کے سوا اور کون ہے؟ جس کے آگے دکھڑا بیان کروں۔ خدا تعالیٰ سے تو بھیک مانگتا رہتا ہوں لیکن میرے مانگنے اور ان کی دعا میں عرش وفرش کا فرق ہے۔ مجھے شک ہے کہ آپ کی اماں جی بھی کہیں میری والی بیماری میں مبتلا نہ ہوں ۔ یہاں آ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے ۔ شاید ہی کوئی گھر بچا ہوا ہو۔ تم حیران ہو گی کہ دو ہفتے کے اندر یہ دوا کراچی سے لے کر لاہور تک ختم ہو چکی ہے اور نہیں ملتی ۔ اتنی مانگ ہے' جس کی حد نہیں ۔ اور کیا لکھوں؟ وکیل احمد شاہ صاحب نے کوئی خط نہیں لکھا' وہ کہاں ہیں؟ سلام کہہ دو۔ محسن میاں ، حافظ جی اور پیر جی سلّمہم اللّٰہ تعالیٰ کو سلام و دعا اور سب بچے بچیوں کو سلام اور دعائیں ۔ اپنی اماں جی کو سلام مسنون کہہ دو۔ چھوٹی وسّو [11] بڑی وسّو [12] ، میاں کریم بخش اور اس کی اماں کو دعائیں اور سلام ۔ ہاں اپنی امی جی سے کہو' چاول بالکل ترک کر دیں۔ جس دن سے میں یہاں آیا ہوں 'ہاتھ لگایا ہو تو گناہ گار۔ ہاں دیکھتا روز ہوں۔ میٹھا بالکل چھوڑ دیا ہے ۔ چائے میں سکرین کی گولیاں ڈال کر منہ میٹھا کر لیتا ہوں۔ چار گولیوں سے ایک پیالی میٹھی ہو جاتی ہے ۔ اور نہ نفع نہ نقصان ۔ اگر سیدہ طیبہ [13] کو مل کر اطمینان کر لیں تو بہت ہی اچھا ہو۔ میرا غالب گمان یہی ہے۔ کیونکہ مجھے بھی درد عرِق النساء سکھر جیل سے شروع ہوا اور شکر بھی ۵ فیصدی آتی تھی ۔ خیر اللّٰہ کرے 'نہ ہو۔ مگر اطمینان کر لینا چاہیے' بانو کو گود میں لے کر میرے منہ سے پیار کرو اور کہو یہ نانا ابا کا پیار ہے اور تم خود اس سے پیار لو اور کہلواؤ کہ یہ ابّا جی کا پیار ہے۔

والسّلام

دعا گو ابا

سید عطاء اللّٰہ بخاری

پتا: بمطالعہ برخوردار حافظ سید عطاء المحسن بخاری وبانے جی سلّمہا اللّٰہ' در آید

محلّہ ٹبی شیر خان' مکان نمبر ۲۳۲' ملتان شہر

موصولہ: ۲۹ /اکتوبر ۱۹۵۷ء

حواشی

❶ اس خط پر تاریخ درج نہیں۔لفافے پر وصولی کی تاریخ ۲۹/اکتوبر ۱۹۵۷ء درج ہے۔اندازہ ہے کہ ۲۷/اکتوبر کوتحریر کیا۔

❷ گجرات کے زمانۂ قیام ۲۱۔۱۹۲۰ء میں کچھ زمین خریدی تھی۔وہ بے کار پڑی رہی۔پھر ۵۷ء میں ڈاکٹرعبدالقادر صاحب مرحوم‘صدرمجلس احراراسلام گجرات کے توسط سے فروخت کی۔

❸ حاجی محمداحمد صاحب ابن حاجی دین محمد صاحب مرحوم

❹ عمِ محترم شیخ حسام الدین صاحب نوراللہ مرقدہ‘

❺ مولانا خلیل الرحمٰن مرحوم،خلف اکبر رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمہ اللہ

❻ سیدنا ومرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ۔

❼❽ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کے دونوں چھوٹے صاحبزادے جودارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوکر حضرت شاہ عبدالقادررائے پوری رحمتہ اللہ علیہ کے حسب الحکم لدھیانہ میں مقیم ہوئے۔آبائی مسجد اوران کا مکان مشرقی پنجاب گورنمنٹ نے واگزار کردیئے تھے۔ان کے قیام سے علاقہ کے بچے کھچے مسلمانوں کو بہت نفع ہوا۔مسجد آباد ہوگئی۔

❾ صوفی عبدالحمید خان صاحب مرحوم ومغفور۔حضرت انہی کے ہاں قیام فرماتے۔ پنجاب کے وزیرخوراک بھی رہے۔کٹرمسلم لیگی تھے‘حضرت رائے پوری رحمہ اللہ سے ارادت تھی۔سینکڑوں مہمانوں کا خرچ برداشت کرتے۔

❿ مولوی محمداکرم مرحوم‘سلطان فونڈری کے مالک چار بھائیوں میں سے ایک‘ حضرت کے غایت درجہ عقیدت مند۔

⓫⓬ گھر میں پڑھنے والی بچی،ایک کام کاج کرنے والی مائی

⓭ ملتان کی معروف معالجہ‘طبیبہ آئی بیگم مرحومہ‘محلّہ قدیر آباد میں مطب کرتی تھیں۔طبیہ کالج دہلی کی پڑھی ہوئی تھیں۔اصلاً جھنگ سے تعلّق تھا۔

منہ بولی بیٹی کے نام

(۲۲)

ملتان

۱۷ر دسمبر ۱۹۵۷ء

بیٹی جی ❶ ! وعلیکم السّلام ورحمتہ اللّٰہ

تمہارا پہلا خط بھی ملا اور اب دوسرا بھی تحفوں سمیت معرفت مولوی اللّٰہ بخش صاحب ملا۔ بیماری اور مرض نسیاں کی وجہ کر جواب نہ لکھ سکا۔ جس کے لیے نادم ہوں۔ اکتوبر کی ۱۶۔۱۷ کو انفلوئنزا صاحب تشریف لائے، مرے کو مارے شاہ مدار والا معاملہ بنا۔ پہلے ہی کمزور اور ضعیف تھا۔ رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ اب تو بہت ہی ناتواں ہوگیا۔ گھر کے قریب ہی مسجد ہے مگر وہاں تک جانا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ میرے لیے دعائیں کیا کرو کہ جتنے دن زندگی کے ہیں۔ تندرستی کے ساتھ گزر جائیں۔ بھتیجا مبارک ہو۔ سب کو نام بنام سلام اور دعائیں اور دیدہ بوسیاں۔ عزیزی خلیل شاہ صاحب کو السّلامُ علیکم۔

دعاگو

سید عطاء اللّٰہ بخاری

ملتان شہر۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۵۷ء

حواشی

۱ کوٹلہ رحم علی شاہ ضلع مظفرگڑھ کے پیر سید کرم علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مدرسہ امینیہ دہلی کے فارغ التحصیل تھے۔ یہ خط پیر صاحب کی اکلوتی بیٹی کے نام ہے جو ابا جی کو چچا جی کہتی تھیں، ابھی حیات ہیں۔ یہ خط انہی کا عطا کردہ ہے۔ خلیل احمد شاہ صاحب اکلوتے بیٹے تھے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

۲۴؍جولائی ۱۹۲۶ء کو احمد پور شرقیہ، ریاست بہاول پور کی ایک عدالت میں بسلسلہ تنسیخ نکاح مسلمہ و مرزائی ایک تاریخ ساز مقدمہ قائم ہوا۔ جو تحریکِ تحفّظ ختم نبوت کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقدمہ میں قادیانیوں کے چوٹی کے رہنما اپنے مرزائی کی مدد کے لیے فریق بنے تو محدث العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کاشمیری قدس سرہٗ اپنے مایہ ناز شاگردوں اور دیگر علماء کی معیت میں مسلمان خاتون کی مدد اور مقدمہ میں شہادت کے لیے بہاول پور پہنچے۔ راستے میں ملتان چھاؤنی ریلوے اسٹیشن پر مجلس احرار اسلام کے ہزاروں کارکنوں نے ابا جی کے حکم پر آپ کا استقبال کیا اور دعائیں لیں۔ ۷؍فروری ۱۹۳۵ء کو جناب محمد اکبر خان (ڈسٹرکٹ جج بہاول پور) نے مرزائیوں کو مرتد اور غیر مسلم قرار دیتے ہوئے مسلمان خاتون کے حق میں تاریخی فیصلہ دیا اور نکاح فسخ کر دیا۔ حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ جب مقدمہ کی مصروفیات سے فارغ ہوئے تو پیر سید کرم علی شاہ صاحبؒ نے موقع غنیمت جانا اور حضرت شاہ صاحب کو اپنے گھر لے گئے۔

ابا جی حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے حکم دیا کہ یہاں تقریر کرو۔ حضرت شاہ صاحب کرسیٔ صدارت پر رونق افروز تھے۔ ابا جی فرماتے میں نے عرض کیا حضرت! میں آپ کے سامنے تقریر نہیں کر سکتا۔ حضرت نے فرمایا یہ میرا حکم ہے۔ دوبارہ عرض کی، پھر دعا فرمائیے۔ ارشاد ہوا: ہاں! دعا کروں گا۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ ابا جی کہتے:

''بس کھڑے ہو کر تقریر شروع کرنا تو یاد ہے۔ پھر میں کہاں تھا؟ مجھے نہیں معلوم۔ حضرت کرسی پر ٹیک لگائے سنتے رہے۔ اُن کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور اُن کی پوری توجہ مجھ پر

تھی۔ جب میں نے تقریر ختم کی تو فرمایا: ''جزاک اللّٰہ''۔ بس میرے پلّے تو یہی ''جزاک اللّٰہ'' ہے اور کچھ نہیں۔ اور اسی بے نفسی سے وہ مقربِ اولیاء اللّٰہ تھے۔

بھائی عطاء المحسن رحمتہ اللّٰہ علیہ نے ابا جی کی بعض مجالس کے ارشادات قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے یہ واقعہ ابا جی کی زبانی یوں رقم کیا ہے:

''کوٹلہ رحم علی شاہ (ضلع مظفرگڑھ) کے جلسے میں حضرت علامہ محمد انور شاہ قدس سرہٗ نے حکم فرمایا: تم تقریر کرو، میں نے عذرخواہی کی تو فرمایا، تمھیں تقریر کرنی ہوگی۔ میں نے دعا کی درخواست کی اور حضرت شاہ صاحب کے حکم پر قرآنِ کریم کی اس آیت پر تین گھنٹے تقریر کی۔ شاہ صاحب پر ایک سکوتِ مسلسل طاری تھا۔

فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَایَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (النسآء: ۶۵)

ترجمہ: پس (دیکھو) تمھارا پروردگار اس بات پر گواہ ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک ایسا نہ کریں کہ اپنے تمام جھگڑوں قضیوں میں تمھیں حاکم بنائیں اور پھر (صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ) ان کے دلوں کی بھی حالت ایسی ہو جائے کہ جو کچھ تم فیصلہ کر دو، اُس کے خلاف اپنے اندر کسی طرح کی کھٹک محسوس نہ کریں، اور وہ جو کسی بات کو پوری پوری طرح مان لینا ہوتا ہے، تو ٹھیک اُسی طرح مان لیں۔ (النسآء: ۶۵)

خطبۂ مسنونہ اور آیتِ کریمہ کی تلاوت تک تو مجھے یاد ہے، پھر معلوم نہیں، میں کہاں تھا؟ جب وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پر تقریر ختم کی تو یاد ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا جزاک اللّٰہ۔ شاہ صاحب نے پوری تقریر ایک ہی نشست پر بیٹھ کر سنی اور وہ مکمّل طور پر میری طرف متوجہ تھے۔'' (مجلس احباب، ملتان، ۱۷ر شوال ۱۳۷۸ھ، ۲۶ر اپریل ۱۹۵۹ء)

سمدھی کے نام

(۲۳)

ملتان

۲رفروری ۱۹۵۸ء

برادرم، محترم المقام السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔ دسویں رجب جمعہ کا دن گزار کے رات گیارہ بجے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پوتا [1] عنایت فرمایا ہے۔ الحمدللہ۔ میری طرف سے آپ کو اور تمام اہل خانہ کو مبارک ہو۔ ماں بیٹے کی صحت کے لیے آپ سب لوگ دعا فرمائیں۔ باقی میرا حال یہ ہے کہ ۱۷رجنوری جمعہ کے دن فجر کی نماز کے وقت وضو کرنے کے لیے اٹھا تو بائیں جانب فالج گر گیا [2]۔ صبح سے ۱۲ بجے تک بہت تکلیف رہی۔ الحمدللہ پھر ٹل گئی۔ اب ناتوانی بے حد ہے۔ مسجد تک بھی جانا مشکل سے ہوتا ہے۔ میرے لیے بھی دعاءِ صحت کریں۔ باقی گھر میں الحمدللہ سب لوگ خیریت سے ہیں۔ مصطفیٰ اور امجد کو دعائیں، عقیل شاہ صاحب بخاری [3] جن کا عرف کچھ اور ہے' ان کو اور سب بچے بچیوں کو دعائیں۔ امجد اور مصطفیٰ کی ماؤں کو دعائیں۔

والسّلام مع الاکرام

سید عطاء اللہ بخاری

پتا: بگرامی خدمت برادر محترم سید محمد شفیع شاہ صاحب سلمہ ربّہ
معرفت اللہ یار جنرل سٹور عبدالحکیم، ضلع ملتان (اب ضلع خانیوال ہے)

موصولہ: ۳رفروری ۱۹۵۸ء

حواشی

1. میرے بڑے بیٹے سید کفیل احمد بخاری کی ولادت کی اطلاع ہے۔
2. ۱۷رجنوری ۱۹۵۸ء کو فالج کا حملہ ہوا' اسی وجہ سے یہ خط خود نہیں لکھا' بلکہ مولوی یٰسین صاحب سے لکھوایا۔ دستخط ابا جی نے کیے۔
3. تینوں وکیل شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔

خط کے آخر میں مولوی یٰسین صاحب نے بھی ذیل کی تین سطریں تحریر کیں۔

محترمی السّلام علیکم

میری طرف سے بھی ہدیہ تبریک قبول فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نومولود کو آپ سب کے لیے مبارک کرے۔ (آمین۔ محمد یٰسین غفرلہٗ)

سفرِ زندگی

سفر ایک تھا، منزلیں کئی، بعض مقامات پر رکنا پڑا، بعض جگہ ٹھہرنا پڑا، کچھ دیر ستائے، تلوؤں کو سہلایا، آبلوں اور کانٹوں میں معانقہ ہو چکا تو چلنے لگے، پھر چلتے ہی رہے۔ حتیٰ کہ ایک رات بیت گئی، دن چڑھا، سورج نے شعاعوں کا چمن آراستہ کیا، غنچوں کا چہرہ مسکرا اٹھا، آنکھ اٹھا کر دیکھا تو گرد وپیش وہی سناٹا تھا۔

تم مجھے پا نہ سکو گے!

میں نے بنجر زمینوں میں ہل جوتے، تاریک صحراؤں میں سفر کیا اور قبرستانوں میں اذانیں دی ہیں۔ اب میں وہاں چلا جاؤں گا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ پھر تم مجھے پکارو گے اور تمہاری پکار تمہارے ہی کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر تمہیں ہلکان کر دے گی۔

مگر......

تم مجھے نہ پا سکو گے......!

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ

(ملتان۔۱۹۶۰ء)

زندگی تھی یا کوئی طوفان!

کوئی زندگی تھی؟ ایک طوفان تھا۔ انگریز جیسے دشمن سے ٹکر تھی۔ ہم تو موت کو دعوت دیتے تھے۔تقریر کی، جیل چلے گئے۔ باہر آئے، پھر تقریر اور پھر جیل۔ جوانی آئی تو جیل میں گئے، واپس آئے تو بڑھاپا شروع ہو چکا تھا۔ چالیس برس تک اس ملک کے کونے کونے کی خاک چھانی۔ جو کچھ میں نے کیا اور جو کچھ دیکھا اب اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ میں ایک سپاہی بن کر ہر مورچے پر سب سے پہلے پہنچتا رہا۔ مسجد اور مدرسہ میں جو پڑھا اس پر جیل میں جا کر عمل کیا۔ سفر اور سفر اور مسلسل سفر یا پھر جیل۔ مہینوں گھر اور بچوں کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔

بس ایک دھن تھی، ایک جنون تھا کہ اپنے مشن کے لیے جان لڑا دو۔ آندھی بن کر اٹھے اور بادل کی طرح برس گئے۔

میں کیا ہوں؟ اللہ کی مخلوق میں سب سے عاجز۔ میرے گناہوں پر مالک نے پردہ ڈال دیا ہے۔ ورنہ عطاء اللہ جیسے کروڑوں مارے مارے پھرتے ہیں جنھیں کوئی جانتا تک نہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے قرآن کی کچھ خدمت مجھ سے لے لی اور اس پر بھی کوئی دعویٰ نہیں۔ استغفراللہ!

میں نے اللہ کے سوا کسی کو معبود نہیں مانا اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بدمعاش کو اُن کا حریف بنتے دیکھنا میں برداشت نہیں کرسکتا۔ اور کوئی عمل میرے پلے نہیں، زندگی میں کہا ہوا کوئی ایک حرف بھی قبول ہوگیا تو ان شاء اللہ نجات ہوجائے گی۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ

(ماخوذ: ابتدائیہ ''مقدماتِ امیر شریعت'')

☆☆☆

علامہ محمد انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ

"وہ یگانۂ روزگار خطیب ہیں۔ قادیانیوں کے خلاف ان کی ایک تقریر ہماری پوری تصنیف سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ عطاء اللہ عہدِ نبوت میں ہوتے تو ناقۂ رسالت کے حدی خواں ہوتے۔ میں انھیں امیر شریعت منتخب کرتا ہوں۔"

حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ

شاہ جی! قدرت نے آپ کو لسان پیدا کیا ہے۔ اس میدان میں آپ بھی پیچھے نہیں رہیں گے۔"

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

"بخاری صاحب کو یونہی نہ سمجھو کہ صرف لیڈر ہی ہیں۔ انھوں نے ابتداء میں بہت ذکر کیا ہے اور یقین تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا نصیب فرمایا ہے کہ باید و شاید۔ وہ اپنی تقریروں کے ذریعے بہت عبادت کر لیتے ہیں۔ شاہ جی تو دلوں کے بادشاہ ہیں۔"

مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

"ان کا دل صرف اسلام کیلئے دھڑکتا ہے۔ وہ اسلام کی زبان ہیں۔"

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

"ان کی باتیں عطاءِ الٰہی ہوتی ہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

"خطابت آپ کو عطیۂ الٰہی ہے، آپ خطابت کے سمندروں سے موتی نکال لاتے ہیں۔ قومی جدوجہد پر ملک و ملت کا ہر گوشہ آپ کا شکر گزار ہے۔ اللہ کے ہاں آپ کا بڑا اجر ہے۔"

مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ

"آپ مقرر نہیں ساحر ہیں، تقریر نہیں جادو کرتے ہیں۔"

علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ

"شاہ جیؒ، اسلام کی چلتی پھرتی تلوار ہیں۔"

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

"شاہ جی کسی ایک کے نہیں سب کے ہیں۔ وہ اسلام کی مشین ہیں۔ وہ روزمرہ کی زبان میں دین کے بڑے بڑے مسئلے حل کر جاتے ہیں۔"

بخاری اکیڈمی

دار بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان

0300-8020384